

ایک سیاست کچی کہانیاں

رؤف کلا سرا



ایک سیاست کئی کہانیاں

روؤف کلا سرا

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ڈان کے لیجنڈری ایڈیٹر

احمد علی خان (مرحوم)

کے نام

جن کے 1998ء میں مجھے مکتب سے اسلام آباد چارڈر کرنے
کے ایک فیصلے نے میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل دی۔

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-385-3

کتاب	1	ایک پاستہ کی کہانی
سب	1	راؤف کھانا
مجموعہ	1	2010
مرد	1	خالد رشید
سٹی	1	اسٹیٹ اسلام آباد
پیس	1	8950

اسٹریٹ ڈیپارٹمنٹ، 1100، طرہ 13، 1002، پوسٹ آفس بکس، اسلام آباد

فون: 351-4192794-3 E-mail: shahidulhaque@comcast.net.pk

ترتیب

7	کھٹنوں کی کہانی	عاقبت کا سرا
13	زاویے	عامر شین
19	چوہدری شہامت حسین	
42	چوہدری نثار علی خان	
73	جہڑ علی قلی خان	
95	شاہد حامد	
127	اسحاق ڈار	
147	فیصل صالح حیات	
167	امین فہیم	
188	آصف علی زرداری	
217	آفتاب احمد خان شیرپاؤ	
230	سلطان محمود قاضی	

عزیز احمد
نیر احمد شاہ عدلی
نور احمد
سید سجاد علی
ذوالفقار علی

عزیز احمد
نیر احمد
نور احمد
سید سجاد علی
ذوالفقار علی

کہانیوں کی کہانی

میں یہ کتاب چھ سال کی تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ رپورٹنگ کا کچھ ایسا چکاچنڈ ہے یا صحافت میں ہم سب کے گرد ماسٹرین کے بقول "کیز" ہونے کا کتاب کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ لیکن میں قیام لندن کے دنوں میں جس بک شور پر گیا اور جس بیسٹ سٹریٹ کو بھی ہاتھ لگا یا تو پتہ چلا وہ وہاں سے کسی صحافی نے لکھی تھی۔ پاکستان کے بارے میں جتنی اچھی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے والے بھی غیر ملکی صحافی ہیں۔ یہ صحافی پاکستان میں اپنے اخبار کے لیے صرف تین سال لگاتے ہیں اور اپنی معیاد ختم ہونے پر واپس ہا کر ان کا پہلا کام پاکستان اور پاکستانی سیاستدانوں، فوج اور ایجنسیوں کے بارے میں کتابیں لکھتا ہوتا ہے۔ لہذا ایک خواہش میرے دل میں لگی ہوئی ہے۔ موجودہ جی کہ کچھ ایسا کام کیا جائے جس سے پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار اور بڑے بڑے کرداروں کو عوام کے سامنے ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا جاسکے۔ اسی خواہش کے پیش نظر ان سیاسی خاتکوں کو اردو میں ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی تھی کہ 2003ء میں، میں نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاستدان چوہدری شجاعت حسین کا انٹرویو کیا تھا جس نے میرے لیے ایک نئی راہ متعین کی تھی۔ میں ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ میں خبر کو بھی ایک کہانی کی شکل میں لکھوں تاکہ پڑھنے

وہاں پر سے کاٹھنڈا ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ تو ایک عجیب سی چیز ہے۔ اس کی شکل ایک
 کہانی کی طرح ہی لگتی تھی۔ وہ کہانی تو کون کوئی پاس آتی کہ پھر میں نے تمہیں کے قریب حرم
 سہ ماہی کی کہانیاں لکھیں۔ مجھے محمود خان اپکنزنی کا وہ مختصر ٹیکسٹ اس میں نے چالیس برس بعد
 اپنی مشہور عالمی صحافتی اور ریٹیلیگنس کی ڈائریکٹری میں دیا۔ میں نے اس وقت تک عالمی لیڈروں کے
 ذریعے سے انگریز پر مشتمل اور ریٹیلیگنس کی کتاب "An interview with history" نہیں پڑھی تھی۔
 باب پڑھی تو اس کا ایک ایسا روایتی سر پر سوار ہوا کہ میں نے اس کا بہنو صاحب کا مشہور زمانہ انٹرویو
 ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل ماضی سے قدرے روشناس ہو سکے۔ یہ
 انٹرویو 1972ء میں لیا گیا تھا۔ میرا پہلا چاہا کہ کاش اور ریٹیلیگنس دوبارہ بہنو صاحب کا انٹرویو 1977ء
 کی فوجی بغاوت کے بعد کرتی تو پتہ نہیں کیا کیا انکشافات ہوتے۔ جس انداز سے اور ریٹیلیگنس نے بہنو
 صاحب کی شخصیت کو بے گلاب کیا ہے وہ اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلکش بنائے گا۔
 جب میں اپنے ان تیس سیاسی خاکوں میں سے انتخاب کرنے بیٹھا تو مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ
 میں کس کا نام ڈراپ کروں۔ مجھے سب سے زیادہ مایوسی اس بات کی ہے کہ محمود خان اپکنزنی کے ساتھ
 آٹھ برسوں پر محیط مصلحتوں کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہ بنا سکا کہ وہ مجھے اپنے رازوں کی
 کہانی لکھنے دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر محمود اپکنزنی مجھے اجازت دے دیتے تو وہ اس کتاب کا سب
 سے بہترین باب ہوتا۔ میں ابھی بھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ انہوں نے آٹھ برس پہلے مجھے یہ کہا تھا کہ یہ
 تمام راز آف دی ریکارڈ بنائے جا رہے ہیں۔ میرے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ یکدم سنجیدہ ہو کر
 براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک پنخان کے لہجے میں بولے۔ "اگر تم نے وہ راز راز نہ
 رہنے دیئے تو پھر ہو سکتا ہے کسی دن تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے اسلام آباد سے فرار ہونا پڑے تو اگر
 کوئی شخص تمہیں پورے پاکستان میں اپنا مہمان بنائے گا تو وہ صرف محمود اپکنزنی ہوگا۔ آگے تمہاری
 مرضی۔ اگر تم اپنی آخری پناہ گاہ محض میرے راز لکھ کر قلم کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری چوائس!"
 یہ بات میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی مشکل سے میں نے ان آٹھ برسوں میں محمود اپکنزنی کے سینے
 سے دھواں بن کر نکلنے والے ان خوفناک رازوں کو کیسے ایک صحافی ہونے کے باوجود چھپا کر رکھا ہے۔
 اگرچہ میرے دوست کاظم کار سلیم صافی نے محمود اپکنزنی کی موجودگی میں مجھے کہا کہ رؤف بھائی اقم بھی

مجھے ماضی آدمی ہو۔ تم مجھے دیکھ لو۔ یہ مجھے بھی کئی دہائیوں سے رہتے ہیں جنہیں میں چھاپنے کے بعد
 ایک دو تھکے ان سے نہیں دیکھ سکتا اس پنخان کا دل بہت بڑا ہے۔ یہ جلد ہی ان سے ایسے صحافیوں کو سواٹ کر
 دیتا ہے۔ میں نے مسکرا کر سلیم صافی کو جواب دیا کہ ہو سکتا ہے یہ قسمی رہا ہے محمود اپکنزنی صاحب
 سو پہ پہلو تو ان کے بہنو خان صافی کے ساتھ تو رہا کرتے ہوں لیکن وہ صاحب کے صحافی کو ان آٹھ برسوں میں
 ابھی تک ان سے ان کی قریب حاصل نہیں ہو سکی۔
 محمود اپکنزنی کے علاوہ شیخ رشید، مولانا محمد آصف، مشاہد حسین، ابراہیم انور، رسول اللہ اور
 چند ایسے بڑے سیاستدان تھے جن کے پروفائل لکھ کر بھی میں اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا۔ اگر اس
 سیاسی کتاب کو پڑھنے والی ملی تو شاید ان کے رازوں سے بھی پروا نہ لگے۔ بہنو صاحب کے دوستوں
 نے کہا کہ قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمن اور الطاف حسین کے بھی اس طرح کے پروفائل لکھوں۔
 پتہ نہیں میرا دل کیوں نہیں مانتا۔ میں نے ان سب کو ملکی جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اپنے دل کی
 باتیں نہیں بتائیں گے یا وہ کچھ جو میں سننا چاہتا ہوں وہ اپنے اندر سے نہیں نکال پائیں گے، لہذا ان کا اور
 اپنا وقت بہادری کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے میں ان تینوں کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔
 "دی نیوز" کے سابق ایڈیٹر سلیم بخاری مجھے ہیوٹھ یہ کہتے تھے کہ مجھے انگلش میں لکھنے کے یہ
 سارے سیاسی پروفائلز کتابی قلم میں لے آئے چاہئیں۔ یہ کرنے میں بھی سلیم بخاری کو ہاتا ہے کہ یہ سب
 کے سب تھلکہ خیز پروفائلز کتابی قلم میں لے آئے اور پہلی دفعہ جنرل مشرف کے دور میں انہی کے
 خلاف ہی ایسی ایسی چیزیں شائع ہونا شروع ہوئیں جن کا تصور کرنا شاید مشکل تھا۔ سلیم بخاری نے ایک
 بھی پروفائل نہیں لکھ دیا۔ اگر میں یہاں جنگ گروپ کے مالک میر قلیل الرحمن کا ذکر نہ کروں تو یہ ان
 کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس بات کا میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ میر قلیل الرحمن پر جنرل مشرف کا کتنا دباؤ
 تھا کہ وہ اس طرح کے انٹرویو چھاپنا بند کریں۔ جنرل علی قلی خان کے پروفائل کے بعد تو حد ہو گئی تھی
 کیونکہ اس سے جنرل مشرف کی ان سازشوں کا پتہ چلا تھا جو انہیں نواز شریف سے خفیہ ملاقاتوں
 کے بعد آدمی چیلر کے عہدے تک لے گئی تھیں۔ میر قلیل الرحمن نے بڑی ہمت سے میرے سارے
 پروفائل اخبار میں چھاپے۔ شاید اگر وہ جنرل مشرف کے دباؤ میں آ جاتے تو آج یہ تاریخ اس طرح رقم
 نہ ہو پاتی جس طرح اس کتاب کی قلم میں ہو رہی ہے۔ میں اس کتاب پر زیادہ تیسرا اس لیے نہیں کرتا

پہلے جاکر آپ اپنے اہل خانہ اور گھر سے چھین اور اپنے لڑکے کو لے کر گھر میں آکر بیٹھ کر کہیں کہ میں نے اس ملک کو چھوڑ دیا ہے۔
 فوج نکلتی دیکھو اور دیکھو کہ اس ملک میں کیا ہے۔ اس ملک میں کیا ہے۔ اس ملک میں کیا ہے۔ اس ملک میں کیا ہے۔
 آج ہم یہاں پہنچے ہیں۔ یہ سارا ملک کی دہشت گردانہ ہے جس کا انتظام انہی جلدی نہیں دے سکتے۔ وہاں کی حکومت
 کہانی کے تمام مرکزی کردار ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور سب بگڑ چکا ہے۔ ہمارا ہمارا ہے۔ کسی نے
 کوئی سچ نہیں سیکھا۔ میں جتنے بھی سیاست دانوں سے ملا کسی کو اس کا سچ نہیں پایا کہ میرے دل میں ان
 کے لیے کوئی عزت و احترام نہیں ہوتا۔ سب کو میں نے کسی نہ کسی سازش میں شریک پایا اور مقصد ایک ہی
 تھا کہ اقتدار میں ہمارا اپنی اہلیوں کا مستقبل سنوارنے کی کوششیں کی جائیں۔ لہذا ان پر ایسا مہم چلا دیا کہ
 انہیں وہ کہہ بھی اس ملک سے ملا جس کی شاخ انہوں نے طواغیت کی نہیں کی تھی اور بدلے میں وہ اس
 ملک اور اس کے باشندوں کو بگڑ بھی نہیں دیتا تھا۔ ہماری فوج اور سیکرٹس ایجنسیاں بھی شاخ دینا کے واسطے
 ادارے ہیں جو اپنے سیاست دانوں کو کرپٹ اور ہلکے پھلکے کر کے ہالواسٹ یا جادواسٹ بنوا دیتے کرتے ہیں۔
 نیوٹی وی کے پروگرام "بہادور" کے شہداء آفاق اور میرے پسندیدہ میجر جان الفار احمد نے ان
 اعتراضات کی روایت کو اپنے ہمارے اہل خانہ کے ذریعے ایک نئی شکل دی اور ان تمام سیاست دانوں کو اظہار
 سے اٹھا کر سرکین پر لے آئے اور بڑا زبردست کام کیا۔

اس کتاب کے انتساب کا وقت آیا تو میرے دل اور دماغ میں ان کے لہجہ و بیان پر اثر
 علی خان کی تصویر چمک کر رہی گئی۔ جولائی 1998ء کی بات ہے میں اس وقت مٹان میں ان کا ایک
 معمولی سا گھر دیکھا۔ مجھے پتہ چلا کہ ان اسلام آباد میں ایک رپورٹر کی جگہ خالی ہے۔ پتہ نہیں میرے
 ان میں کیا سلیا کہ میں نے بھی خان صاحب کو ایک درخواست لکھ کر بھیج دی۔ میرے لاہور کے ایڈیٹر
 طاہر مرزا صاحب بہت ناراض ہوئے۔ نوکری سے نکالنے تک کی دھمکی دے دی کہ تمہیں یہ جرأت کیسے
 ہوئی کہ تم مٹان سے اپنا تھوڑا سا اسلام آباد کرالو۔ ان لاہور کے سب دوستوں نے منع کیا کہ خان صاحب
 کو درخواست بھیجے گا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ مرزا صاحب کی مرضی کے بغیر میرا تھوڑا ہرگز نہیں کریں
 گے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اسلام آباد کی اس ایک سیٹ کے لیے پہلے ہی لاہور اور کراچی کے
 کوئی دس رپورٹر درخواست دے چکے ہیں اور انہی میں سے کوئی تجربے کی بنیاد پر اسلام آباد بھیجا جائے
 گا۔ میں نے دوستوں سے کہا جو کہہ گا دیکھا جائے گا۔ زندگی میں اس طرح کے بلا ٹیڈ ہانسز لینے میں کوئی

خیر نہیں آتا۔ میں نے خان صاحب کے لیے یہ سکھایا کہ وہ خود اس وقت تک اپنی فوج نہیں لے کر
 کہ مجھے فوراً اس کا فوج آ کر انہیں صاحب گھر سے ہٹا کر دیا جائے۔ میرے ہاتھ وہاں پہنچ
 گئے۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مجھے کس طرح کی دانت ڈھک کر دے دے گی۔ میں نے اپنی
 درخواست میں لکھا تھا کہ میری سولے دہائی کی نوکری ایک بگڑ چکا اسلام آباد میں ہوئی ہے۔ اگر
 میرا اسطر اسلام آباد نہ آتا تو اسے دو نوکری کا نام دے دیتے۔ سرائیکی علاقوں کے والدین تو دلچسپی
 منتقل سے نوکری کرنے کی اپنا خط دے رہے ہیں۔ اسلام آباد کا کوئی ایسی لڑکی کو ہانے دے گا۔

میرا یہی خان صاحب فوج نے آئے تو ان کی بھی آواز میرے کانوں میں گونجی کہ میں نے اس
 امر کی درخواستیں مسترد کر کے آپ کا تھوڑا سا اسلام آباد کر دیا ہے۔ خان صاحب نے کہا کہ وہ
 اسلام آباد کے دور وکیل ضیاء الدین صاحب سے بھی فوج سے ہٹ کر چکے ہیں۔ میں اب بھی ہاں
 ہاں ہوں میری مرضی ہے۔ انہوں نے میری رپورٹ کے بارے میں چند تحریری خط لکھے اور کہا کہ
 مجھے یقین ہے کہ تم اسلام آباد ہاں کرنا نام بھیہ کر دے گے۔ کراچی اور لاہور کے رپورٹر کو تو پہلے ہی
 موقع ملے ہوئے ہیں۔ اب کی دفعہ مٹان کے رپورٹر کو یہ موقع ملنا چاہیے۔ تم اپنی سولے دہائی کی نوکری سے
 نوکری نہ چھوڑو اور اسلام آباد ہاں۔

میں ریپورر ہاتھ میں پکڑے پتہ نہیں کتنی صدیاں بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کہاں سے چھ آنسو میری
 آنکھ سے نکلے اور میرا سر احمد علی خان صاحب کے لیے اترنا کہہ ایسا بھلا کہ آج تک بھلا ہوا ہے اور
 بیٹھ بھلا رہے گا۔ ان کے اس ایک فیصلے نے میری زندگی بدل دی۔ میری یہ کاوش انہی کے نام ہے۔
 ان کی موت کا سن کر ایسا لگا تھا کہ کوئی اپنا چھڑ گیا ہے۔

خان صاحب کا ذکر چلا ہے تو ان اسلام آباد کے دور وکیل ضیاء الدین صاحب کی شفقت
 اور پروفیشنل ڈائٹ ایٹ بھی اب یادوں کا حصہ ہے۔ میرے ان کے ان کے دوست اور غرض
 انسان ناصر ملک نے بھی مجھے اپنی غلطیاں دور کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ آج بھی اب ان زہر
 پائنت اپنے دوست ارشد شریف، شہزادہ رضا، اسد محمود اور ضیاء الدین صاحب سے ملے جاتا ہوں تو اکثر وہاں
 خاموش بیٹھا رہتا ہوں کہ وہاں ضیاء الدین، ناصر ملک، شاہین سیبائی، احتشام الحق، اکرام ہوتی،
 احمد حسن ملوی، محمد یاسین، سید عرفان رضا جیسے دوستوں کی یاد سجتی ہے۔

[illegible]

میں فریال، احمد اور مہدی تینوں کا مقروض ہوں۔ سہافت سے بڑے میرے اس جتوں کی قیمت اگر کسی نے ادا کی ہے یا کر رہے ہیں تو وہ یہ تینوں ہیں جن کے بغیر ذاتی زندگی ہرگز اتنی خوبصورت اور مطمئن نہ ہوتی، جتنی مجھے اب لگتی ہے!

رووف کلاسرا

اسلام آباد

زاویے

روزف کلاسرا کی کتاب "ایک سیاست مکنی کہانیاں" بہت اچھی کاوش ہے جس کی آجکل کے دور میں پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ہمارے ہاں کتابیں لکھنے کا رجحان بہت کم ہے۔ اس طرح کی کتابیں خاص طور پر سیاست پر اور زیادہ لکھی جانی چاہیں اور لکھنے والا اگر صحافی ہو اور وہ بھی ایسا جسے سیاست اور اس کے کرداروں کا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو تو موضوع میں جان پڑ جاتی ہے۔

صحافت میں رپورٹر کو دفتر میں بیٹھے ہوئے ادارے نوٹیسیوں، یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے پروفیسروں (ریسرچرز) یا محققوں کے مقابلے میں حالات کو بلا واسطہ (First hand) دیکھنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اسی لیے رپورٹنگ کو تاریخ کا پہلا ذراقت کہا جاتا ہے۔ اگر رپورٹر میں بہتر مشاہدہ، تاریخی پس منظر اور لکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہو تو رپورٹ میں مزید "چائٹ" لگ جاتے ہیں۔

مگر میرا بیٹا ہے یہ خیال رہا ہے کہ سیاہی اور رنگ کے لیے ایک خاص شوق بلکہ جسے عرف عام میں "کیڑا" کہتے ہیں اس کے ہونے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

دو فکھار میں بلاشبہ وہ "کیزا" سوجوا ہے جس کی وجہ سے وہ حالات و واقعات کو یہاں
تجلی میں پرکھتا ہے۔ یہ کیزا اس کو 2017ء فی پر رکھتا ہے جس میں وہ ہر مشاہدے کا مافی الخوش کے ربا

ہوتا ہے۔ اسے ایسی سمجھوتوں کی کھوج میں رکھتا ہے جہاں سیاسی گنگو ہو سکے۔ یہ "کیرا" رڈف کو چھوٹے واقعات کی بڑی کہانیوں سے کڑیاں جوڑنے میں مصروف رکھتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی صحافت کے لوازمات ذرا مختلف ہیں۔ گورے صحافیوں کے لیے پاکستان کا موروثی جائیداد اور برادری پر مبنی معاشرہ سمجھنا ذرا مشکل فعل ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے اپنے انگلش میڈیم صحافی بھی پاکستانی سیاست کے مقامی پیچ و خم، سیاسی کرداروں اور جماعتوں کی تاریخ اور مختلف ادوار کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کا تردد نہیں کرتے۔ میرے کافی ایسے "مقامی گورے" صحافی دوست ہیں جو فخر یہ بتاتے ہیں کہ ان کی اردو بہت کمزور ہے اور یہ کہ وہ اردو اخبار بالکل نہیں پڑھتے۔ اکثر بڑے شہروں میں پلے بڑھے ہیں اور نچلے طبقوں کے معاشرتی مسائل سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور جو صحافی درمیانے اور نچلے طبقوں سے ترقی کر کے اوپر آ گئے ہیں، اسلام آباد اور بڑے شہروں کی رنگینیاں ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ اپنے ماضی سے جان چھڑاتے نظر آتے ہیں۔

صحافت میں پاکستانی معاشرے میں موجود یہ طبقاتی مسائل ہمیشہ رہے ہیں۔ مگر اب فرق یہ ہے کہ سیاست سے نااہل صحافیوں کی ایک پوری نسل ایسے مہذبوں پر براہمان ہو چکی ہے کہ وہ رائے عامہ کو ایک اندھیری گلی میں دھکیلتی نظر آتی ہے۔

نئی دہلی کی آمد سے یہ رجحان مزید خطرناک ہو گیا ہے۔ اینکریز کا ایک طبقہ اسلام آباد کے ڈرائنگ رومز کی گپ شپ، انجینیئروں کی پھیلائی ہوئی سازشی افواہوں اور مراعات یافتہ مافیاء کے پرائیویٹ گورنمنٹ کے لیے کے طور پر روزانہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔

اکثر اینکریز کا صحافتی تجربہ کچھ سالوں یا مہینوں پر محیط ہے جس میں اچھے زمانوں میں صحافیوں کو سیاسی رپورٹنگ کی مشکل اجازت ملتی تھی۔ انہیں تنہو رومز کی ڈانٹ ڈپٹ کا تجربہ ہے نہ فیلڈ رپورٹنگ کا۔ یہ ایسے ایسے کی پیدائش ہیں جس میں سیاسی عمل یا تو نامید تھا یا اس کی کوئی تقابلی شکل سیاست کے طعنے پر موجود تھی۔ اس کی وجہ سے یہ نوموٹو صحافتی سیاست اور سیاستدان کے خلاف بڑی جلدی تعصب قائم کر لیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ملک میں جمہوریت کے پروان چڑھنے میں دشواری ہوتی ہے بلکہ ہم ایک پانچ اور قبائلی خیالات کو برواشت کرتے والے معاشرے کو قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ آئے دن پاکستانی ٹی وی چینلوں پر سیاسی موضوعات پر ایسی بھونڈی بحث نظر آتی ہے کہ انسان کا سر پیٹنے کو دل کرتا

ہے۔ ایک بھیر چال ہے جس میں بھونڈی خبر غیر ناظر کے اس طرح اچھا لگتی ہے کہ اس سے حکومت اور ملک پر براجمودی نظام ظہرے میں نہ جاتا ہے۔

مہذب معاشرے میں سیاستدان کا کام ہوتے ہیں۔ حکومتیں کرتی ہیں۔ آئین تبدیل ہوتے ہیں اور ادارے اختیارات پر لڑتے بھی ہیں مگر اس سے نظام ریاست یا قومی سلامتی پر کوئی آنکھیں آتی۔ انکی میں پچھلے 25 سال میں پاکستان کے مقابلے میں دو گنا حکومتیں گر چکی ہیں۔ امریکہ میں سپریم کورٹ نظریاتی بنیاد پر استوار ہے۔ جنوں کے نظریات، زندگی اور فیصلوں پر عام تہیہ ہوتی ہے۔ فرانس کے صدر کی اہلیان کی تیسری بیوی بننے سے پہلے ننگے جسم کی ماڈلنگ کرتی تھی۔ جاپان اور برطانیہ میں آئے دن سیاستدان مالی اور جنسی سکیڈلز میں پکڑے جاتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے ان ملکوں کی قومی سلامتی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کوئی یہ راگ نہیں الاچا کہ یہ نا کام ریاست ہے یا یہ ملک نوٹ جانے کا بلکہ اس طرح کی بحثیں ملک، جمہوریت اور مستند معاشرے کے لیے بہت مفید ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے اگر سیاست اور سیاستدانوں کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

پاکستان میں تو ویسے ہی سیاست کو سات خون معاف کر دینے چاہئیں۔ جس ملک میں اس کی تاریخ کے آدھے وقت فوج حکمران رہی ہو وہاں سیاست کو کیسے گالی دی جا سکتی ہے۔ جنہیں ہم سیاستدان کہہ کر تھوکتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں مختلف ادوار میں انجینیئروں نے بڑی محنت کے بعد چنا ہوتا ہے تاکہ وہ ان کے انجینڈرے پر کاربند رہیں اور سیاسی عمل کو پیٹنے نہ دیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جب ٹیک بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم صحافی ان کو ان کا مکروہ ماضی یاد دلانا کراتے پتھر مارتے ہیں کہ وہ بچارے یا تو سیاست چھوڑ دیتے ہیں یا دوبارہ انجینڈرمنٹ کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ جنہوں نے بڑی جماعتیں، مسلم لیگ، ان اور ق، اور پیپلز پارٹی یا تو فوج کی تحقیق شدہ ہیں یا ان کے قاتلین نے مارشل لا کی کوکھ سے جہم لیا ہے مگر اس کے باوجود مختلف ادوار میں سب نے اپنی رساوا، حمل اور حالات کے حلق ملک و معاشرے کی بھلائی کے لیے کوشش کی ہیں۔

اس سب کے لیے سیاست کی افادیت کے بنیادی قسطے پر اعتقاد ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمارے ہاں عمومی طور پر پائی جانے والی سیاست اور اس سے وابستہ کردار اور جماعتوں کے حلق جو آراء پائی جاتی ہیں وہ صحیح ہوں۔ ضروری نہیں کہ سیاست کا مطلب مال بڑانا اور طاقت کا حصول ہو۔ ضروری

تجربہ کہ یہ استدلال کر رہے ہیں کہ کامیابیوں اور شکستوں کو تو کئی بار دہرایا گیا ہے اور یہی سب سے اچھا تجربہ ہے۔

سیاست کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام ہو جس میں عوام کو اثر رکھتا ہو۔ اس میں ان کو لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ یہ استدلال دہرائی جاتا ہے کہ اسے آپ کو عام کے سامنے پیش کیا ہے کیونکہ ان سے کردار اور اہمیت میں بڑھتا ہے اور ان کی دینی ہوئی طاقت کو ان کی بھلائی کے لیے استعمال کرے گا اور ہر انسان کو یہ حق ہے کہ اس کے کردار کے حعلق پہنچی جائے۔ اس کے سیاسی عمل پر نہیں ہے کہ کس سیاستدان نے کس وقت کیا اور کیوں کیا بلکہ یہ ہے کہ اس کے کام سے عوام کے مسائل کا کیا حعلق ہے۔ سیاست عوامی مسائل کے حعلق ہے نہ کہ سیاسی سیاست ہے۔ ہم یہ یہ لازم ہونا چاہیے کہ ہم سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو یہ موقع دیں جس میں سیاسی عمل اور ارتقا جاری رہے۔ ایسا سیاسی مگر پروان چڑھے جس میں ہم سیاستدانوں پر ہار و فتح بھی کرتے رہیں اور سیاسی نظام بھی نہ لڑ سکے۔ جس میں سیاستدانوں اور جماعتوں کو عوام ووٹ کے ذریعے ہی لے کر آئیں اور ووٹ کے ذریعے ہی تبدیل کریں۔ جس میں رائے عامہ اپنی مضبوط ہو کہ سیاسی جماعتیں وراثتی اور موروثی امیدواروں کی جگہ سیاسی کارندوں کو فروغ دیں اور اپنی جماعت کے اندر بھی جمہوری کچھ نافذ کریں۔ جس میں کار و دہاری اور کرپٹ مافیا کا کردار کم ہو اور عام آدمی بھی سیاست میں ترقی کر سکے۔ جس میں آزاد الیکشن کمیشن سب کے لیے مساویانہ موقع فراہم کر سکے اور عوام میں ووٹ کی طاقت کا ادراک بڑھ سکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی بحث و مباحثہ یا Informed public discourse ہو جس میں عوام اچھے اور برے کا بہتر تعین کر سکیں۔

ایسی پڑھی لکھی Debate تب ہی ممکن ہے جب ہمارے سیاسی رپورٹر یا تجزیہ نگار (جو کہ آج کے تجزیہ باز صحافیوں سے مختلف ہیں) کو اپنے موضوع کا بہتر ادراک ہو اور یہ سب تب ہی ممکن ہے جب نئے تجزیہ نگاروں کو وہ مواد مہیا ہو جس سے وہ کل کے واقعات جان کر آج اور آج کے لکھنے کے متعلق بہتر بات کہہ سکیں۔ رؤف کھاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔

رؤف نے یہ سوچ کر لکھا کہ ان خصوصیات کے اندر جھانکے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یہ سوچ نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے انکشاف کریں، مگر رؤف نے سیاست کے ایک اور نکتہ پر ان میں رخنہ کس کے لیے پیش کیا ہے۔ جس کی میں انکشاف کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں میرے میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے پتہ ہے کہ چاہے اس میں ہر ایک جو چاہے دیکھ دیکھ کر رؤف کے نکتوں میں اچھے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں لیکن یہ کہ رؤف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید یہی صحافت کا یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان نکتوں کا عنوان "ایک سیاست کی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس کاپی کی تصدیق دینی نہیں اور یوں ہی کھولی کہانوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر حسین
دلی نگر، اسلام آباد

چوہدری شجاعت حسین

مجھے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے کا شوق اس وقت ہی پیدا ہو گیا تھا جب لاڈیالہ جیل میں قید یوسف رضا گیلانی اور اسلام آباد کے سب سے مہنگے ترین ملائے ای سیون سیکٹر میں واقع اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بات بات پر مسکراتے اور قہقہے لگاتے سید مشاہد حسین نے مجھے ایک سی بات بتائی کہ جب ان دونوں کو 12 اکتوبر 1999ء کی فوجی بغاوت کے بعد گرفتار کیا گیا تو جو شخص ان کے گھر سے پہلے اپنی جیبوں میں پیسے ڈال کر ان کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرنے گیا تھا وہ اور کوئی نہیں چوہدری شجاعت تھا۔

پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں چوہدری شجاعت کا امیج ایک ایسے سیاسی گاؤں کا دور کا سا بن گیا تھا جو مشکل وقت میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھا۔ شاید چوہدری صاحب بھی ماریو پوزو کے ٹاول گاؤں کا دور کے ڈان کو ریلوین کی طرح اپنے اندر ایک ایسی جبلت لے کر پیدا ہوئے تھے جس کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے سیاسی مخالفین کو جیتنے کا سب سے بہتر موقع وہ تھا جب وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار تھے۔ کہنے کو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں یوسف رضا گیلانی کے گھر والوں کی مصیبتوں کا اس لیے بھی علم تھا کیونکہ وہ خود پرویز الہی کے ساتھ اسی لاڈیالہ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھا چکے تھے۔ یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ جزل مشرف کے ساتھ مل کر تو انہوں نے گیلانی کو

جس کے ایک ایک مسئلہ میں رکھ دیا، جس میں بیاداری سمیت بھی لکھیں اور بعد میں ایک حسب ضرورت
 قریب آ کر کہہ دیتے تھے۔ سب انتظامات کرانے کے لئے وہ بات یہ ہے کہ ان مسئلوں میں اس وقت
 نہ ہوا تھا اور شریف بھی قید ہے اور جو شخص جو بدعتی شجاعت کے حامل ہیں اپنے خیریت سے آرام
 کرتے تھے ان سے وہ بھی مذاکرہ ہوتا ہے۔ جب وہ اللہ جل جلالہ میں گرفتار تھے تو سوائے گھر کے کسی اور
 قریبی علاقہ میں رہتے تھے اور ان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کے پاس آئے کہ آپ تو از شریف کا رشتہ
 چھوڑ دیں اور ان کے بدلے میں پورا پنجاب ہم سے لے لیں۔ ان کے پاس بھی ایک دفتر بھی ان سے
 ملے کے لئے آیا تھا جو یہ کہتا کہ آپ اپنی پارٹی کے اندر ایک قائد و رولڈ لاک بنائیں۔ جو بدعتی شجاعت کو
 یہ بھی پیغام دیا گیا کہ صرف درواری ان سے جیل میں آ کر ملاقات کر کے ذیل کرنے کو تیار تھے لیکن
 شجاعت اور بدعتی نے سہارا پارٹی کی حکومت سے جیل میں بیٹھ کر ذیل کرنے سے انکار کر دیا۔
 اس پر میں نے شجاعت سے پوچھا کہ اگر وہ از شریف کے ساتھ ہی وہ قادار تھے تو انہوں نے
 ۱۲ ستمبر ۱۹۹۹ء کے بعد از شریف کا ساتھ چھوڑ کر جیل شرف کے ساتھ ذیل کیوں کر لی تھی۔
 شجاعت نے بڑی ہنسی سے میری اس بات کو مسترد کیا کہ وہ از شریف کے دور اقتدار میں مرے
 لینے کے بعد انہوں نے مرے دنوں میں ان کا ساتھ چھوڑ کر جیل شرف سے ہاتھ ملایا تھا۔
 ان کے بقول وہ از شریف نے جیل سے ہی انہیں میاں اقمیر، اعجاز الحق اور چند دوسرے لوگوں کو
 پارٹی سے نکال دیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے فائدہ تھا کہ انہوں نے پارٹی چھوڑی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہیں
 پارٹی سے نکال دیا تھا۔ شجاعت نے انہیں سے سوال کیا کہ لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ اصل
 ان سب کو جو کہ از شریف نے دیا تھا جو ایک فنی جیل سے ذیل کر کے ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔
 اپنے اور از شریف کے درمیان اندرونی اختلافات کی کہانی سناتے ہوئے شجاعت نے کہا کہ
 وہ اصل ۱۹۹۷ء کے بعد از شریف نے ان کی شخصیت پر بڑا برا اثر ڈالا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات
 چھٹی تھی کہ وہ کوئی بہت بڑا کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اس پیکر میں انہوں نے ایسے کام
 شہر لائے تھے جن کا نتیجہ کچھ ایسا نکلا تھا۔ جب ۱۹۹۷ء کے الیکشن کے بعد ایک مقامی ہونٹ
 سرور علی علیہ السلام کی بیٹنگ ہوئی تو شجاعت اور سب انھیں مل کر جلسے کے لئے گئے۔

کہ تھی کہ وہ تین یا تین دنوں میں ہو سکتا ہے۔ بعد میں وہ حالات اور صورتحال کے تحت موت نے جلد ہی ان سے کہے کہ
 ان کے حضور کے برعکس وہ از شریف نے ان شخصوں کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ ان کے بقول وہ از
 شریف کی سب لوگ ان کی انگلیوں اور ان کی شخصیت کی وجہ سے بے پروا اور احترام کرتے تھے۔ یہ ہم
 جب وہ دوسری مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ بنے تو وہ جیل میں جھڑپ ہو چکے تھے۔ ان کی بدعتی کہ تو ستمبر ۱۹۹۵ء میں
 وہ از شریف کی سربراہی میں ایک میٹنگ آئینہ کرنے کے بعد شجاعت نے جو بدعتی و بدعتی کو بتایا تھا کہ
 بی ایم ایل تو ان کی حکومت دیکھا وہ ایک ٹکٹ لکھنے چلے گی۔

میرے شخص پر جو بدعتی شجاعت نے انکشاف کیا کہ اس میٹنگ کے شروع ہونے سے پہلے
 وہ از شریف نے وہاں موجود تمام لوگوں سے جن میں ان کی بیٹی بھی تھی ان کے سربراہان موجود تھے قرآن پر
 حلف لیا تھا کہ وہ اس میٹنگ کی کسی بات کو باہر نہیں بتائیں گے۔ اس میٹنگ میں بہت سی غلطیاں کچھ کے
 فیصلے کیے گئے تھے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ بھلا ایسے وہ کون سے فیصلے تھے جنہوں نے جو بدعتی شجاعت میں جیسے
 بندے کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

جو بدعتی شجاعت کچھ سوچتے رہے کہ وہ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں۔ خاصی دیر بعد انہوں نے مجھ
 ایک اشارہ دیا کہ اس میٹنگ کے فوراً بعد پنجاب اور کراچی میں ماورائے عدالت قتل ہونا شروع ہو گئے تھے۔
 شجاعت جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، ان کے بقول انہوں نے غیر قانونی فیصلوں کے خلاف
 مزاحمت کی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ چاہے مجرم ہی کسی، اس کو بھی عدالت میں اپنے آپ کو قانع کرنے
 کا حق دینا چاہیے۔ شجاعت کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ حافظ قرآن کو جیل سے نکال کر ایک جلی پولیس
 مقابلے میں گولی مار دی گئی تھی۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ جو بدعتی شجاعت ان فیصلوں کے خلاف تھے، لیکن ان کی وزارت ان
 فیصلوں کی مذمت بھی کر رہی تھی۔

جب میں نے جو بدعتی شجاعت کی آواز میں انہوں کی محسوس کی تو مجھ میں نے ان سے پوچھا کہ
 آپ کہ اگر وہ سارے فیصلے انہیں ملے تھے تو انہوں نے انہیں ان کے خلاف سے انکشاف کیا۔

کئی دنوں کے بعد شہادت کے لیے سید صاحب کی آنکھوں میں دیکھا اور بولے کہ رفاک صاحب اس میں اس میں
 حاصل نہیں تھا۔ میں نواز شریف کی سربراہی میں ہونے والی میٹنگز میں واحد شخص ہوتا تھا جو ٹکڑے ٹکڑے
 نواز شریف کے اس طرح کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کرتا تھا۔ یہ میری وجہ سے ہی اور ان کی دلدل
 کہ اس طرح کے فیصلے نہ ہو سکے جن سے ان کی اپنی حکومت اور ملک کو شدید نقصان آتا۔ شہادت کے
 بقول سب نواز شریف ملک میں ان کی گورنمنٹ کے عدالتیں قائم کرنا چاہ رہے تھے اور یہ بات کبھت کے
 سامنے آئی گی تو انہوں نے اس کو سارے راجستھان سے لے لیا ہوا دیا۔ تاہم نواز شریف اسے لے رہے اور انہوں
 نے اگلی کبھت میں اس کی منظوری لے لی۔ اس پر چوہدری شہادت نے نواز شریف کو خبردار کیا تھا
 کہ ایک دن ہم سب کو ان عدالتوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہذا ابھر ہے کہ ہم ان کے قیام سے گریز کریں
 اور ہر ایک ان جزل مشرف نے نواز شریف کی بنائی ہوئی اسی ایک عدالت سے انہیں مرقہ دی تھی۔

شہادت کے بقول ۱۱۲ کٹوری بغاوت سے پہلے نواز شریف جو ٹوٹا کٹ فیصلہ کرنا چاہ رہے
 تھے وہ چھوٹے ہو چکے تھے سرعام اس طرح کی نمائش کرے گا اسے سزا دے دی جائے گی۔ اس کام کے لیے
 انہوں نے فوجیوں کو استعمال کرنا تھا اور ۱۱۴ کٹوری ۱۹۹۹ء کو انٹیکس کی کبھت کمیٹی کی میٹنگ طلب کر لی
 گئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا جاتا تھا۔ تاہم وہ دن پہلے ہی ان کا اپنا ٹھکانہ الٹ دیا گیا۔ شہادت کے اسے
 ایک کام لگا دیا گیا تھا کہ وہ اس میٹنگ میں تمام ملٹری کمانڈروں کو اس منصوبے کے بارے میں بریف
 کریں گے اور آدمی سے کہا جائے گا کہ وہ نہ صرف اس معاملے میں ان سے تعاون کریں بلکہ سرعام اس طرح
 کی نمائش کرنے والے لوگوں کو پکڑ کر ان کو سزائیں دی جائیں۔ شروع میں چوہدری شہادت نے اس
 پلان کی بڑی مخالفت کی۔ ان کے بقول نہ صرف اس قانون کا غلط استعمال ہوگا بلکہ یہ حکومت کے لیے
 بھی بہت مشکلات پیدا کرے گا۔ تاہم، شہادت کو کہا گیا کہ وہ ۱۱۲ کٹوری کو یہ سارا پلان کیبنٹ کمیٹی
 کے اے دفاع میں پیش کرنے سے پہلے وزیراعظم سے ڈسکس کر لیں۔ اس میٹنگ میں جنرل پرویز
 مشرف نے بھی شرکت کرنی تھی اور چاروں مسوہوں کے وزراء نے اعلیٰ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔
 تاہم سب لوگ اس وقت بڑے حیران ہوئے جب غیر متوقع طور پر سندھ کے وزیراعلیٰ غوث علی شاہ

نے وزیراعظم کے حکم کے باوجود اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی کہ آج بھی ٹوٹے ہوئے شاہ پر سارا کام لگتا
 ہے کہ انہوں نے فوجی بغاوت کی نہ ہو گئی تھی اور وہ اس میٹنگ میں شرکت نہیں ہونے لگے۔ شہادت
 کے بقول ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دن نواز شریف بہت خاموش تھے اور پریشانی واضح
 طور پر ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی جیسے ان کے ذہن پر کوئی بہت بڑا اہم ہو۔ یہ میٹنگ کوئی دو بجے
 کے قریب ختم ہوئی اور تمام لوگ نواز شریف کے ساتھ ہی قائم فسطح پاؤں چلے گئے تاہم چوہدری شہادت
 وہاں سے نکل گئے کیونکہ انہوں نے جاہلی شیر کے ساتھ لڑ کر لیا تھا۔

اس سلسلے پر چوہدری شہادت تھوڑی دیر کے لیے رکتے، ایک بڑا گہرا سانس لیا اور بولے کہ
 اگر ۱۱۲ کٹوری والے دن وزیراعظم کے ساتھ چلے جاتے تو وہ بھی وہاں بہت سارے دوسرے لوگوں
 کی طرح فوجیوں کے ہاتھوں مارے جاتے جو وہاں جزل مشرف کے والدین کی رشتہ کوٹھالی آئی تھی۔ ہائے کی
 تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوتے تھے۔

میں نے چوہدری شہادت سے پوچھا کہ اگر نواز شریف نے جنرل مشرف کو آدمی چیف
 کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

بھیر کسی نیچا کپھٹ کے شہادت نے جواب دیا کہ نواز شریف ان دنوں غیر سیاسی لوگوں کے
 گھیرے میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہی ان سے دو اہم فیصلے کروائے تھے۔ کبھت کے کسی
 ایک ممبر کو بھی اس فیصلے کی پھٹ نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ اور تو اور، شہادت بھی جنرل مشرف کو ہٹانے
 جانے کے اس فیصلے سے لاعلم تھے۔ شہادت کے بقول شریف برادران کا کچھ مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ
 بڑے بڑے فیصلے بغیر سوچے سمجھے یا اپنے قریبی سیاسی ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کر گزرتے تھے۔
 چوہدری شہادت کا خیال تھا کہ اگر نواز شریف نے مشرف کو ہٹانا ہی تھا تو اگر وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے
 مشورہ کرتے تو اس سارے کام کو بڑے بہتر انداز میں کیا جاسکتا تھا۔ شہادت کا اپنا خیال تھا کہ سری لنکا
 سے واپسی پر اگر مشرف کو بلا کر یہ کہا جاتا کہ انہیں آدمی چیف کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے تو کوئی
 آسمان نہ گر پڑتا۔ شہادت کے ذہن میں کوئی ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ جنرل مشرف کے پاس میں
 آنے کا ذمہ دار اور کوئی نہیں، نواز شریف خود تھے۔ شہادت اکثر نواز شریف کو بتایا کرتے کہ آپ فوجی

اور جاتی اور ان کے لیے ایسا کرنا۔ اپنی بات میں اور ان کے لیے
 ان کے لیے ۱۹۹۷ء کا ایک واقعہ تھا جب نواز شریف جنرل آصف پرواز کی اہلیہ کے ہمراہ
 اپنی مرضی سے آری ایف ہاؤس کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ بددی شہامت کو یہ فخر ہوا کہ وہ اپنی بات میں اور جنرل آصف ملک پہلے
 سے پہلے آئے تھے اور ان کے بارے میں شکوک ہادی تھی۔ ان کے خلاف جنرل رمضان علی کو
 لا آری ایف ہاؤس کی بات ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مہد الو میڈیکل اور جنرل اشرف کو بھی
 ٹھکرانہ وار کہا جا رہا تھا۔ اب ہادی آئے یہ بددی شہامت کی رائے طلب کی گئی تو شہامت نے
 وزیراعظم کو یہ کہا کہ آپ اپنے آرام سے یہ سب باتیں سن کر غلام الملک خان کو بھیج دیں اور آٹری فیصلہ
 ان کو کر لیں۔ شہامت نے نواز شریف کو بتایا کہ جو بھی آری ایف ہاؤس کا وہ سیدھا ان کو سیلون
 مارنے کے لیے وزیراعظم ہاؤس ضرور آئے گا اس لیے انہیں اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ ان کا
 آری ایف کون ہو گا۔

میں نے شہامت سے پوچھا کہ انہوں نے نواز شریف اور شہباز شریف دونوں کے ساتھ مل کر
 کام کیا ہوا تھا۔ ان کے خیال میں دونوں بھائی کس مزاج اور طبیعت کے آدمی تھے۔

شہامت کے جنرل نواز شریف زیادہ مہذب اور ہر ایک کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے
 تھے۔ تاہم ان کی ساری شخصیت ۱۹۹۷ء کے الیکشن میں بھاری مینڈیٹ لینے کے بعد بدل گئی تھی۔ نواز
 کے برعکس شہباز شریف بہت سحرور اور بیشتر آفیسر کی بڑی توہین کرتے تھے۔ تاہم وہ بددی شہامت کا
 یہاں شریف کے بارے میں بڑا مختلف نظریہ تھا۔ ان کے خیال میں شریف بڑے اور ان کے والد
 صاحب ان دونوں بھائیوں کے فیصلوں میں بکھراؤ لانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ کئی
 اہم موقعوں پر یہاں شریف نے بددی شہامت کی بڑی مدد کی جب انہوں نے ان دونوں بھائیوں
 کے خلاف فیصلوں کو روکنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور ان کی حکومت کے لیے بڑے شدید مسائل پیدا
 ہو سکتے تھے۔ یہاں شریف خاندان کے بڑے کی طرح اپنی ایک رائے دیا کرتے اور یہ دونوں بھائی
 اس کا احترام کرتے تھے۔

تاہم، مجھے بھی شک ہے کہ ان کے لیے کسی کی شہادت کا بیان کے ساتھ قریب ہونے کے
 باوجود بھی یہ بددی شہامت اور جنرل اشرف میں کوئی شک نہیں اور دونوں ۱۹۹۷ء کے بعد اس
 ملک کے سیاسی ماحول کے ساتھ ان کے۔

شہامت نے اس بارے میں بھی یہ دوا لیا۔

دراصل یہ بددی شہامت انہیں کئی آن کیجٹ کی مہنگا میں ہلور وڈیہ واقعہ شریک ہونے
 تھے۔ یہ کہی دلتا ہوا کہ جنرل اشرف اور یہ بددی شہامت کے باہمی کشمکش دلی کے معاملات پر خیالات
 تقریباً ایک جیسے ہونے کے جس کی وجہ سے ان دونوں میں اسطری طور پر ہم آہنگی یا کسی دوسرا کارگل
 کے معاملے میں!

جو بھی یہ بددی شہامت نے کارگل کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں جنرل اشرف اور نواز شریف کی
 جاری گفتگوں کی جنگ سامنے آگئی۔ نواز شریف یہ مسلسل کہتے تھے کہ جنرل اشرف نے ان کو بتائے بغیر
 کارگل کا محاذ شروع کیا جس سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں تقریباً جنگ لڑنے کے قریب آ گئی
 تھیں۔ سب سے بڑھ کر پاکستان اور انڈیا کے درمیان ہماری امن ٹھکانہ کو شدید دھمکا لگا اور پوری
 دنیا میں پاکستان اکیلا رہ گیا جبکہ جنرل اشرف ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ کارگل کی جنگ ہاتھ
 نواز شریف سے اجازت لے کر شروع کی گئی تھی۔ میں نے اس کو بہترین موقع ہانا اور شہامت سے پوچھا
 لیا کہ کیا ان کے خیال میں نواز شریف کو کارگل کے مسئلے پر اندھیرے میں رکھا گیا تھا اور ان کو بتائے بغیر
 ہندوستان سے اتنی بڑی جنگ چھیڑنے کی کوشش کی گئی۔

یہ بددی شہامت نے فوراً اس تاثر کی تردید کی اور بولے کہ نہیں، نواز شریف کو اس معاملے کا
 سب پتہ تھا۔ اس بات کا ثبوت دینے کی غرض سے شہامت نے مجھے بتایا کہ ایک دلدہ ایک بریگیڈیئر کارگل
 پر حملہ کر رہے تھے۔ ایک سرحد پر جنرل اشرف، جو اس میٹنگ میں شریک تھے، نے یہ محسوس کیا
 کہ نواز شریف کو اس بریگیڈیئر کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بریگیڈیئر کے ہاتھ
 سے اسٹک لے کر جنرل اشرف نے کارگل آپریشن کی تمام تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔

اپنا نواز شریف نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ جنرل تم نے تو یہ ساری باتیں مجھے کبھی نہیں

تائیں۔ اس پر جنرل شرف رنج گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک پھولی سی ڈائری نکالی اور اس
 میں موجود ہر چیز پر نظر پڑا۔ وہ اس میں انہوں نے نوڈل شریف کے ساتھ کارگل پر تفصیل سے
 مشق کی ہوئی تھی۔ نوڈل شریف کا خیال تھا کہ اس میٹنگ میں سوجو اس کے تمام وزیروں کا ساتھ دینا
 کے ساتھ وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ کے ساتھ ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

تو وہ سب سول میں آگے بڑھی تو شجاعت نے کہا کہ اب چونکہ مسئلہ بہت مشکل کیا ہے لہذا
 وہاں پہلے تو شرف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے استقامت سے بھلا دیں اور پھر اس کو ایک مشترکہ بیان
 دیا جائے جس میں یہ کہا جائے کہ کارگل سول اور مشرقی لینڈ شپ کا مشترکہ چارٹ تھا۔
 تاہم نوڈل شریف نے چودری شجاعت کی یہ بات نہیں مانی بلکہ شجاعت کی اس بات سے
 نوڈل شریف شرمے میں آئے اور جب وہ میٹنگ سے اٹھ کر جانے لگے تو انہوں نے شجاعت سے نہ
 بالکل اچھے انداز میں مخاطب کیا۔ یہ چودری شجاعت کے لیے بڑا صدمہ تھا کہ وہ کارگل کے مسئلے پر
 جنرل شرف کی عزت کرتے ہوئے تھے۔

اس امر سے پھر شجاعت نے چودری کو لیا کہ جنرل شرف کی بھارت کا سب سے بڑا فائدہ تو
 ان کے خاندان کو تھا اور جس طرح وہ وزیر اعظم نوڈل شریف کی مخالفت کر کے جنرل شرف کی حمایت
 کرتے رہے تھے اس کا انہوں نے بعد میں پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا تھا۔

تاہم چودری شجاعت میری اس بات سے متفق نہیں ہوئے اور بولے کہ جب اس ملک میں
 مارشل لا لگا تو جنرل شرف کے اور حکومت میں انہیں اور ان کے خاندان کو سب سے زیادہ سیاسی انتقام
 کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ بتانے لگے کہ جو نئی بھارت ہوئی، ایک آرمی، بھڑلا ہور میں واقع ان کے گھر پر
 ہلکا۔ اس نے ان کی خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی اور ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ شجاعت
 جیس کی پہلی کوٹنگ کرنے کی غرض سے ایک بہت بڑے لیول کی ٹیم ان کے گھر بھیجی گئی تھی کہ وہ جا کر ان
 کے ہاتھ روم تک چیک کریں تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ کتنے امیر لوگ تھے۔ اس پر اکتفا نہ کیا گیا اور
 انہیں انتقام جرم کے سوا کچھ کے جواب دینے کے لیے کہا گیا کہ ان کا بچن، ہاتھ روم فلیش اور اس طرح

کی دیگر پھولی سولی چیزیں کپے اور کیڑی تھیں۔ تاہم روم میں بڑی ہولی چیزوں کی تصویلات لراہم
 کرنے کو کہا گیا تھا۔ چودری شجاعت نے ہر بھی قسم سے کام لیتے ہوئے ان سوالات کے جواب
 دیے۔ تاہم اس کے روز ایک اور ٹیم وہاں پہنچی تھی جن کے ہاتھ میں وہ تمام سوجو اور انہوں نے ہاتھ
 روم اور مین چیمبر کو شرمسار کر دیا کہ کیا واقعی ان کو کچھ جواب دینے کے تھے۔

جب چودری شجاعت کے گھر پر اس طرح کا بھاپا مارا گیا تو انہوں نے پہلی دفعہ طارق عزیز کو
 ٹیلی فون کیا جو اس وقت جنرل شرف کے ساتھ تھے۔ طارق عزیز نے شرف سے پوچھا تو جنرل نے کہا
 کہ انہوں نے اس طرح کے کوئی آزادانہ پاس نہیں کیے۔ تاہم چودری شجاعت کی پہلی کے خلاف اس
 طرح کے ایکشن ہوتے رہے تھے کہ ان کو بدانتظامیوں کا رونا دھونا کھنکھاتا رہا۔

جب شجاعت نے طارق عزیز کا نام لیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ
 انہوں نے طارق عزیز کو استیصال کرتے ہوئے جنرل شرف سے اپنے تصورات استوار کر کے آنے
 والے دنوں میں اس ملک کے پہلے سیاسی گانا گوار کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

طارق عزیز چودریوں کے اس وجہ سے بھی بڑے محزون تھے کہ جب ایک سول سروٹ کی
 حیثیت سے آصف علی زرداری ان سے شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے ان کے گرد گھیراٹک کرنے
 کی کوشش کی تو ان کی چودریوں نے جان بچائی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ طارق عزیز چودریوں کے
 ان احسانات کا بدلہ چکاتے۔ تاہم چودری شجاعت اس بات سے انکاری تھے کہ طارق عزیز نے ان کو
 کوئی سیاسی رول لے کر دینے میں کوئی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے شجاعت
 نے انکشاف کیا کہ آپ طارق عزیز کی کیا بات کرتے ہیں۔ وہ تو میری جنرل احمد سے ایک میٹنگ بھی
 کرانے میں ناکام رہے تھے۔ یہ میٹنگ جنرل شرف کے کہنے پر ہوئی تھی کیونکہ شرف چاہتے تھے کہ میں
 ان سے مل کر اپنے خلاف ٹیپ میں رجسٹرڈ کیے گئے تمام کیسز کی وضاحت چش کروں۔ طارق عزیز کی تمام تر
 کوششوں کے باوجود جنرل احمد سے ان کی میٹنگ نہیں ہو سکی تھی۔ شجاعت کے بقول جنرل شرف کی
 حکومت نے دراصل The Most Wanted کے نام سے سیاستدانوں کی ایک فہرست تیار کی تھی جس کا
 نام "Big Heads" رکھا گیا تھا۔ چودریوں کے خلاف مقدمات قائم کر کے انہیں ہراساں کرنے کا

چوہدری شجاعت نے اس دوران میں سے پوچھا کہ کس کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ انہیں یہ کہنا کہ جناب میں شجاعت کا حامی ہوں، سیف اللہ، سلیم سیف اللہ اور میاں انور جیسے بہت سے سیاسی لیڈروں کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے یہ الزامات لگائے تھے کہ انہیں جان بوجھ کر ایجنڈے میں لایا گیا تھا تاکہ چوہدری شجاعت اور پرویز الہی کی راہ ہموار ہو سکے اور وہ اپنی مرضی کی گیم کھیل سکیں۔ شجاعت نے میری بات بڑے دھیان سے سنی اور پھر بولے کہ یہ بالکل غلط بات تھی کیونکہ اگر وہ الیکشن جیتے تو آج وہ بھی حکومت کا حصہ ہوتے۔ شجاعت کا خیال تھا کہ ان سیاسی لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے کوئی بہت بڑی تحریک نہیں تھا لہذا انہیں ہرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم، یہ بات بڑی واضح تھی جس کا اقرار اب چوہدری شجاعت نہیں کر رہے تھے کہ اگر میاں انور الیکشن جیت جاتے تو پھر یقیناً وہ پی ایم ایل کیو کے صدر ہونے کی حیثیت سے وزارت عظمیٰ پر اپنا حق جتاتے اور یوں چوہدری پرویز الہی کے لیے پنجاب میں وزارت اعلیٰ کا عہدہ لینے میں جہاں وقت پیش آتی وہاں اگر وہ وزیر اعلیٰ بن بھی جاتے تو پنجاب سے ایک اور وزیراعظم جس کا تعلق بھی لاہور سے تھا، اس کی موجودگی میں شاید وہ اتنی آزادانہ حکومت نہ کر سکتے جو انہوں نے بعد میں کی۔ لہذا اس بات میں بڑی حد تک سچائی ہو سکتی ہے کہ چند لیڈروں کو جان بوجھ کر ہرایا گیا تاکہ پنجاب سے کسی وزیراعظم کو روکا جاسکے اور چوہدریوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی سیاسی گیم کھیلی اور ظفر اللہ جمالی جیسے کمزور شخص کو وزیراعظم بنا کر پنجاب پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہی نہیں بلکہ جب ظفر اللہ جمالی کا کام ختم ہوا اور ان کی جگہ ہمایوں اختر خان نے آئی اے آئی اور طارق عزیز کی مدد سے وزیراعظم بننے کی کوشش کی تو آخری لمحے میں چوہدری شجاعت جیسے زیرک سیاستدان نے میزان پر الٹ دی اور شوکت عزیز کو وزیراعظم ہوا دیا کیونکہ چوہدری برادران کسی قیمت پر یہ فوراً نہیں کر سکتے تھے کہ پنجاب سے کوئی وزیراعظم بنے۔ ان کی یہ حکمت عملی بڑی کامیاب رہی اور 15 نومبر 2007ء کو جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر نئے الیکشن کرائے گئے تو اس وقت تک پرویز الہی اپنے آپ کو بڑی کامیابی سے ملک کا اگلا وزیراعظم ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بینظیر بھٹو کی گیم اور یوں ساری گیم پلٹ گئی۔

چوہدری شجاعت ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ان کا سیاسی کھیل کھٹے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک طرف تو چوہدری شجاعت یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ ۱۹۹۲ء کے بعد ان کی فیملی کے ساتھ اچھوتی تو جین آمیز وہ یہ اختیار کیا گیا تھا۔ ان کے گھروں کے ہاتھ دم ہنگ چیک کیے گئے۔ جنرل احمد جیسے لوگوں نے ان سے ملنے سے انکار کیا اور اگر کوئی کسر رو گئی تھی تو میاں آصف جیسے بیوروکریٹ نے انہیں ذلیل کر کے پوری کردی اور وہ پھر بھی جنرل مشرف کے حامی بن گئے۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ یہ سارا کام جنرل مشرف کی ہدایت پر کیا جا رہا تھا تاکہ ان چوہدری برادران کے گلے میں سی اس طرح ڈالی جائے کہ نہ صرف وہ خود جنرل مشرف کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائیں بلکہ اپنے جیسے سیاستدانوں کا ایک پورا ریزہ ہانک کر ان کی شکار گاہ میں لے جائیں جنہیں استعمال کر کے وہ اس ملک پر حکومت کریں۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ جنرل مشرف نے نیب کو استعمال کر کے نہ صرف چوہدری شجاعت بلکہ دیگر تمام سیاستدانوں کو تکمیل ڈال کر اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔

چوہدری شجاعت نے شاید میرے ذہن میں گردش کرتے ان سوالوں کو پڑھ لیا تھا لہذا انہوں نے خود ہی مجھے کہا کہ میں نے جنرل مشرف کے اقتدار کی اس لیے حمایت کی تھی کیونکہ ان میں اور مشرف میں ایک چیز بڑی مشترک تھی کہ دونوں نیشنل سکیورٹی کے بارے میں ایک ہی رائے رکھتے تھے۔ چوہدری شجاعت نے مشرف کے لیے کی جانے والی اپنی حمایت کے جواز ڈھونڈنے جاری رکھے اور مجھے بتایا کہ ماضی کے جرنیلوں کے برعکس جنرل مشرف نے مارشل لا نہیں لگایا تھا بلکہ انہیں یہ کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ تاہم، چوہدری شجاعت مجھے یہ بتانا نہیں بھولے کہ وہ ملک میں فوجی حکومت کے خلاف تھے۔ چوہدری صاحب کے خیال میں ماضی میں جتنے بھی مارشل لا لگائے گئے وہ سب غلط تھے اور ان کے لیے ان تمام جرنیلوں کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے جمہوریت کی گاڑی کو ہٹائی سے اتارا۔ تاہم، ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح چوہدری شجاعت میں بھی اتنی عقل باقی تھی کہ انہوں نے جنرل مشرف کو ہرگز اس لہرست میں شامل نہیں کیا جس میں جنرل ایوب، جنرل یحییٰ اور جنرل ضیاء کے نام تھے۔ چوہدری شجاعت کو یہ پتا تھا کہ وہ تینوں جنرل تو مر چکے تھے لہذا وہ ان کا کچھ

نہیں رکھتے تھے تاہم جنرل مشرف نے صرف دیکھتے ہوئے ان کے اپنے حلقوں کی سیاست کا انحصار ہی اس جنرل کی زندگی اور دینی کے ساتھ منسلک تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں اور بات یہ کہ چوہدری شجاعت وردی میں ملیوں آدمی جرنیلوں سے تعلق رکھنے کی سیاست میں ترقی کی مثالیں ملے کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے باتوں باتوں میں یہ انگلیش کیا کہ جیسے ایک ان جنرل اسلم بیگ نے انہیں ملنے کی دعوت دی۔ جب وہ چودھج الٹی کے ساتھ وہاں ان سے ملنے کے لیے پہنچے تو بیگ صاحب نے ان دونوں کو گردنوں روپے دینے کی پیشکش کی۔ یہ نیکرست رقم انہیں میران بیگ کے اکاؤنٹ سے ملی تھی۔ یہ وہی میران بیگ اسکینڈل ہے جس کے بارے میں امیر خان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک درخواست دائر کی تھی کہ کیسے جنرل اسلم بیگ اور رینا ٹراڈی جی ایس آئی ایس اسد رانی نے سیاستدانوں میں چودہ کروڑ روپے کی رشوت ہانپی تھی۔ جن سیاستدانوں کو میران بیگ سے پیسے دیئے گئے تھے ان میں نواز شریف، فاروق لغاری، سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ہام صادق، ایم کیو ایم کے الطاف حسین، یوسف یمن، جاوید ہاشمی، لیاقت جتوئی، ایم کیو ایم کے آفاق احمد، امتیاز علی، ہام معشوق، اہمل خان، دوست محمد فیضی، عدنان ولد سرتاج عزیز وغیرہ شامل تھے۔

چوہدری شجاعت کے بقول جب وہ اسلم بیگ کے گھر پہنچے تو وہ انہیں ہارڈوں کی شرٹ پہنے بہت دیکھیں نظر آ رہے تھے۔ جنرل بیگ نے ان دونوں چوہدریوں کو بتایا کہ انہوں نے ایک پلان بنایا ہے جس کے تحت آئی بی آئی کے پلیٹ فارم سے لانے والے تمام سیاستدانوں کو ان کے الیکشن کے لیے پیسے ایسے ہائیں گے۔ چوہدری شجاعت یمن ایک سرونگ آدمی چیف کے منہ سے اتنی بڑی بات جو اسنے آرام سے کہی گئی تھی سن کر ششدر رہ گئے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ سے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جنرل اسلم بیگ کو چوہدریوں کا یہ انکار سن کر بڑا دھچکا لگا کیونکہ اب تک ان سے آرہی باتوں میں ہمیشہ آگاہیاں ملنے لگی تھیں اس لیے انہیں کیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ نے یہ سمجھا کہ آگاہ یا چوہدری صاحبان اپنے نام پر پیسے لینے کے لیے تیار نہیں تھے لہذا یہ لگا پکڑا ہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جنرل بیگ نے انہیں پراگم کی کہ وہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھولنے کے بجائے اپنے کسی دوست کو اکاؤنٹ کھولنے کے نام پر کہا جائے گا کہ وہ اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے فرما کر دے۔

جانتے سمجھتے ہوئے چوہدریوں کا حوصلہ نہ ہانپنے کے لیے جنرل بیگ نے یہ بھی حلقوں کی کہ اس بیگ اکاؤنٹ میں گا ہے لگاتے ہی فرار ہوئے رچی گئے اور وہ پیسے چھوڑ پارتی کو انکسٹن جراتے گئے لیے استعمال کر سکیں گے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے ایک گھنٹہ سا استدعا کی طرح ایک بیوقوف گھٹی بنے سے انکار کر دیا جو پانی میں تکیڑا کھانے کے پکار میں دریا کے کنارے ایک فکاری کا چھدا اگل لیتی ہے اور پھر اس کی قسمت کا فیصلہ وہ فکاری کرتا ہے۔ چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ کو بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کی گھنیا سیاست کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ملٹری جرنیلوں سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ ایک حیران اور پریشان آدمی جنرل کو چوہدری شجاعت نے بتایا کہ وہ کیا بات کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی پارٹی کے بہت سارے لوگوں کو الیکشن لڑنے کے لیے خود پیسے فراہم کرتے ہیں۔ بھلا انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب وہ ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ انہوں نے جنرل بیگ کو بتایا کہ وہ ان سے ایک روپیہ بھی نہیں لیں گے اور اپنی جیب سے سارا الیکشن لڑیں گے۔

چوہدری شجاعت نے مجھے بتایا کہ جب جنرل بیگ نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں تو یکدم آدمی جنرل کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ چہرے پر کبھی ناراضگی صاف نظر آ رہی تھی۔ جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت پر زور ڈالا کہ وہ پیسے لے لیں۔ تاہم، آخری حربے کے طور پر جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت کو کہا کہ لھیک ہے، اگر وہ خود پیسے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو وہ ایم این ایز اور ایم پی ایز کا الیکشن لڑنے والے ان لوگوں کی ایک ایسی فہرست تیار کریں جو ملٹری پارٹی کے امیدواروں کے خلاف الیکشن لڑ رہے تھے۔ جنرل بیگ کے بقول ان تمام امیدواروں کو میران بیگ سے قبیوں کی ادائیگی کی جائے گی۔

چوہدری شجاعت نے اس بات کا میرے سامنے اعتراف کیا کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک آدمی چیف کو ناراض کرنے کی جرأت کر رہے تھے جس کا نتیجہ کوئی اچھا نہیں لگتا تھا۔ لہذا انہوں نے بڑی گھنٹاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل اسلم بیگ سے کچھ وقت مانگا اور کہا کہ بہت جلد وہ ایک فہرست بنا کر ان کے حوالے کریں گے جو ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑنے پر راضی ہو جائیں۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے کہا کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی جنرل بیگ سے ملنے نہیں گئے اور وہی انہوں نے اس

روح کی کائنات کے بارے میں کئی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔

کے تھے۔ جب 24 اپریل 2008ء کو چوہدری شجاعت کا یہ تہلکہ فخر انٹرویو کی بنیاد پر منظرِ عام پر آیا تو اس نے ایک نیا سا چہرہ دکھایا۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ چوہدری شجاعت جیسا ہندو اپنے اندر کی کہانیاں باہر لے آئے گا۔ اسی دن سچے چوہدری شجاعت کا فون آیا اور اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ میں نے ان کی بات سے دلچسپی اور خوشی بھری تھی۔ دو مجھے کہنے لگے کہ آپ نے تو پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہر طرف سے انہیں فون آرہے تھے۔ تاہم، میں نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ کارگل کے تھراپیز جنرل مشرف کی حمایت کر کے انہوں نے اپنے پاس کو بہت خوش کر دیا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ کے اس انٹرویو کا کارگل والا حصہ کسی اردو اخبار میں نہیں چھپ سکتا۔ میں نے کہا یا اگلے چھپ سکتا ہے اور میں نے انہیں طریقہ بتایا کہ یہ کیسے چھپ سکتا ہے۔ اگلے دن روزنامہ جنگ میں جنگ کے ایک رپورٹر کے نام سے چوہدری شجاعت کا وہ انٹرویو پھر چھپا۔ بعد میں پتا یہ چلا کہ جنرل مشرف نے چوہدری شجاعت کا میرا لیا ہوا وہ انٹرویو پڑھ کر انہیں فون کر کے بہت سراہا تھا اور انہیں شاباش دی تھی کیونکہ اس انٹرویو سے جنرل مشرف کے اس بیان کی تصدیق ہوتی تھی کہ انہوں نے کارگل آپریشن کو انٹرفیڈ کی مرضی سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ہر انٹرویو اور گفتگو میں چوہدری شجاعت نے کارگل والے سسٹے پر یہی لائن لیتا شروع کی۔

اس سے پہلے جب میں چوہدری شجاعت کا اسٹریو فون ختم کر چکا اور اٹھ کر دفتر آنے لگا تو ایک روایتی میزبان کی طرح چوہدری شجاعت نے مجھ سے بھی پوچھا کہ آپ بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میں دوبارہ بیٹھ گیا اور ان سے کہا کہ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اگر آپ وہ کرا دیں تو میں بہت مشکور ہوں گا۔ چوہدری شجاعت نے کہا کہ بالکل! آپ حکم کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے پاس جنرل ضیاء کے عیارے کی ایک ایسی انکوائری رپورٹ پڑی تھی جو آج تک کبھی نہیں چھپی اور اس کی انکوائری کا پتہ ان کے قبضے میں تھی۔ اگر وہ مہربانی کر کے وہ کاپی مجھے دے سکیں تو میرے لیے بہت

یہ سارے لوگ ان سے بڑی فکر کی، یہ ڈرنا نہیں سکتی، جو بدری شہادت نے قہقہہ مارا اور بولے کہ شیفر کاٹا اور کھانا تھا، اسوں نے گھر سے وعدہ کیا کہ وہ بدری صاحب کو پکائی دھوا کر رکھنے گا اور میں نے ان کے بعد جو بدری شہادت سے بدری کی باتیں ہوئیں اور وہ بدری صاحب نے کچھ کہیں کہتے کہ گھٹا بنگ دو گھٹے نہیں ملے کہ میں بیٹہ کر دو، چھٹ کی کاپی آپ کے لیے آج ملے گی۔ جس دن گھٹے دو گھٹے مل گئے میں دو کاپی وصول کر آپ کو ضرور بھیجوں گا۔ میں ہمیشہ اس سے کہتی کہتا کہ جو بدری صاحب انہیں ملے تو آپ کی دریا دہی اور شہادت کا بیڑا ڈکڑنا تھا، لیکن میں نے آپ سے ایک چھوٹے سے کام کی درخواست کی تھی وہ بھی آپ نہیں کر سکے۔ جو بدری شہادت کے اس وعدے کو سات سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور جو بدری صاحب میرے لیے اب تک دو گھٹے نہیں نکال سکے۔ پچھلے دنوں پاکستان کے بہت بڑے صحافی حاضر تین کے گھر پر ملاقات ہوئی جہاں وہ ڈان کے حضور عباس کے لیے ہونے والی تقریب میں شریک تھے۔ مجھے دیکھا تو خود ہی انہیں یاد آ گیا اور بول چہ سے یارتوں لیٹ لیاں اے۔ ابھی رخصت ملک ادر تھا۔ میں اسے کہتا کہ یہ رپورٹ شاید وزارت داخلہ میں چہی ہو۔ میں مسکرا پڑا۔

اس سے پہلے میری چوہدری شجاعت سے ملاقات 2008ء میں ہوئی جب میں نے اپنے اخبار دی نوز میں ایک سنسنی خیز خبر چھاپی کہ کیسے چوہدری شجاعت اور پرویز الہی نے صدر آصف زرداری کے معتد خاص ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر جا کر خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب آصف زرداری صاحب نے بینظیر بھٹو کے چہلم کے اگلے دن نوڈیرہ میں بیٹھ کر اپنی پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پی ایم ایل کیونکو قاتل لیگ قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری اس پارٹی اور اس کے لیڈروں کو بینظیر بھٹو کا قاتل سمجھتے تھے۔ یہ بات چوہدری شجاعت اور پرویز الہی کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی کہ کہیں اقتدار میں آکر ان دونوں پر بینظیر بھٹو کے قتل کا مقدمہ نہ درج کر لیا جائے۔ اسی اثناء میں شہباز شریف نے بھی چوہدری منوٹس الہی کے گرد گھیراٹک کر نا شروع کیا، خصوصاً بینک آف پنجاب کے 9 ارب روپے کے اسکیئنڈل کی کہانیاں اخبارات میں چھپنے لگیں۔ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھیرے میں پا کر سمجھدار سیاستدانوں کی طرح چوہدری شجاعت

اور پرویز الہی نے آصف زرداری سے شکایتیں بڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کا انقلاب کیا گیا۔ قدرت نے پرویز الہی کو کھانے کے لیے اس ملک میں آٹھ سال تک کوئی پتہ نہیں ملا تھا، آج ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ کر رہا ہے جسے ہمارے اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچانی چاہئے۔

اپنے اخبار میں یہ کہانی لکھتے ہوئے مجھے اپریل 2005ء کی ایک صبح یاد آگئی جب میں بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ آصف علی زرداری کے ساتھ وطن سے آکر لاہور ایئر پورٹ پر اتر تھا۔ زرداری صاحب کا استقبال کرنے کے لیے ملک بھر سے آئے ہوئے پارٹی ورکرز پرویز الہی کی پنجاب پولیس کے ہاتھوں ڈاکے کھا کر لہو بہاں ایئر پورٹ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف زرداری کو ایجنسیوں نے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ لاہور فتح کر لیں تو ملک میں نئے انتخابات کرا لیے جائیں گے اور ان کی پارٹی حکومت حوالے کر دی جائے گی۔ آصف علی زرداری صاحب بھی ایجنسیوں کے مہمانے میں آ گئے۔ تاہم لاہور ایئر پورٹ پر جہاز کے لینڈ کرنے سے پہلے ہی انہیں پتہ چل چکا تھا کہ گیم ختم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جہاز کے اندر لاہور کے ایس پی میمن نے آکر آصف زرداری کو سیلوٹ مارا تو انہوں نے اپنی راجی سکرابت سے اس نوجوان آفیسر کو کہا کہ تمہارے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ ہوں گے لہذا مجھے لے چلو۔ ہم سب صحافی بیڑے حیران ہوئے کہ یہ صاحب تو لاہور فتح کرنے آئے لیکن وہ چپکے سے ایس پی میمن کے ساتھ سریندر گازی میں بیٹھ کر زرداری ہاؤس چلے گئے اور پرویز الہی کے کمانڈر نے ہم صحافیوں کو مارا، گرجا دیا۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم نے زرداری صاحب کے ساتھ وطن سے آنے کی ضمانت لی تھی۔

آخر میں روزنامہ کہ وہی پرویز الہی اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ کر رہے تھے اور سومر صاحب نے بھی پنجاب کے ان چھ بڑوں کو مارا نہیں کیا اور اپنے صاحب نے صرف انہیں جیل بھیج دیے تھے۔ ان کے قریبی ساتھیوں نے انہیں جیل سے بچا دیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ایک ایک صحافی کے لیے جیل جانا ایک بڑا شرمناک واقعہ ہے۔

کے گرد منڈلاتے تمام فطرات بھی دور ہو گئے۔ اس کے بعد چوہدری شجاعت اور پرویز الہی نے آصف زرداری کے صدر بننے کے بعد ان دنوں صدر میں رات کے اندھیرے میں کئی کھانے کھائے جہاں یہ منصوبے بنائے گئے کہ پنجاب میں نواز شریف اور شہباز شریف کی کمر کیسے توڑی جائے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی پنجاب میں گورنر راج لگا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب لوگوں نے دیکھا کہ کیسے ان سب لیڈروں کو اپنا قہوکا ہوا چاٹا پنڈا۔ نہ صرف نواز شریف اور شہباز شریف عدالتوں سے بحال ہوئے بلکہ پنجاب حکومت بھی واپس کر دی گئی۔

اپنے ایف ایٹ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چوہدری شجاعت اور پرویز الہی مجھے یہی سمجھا رہے تھے کہ مجھے اس طرح کی خبریں نہیں چھپانی چاہئیں۔ ایک بات کی میں یقیناً داد دوں گا کہ میں نے چوہدری شجاعت اور پرویز الہی کے خلاف ان کے قریبی معاف کرانے سے لے کر فیصل آباد کی سونیٹاز کے ساتھ پنجاب میں اونے والے ریپ کیس اور اب قیوم سومرو کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کی کئی ایسی خبریں چھپانی تھیں جو یقیناً کوئی بھی مکران پسند نہیں کرتے۔ لیکن کسی ایک دن بھی چوہدری شجاعت یا پرویز الہی نے میرے ساتھ کئی یا سختی سے بات نہیں کی بلکہ جب اور جہاں ملے بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں تمام سیاسی لیڈروں کے برعکس چوہدری شجاعت اور پرویز الہی میں ہم صحافیوں کو اپنے خلاف لکھنے کے باوجود برداشت کرنے کی بہت بڑی کوالٹی ہے۔

یہی وجہ ہے میں چپ چاپ چوہدری شجاعت اور پرویز الہی کی باتیں سننا رہا اور جب انہیں ملے تو ان سے ایک ہی بات کی کہ چوہدری صاحب آپ نے مجھ سے پانچ سال پہلے جیل قیام کی انکوائری رپورٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور آپ نے آج تک میرا وہ کام نہیں کیا۔ چوہدری شجاعت تو میرے چھپنے سے گئے اور بولے کہ جس دن انہیں اور کچھ صحافیوں کے وہ انکوائری رپورٹ وصول ہو جائے گی ان باتوں میں نہ چوہدری صاحب کو روکھنے ملے گی اور نہ ہی انہوں نے جیل قیام کے قیام کے بارے میں کچھ بھی سننے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک شرمناک واقعہ ہے کہ مجھے یہ بھی سمجھنا پڑا ہے کہ ان کی رپورٹیں کبھی نہیں لکھی گئیں۔

چوہدری ثار علی خان

اکتوبر 2002ء کے ایجنٹ کے بعد قی پارلیمنٹ وجود میں آئی تھی۔ چوہدری ثار علی خان کا میں نے اب تک صرف نام سنا تھا ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بدلتے حالات و واقعات کے مطابق میں نے بھی اپنے آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیا تھا اور پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کے لیے اپنا نام اپنے ایڈیٹر سلیم بخاری کو دینا چاہا۔ سلیم بخاری اور اوی بھٹو کے چیف رپورٹر شکیل شیخ کی مہربانی سے میرا نام پارلیمنٹ کی اورنگ کر کے واسطے پارلیمان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ بات بتاتے ہوئے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ پارلیمنٹ ہائے سے لگے مجھے سیاست اور سیاسی خبروں سے بڑی چٹھنی اور میں جہاں جاتا تھا کہ یہ سیاسی رپورٹر کیا محنت دیتے رہتے ہیں۔ پہلا سیاسی رپورٹر لگ کر نا بھی کوئی رپورٹر لگ ہے۔ سارا دن سیاستوں سے لگے رہیں اور تمام کو اپنے دو چار انگلیں بنا کر اسی کپ شپ کو اخبار میں پھاپ دیں۔ نام پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کرنے کے بلکہ میرے بعد مجھے احساس ہوا کہ سیاسی رپورٹر لگ کا اپنا ایک لٹریچر ہے۔ یہ اس میں ادب ہائے وہی سکندر ظہیر ہے۔ ادب میں نے چوہدری شجاعت کا پہلا سیاسی ٹھکانا میڈیوفاکس اپنے اخبار میں پھاپا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے اور انہی کے بلکہ اسے اہم لوگوں کا بھی اندراج کرنا چاہیے تاکہ ایک پوری سیاسی تاریخ مرتب کی جاسکے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان مسلم لیگ نواز کے خواجہ محمد آصف ہی تھے جنہوں نے مجھے دو تین دفعہ یہ تجویز

دی کہ میں چوہدری ثار علی خان سے ملوں اور ان کا انٹرویو کروں۔ خواجہ صاحب کے قبول تیار کے پاس بہت بڑے بڑے راز تھے۔ ایک دن قومی اسمبلی کا اجلاس ختم ہوا تو پارلیمنٹ کیلئے میرا میں چوہدری ثار اور خواجہ آصف صحافیوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھے تھے۔ میں اس سے پہلے چوہدری ثار سے کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ تاہم، میں خواجہ صاحب کے قریب گیا، ان سے علیک سلایک ہوئی۔ چوہدری ثار علی خان سے بھی ہاتھ ملایا اور وہیں اسی میز کے گرد بیٹھ گیا۔ اچانک خواجہ آصف نے مجھ سے پوچھا کہ روف اور کیا نئی تازی ہے۔ میرا نام سن کر چوہدری ثار تھوڑا سا چوٹے اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ آپ روف کلاسرا ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ ان کی بڑی مہربانی کہ وہ فوراً کھڑے ہو گئے اور دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ کیسے جب وہ جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد فیض آباد میں واقع اپنے گھر پر قید تھے تو انہوں نے پہلی دفعہ دی بھڑ میں میرا نام خبروں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ ان کے لیے میری تحریریں جہاں جہاں کا سب قس قس کیلئے مارشل لاء کے باوجود جنرل مشرف کی حکومت کے خلاف نہ صرف سخت تحریریں میرے نام سے چھپ رہی تھیں بلکہ بہت سارے سیکڑ لڑکھی اخبار کی ذمہ داریاں بھی تھیں۔ چوہدری ثار کے لیے یہ بات بڑی جہاں جہاں کا سب قس قس کیلئے ایک نیا رپورٹر تھا اور سب لیتے ہوئے جنرل مشرف کے مارشل لاء کے خلاف خبریں تحریر کر رہا تھا۔

بعد میں مجھے چوہدری ثار نے بتایا کہ ان کی سبھی میری تحریروں کی گراہی تھیں۔ ان کے خیال میں میں سندھی تھا کیلئے گراہی رپورٹر اسے طے طریقے سے فوری مارشل لاء کے خلاف نہیں لکھ سکتے تھے۔ تاہم، میں نے چوہدری ثار کو بتایا کہ میں سندھی نہیں بلکہ سرائیکی ہوں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد چوہدری ثار سے کپ شپ بڑھتی گئی۔ وہ ان دنوں سیاستدانوں میں سے ہیں اور اب چاہیں اور میں سے چاہیں دوستی قائم کر سکتے ہیں اور اب یہ محسوس کریں کہ اب اس دوستی کی ضرورت نہیں ہے تو بھی وہ ایک لمحے میں اس بندے کو اپنے آپ سے دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے خود بھی چوہدری ثار کی شخصیت کے اس پہلو کا تجربہ ہوا ہے جسے میں بعد میں بیان کروں گا۔

چوہدری شجاعت کے انٹرویو کے بعد ماحول بڑا سازگار تھا اور بہت سارے سیاستدان مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تاہم، میں نے چوہدری ثار علی خان سے درخواست کی کہ میں ان کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ آپس کی بات یہ ہے کہ مجھے ثار کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں تھا اور

تاریخ پانچویں صدی ہجری میں یہ بات مانے کو تیار نہیں تھے کہ محمد خان جو نیچا اور تھوڑی سی سہارا کے ساتھ اس کے بعد اس کے
پہلوں کو دروازہ بنا دیا ہے۔ تاریخ نے کہا کہ دراصل یہ بھی ایک دوسرا انکار میں تھیں تو ایک قسم کی سہارا کا
تاریخ نے کہا کہ ایک سہارا کی حکومت کو اس میں کرنا تھا۔

وطن کے اندر مقرر کیا جائے گا۔
 اپنا کھانے پانے کا کاروبار جو نچو حکومت میں وزیر تھے انہی دنوں میں بنظیر بھٹو وطن لوٹی
 تھیں۔ میرے سوال پر مارتھ نے لگے کہ جنرل ضیاء بنظیر بھٹو کی وطن واپسی کے اسنے زیادہ مخالفت نہیں
 تھی۔ تاہم ضیاء کا یہ خیال تھا کہ پاکستان کا سیاسی اور جمہوری سلسلہ جو ابھی نیا بنایا جا رہا تھا وہ اسکا بچھڑ نہیں
 سوا تھا کہ بنظیر بھٹو کے ہاتھ تو دھڑلوں کا سامنا کر سکے۔ تاہم، جو نچو نے جنرل ضیاء کو اس بات پر راضی کر
 لیا کہ بنظیر بھٹو کے وطن واپس آنے سے ضیاء کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ جو نچو کا یہ بھی خیال تھا کہ
 بچھڑاؤ کا کہ بنظیر بھٹو کا سیاسی طور پر سامنا کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد بنظیر بھٹو وطن واپس آئیں اور جیسا
 کہ جو نچو نے کہا تھا اس سے ملک میں فوری طور پر کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی اور سیاسی حکومت بنظیر بھٹو
 کی وجہ سے نہیں، جنرل ضیاء کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔

28 جنی 1988ء کو جب درجہ حکومت ختم کی گئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہت سارے وزیر جنہیں جنرل ضیاء نے برطرف کیا تھا وہ دوبارہ حلف لے کر ان کی نگرانی میں قائم کی گئی اور میں بیٹھ گئے تھے۔ چودہویں مارچ ان وزیروں میں شامل تھے جبکہ پنجاب میں نواز شریف نے قائم مقام وزیر اعلیٰ کا حلف اٹھالیا تھا۔ تاہم، نثار نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز اور انہوں نے خود درجہ کے خلاف جنرل ضیاء کی حمایت کر کے غلطی کی تھی۔ تاہم، نثار نے کہا کہ شاید اس لیے کے پیچھے یہ وجہ تھی کہ پنجاب میں ہی پکا زاحساب مسلسل نواز شریف کے خلاف ایک سیاسی گروپ کو ایٹھ صحت کا تھیں ہمارے تھے۔ یوں ہمارے پاس ایک بڑی وجہ بن گئی تھی کہ ہم اسلام آباد میں ہی پاکستان کے سربراہانِ عظم کا ساتھ نہ دیں۔ تاہم، نثار نے یہ بات مان لی کہ چاہے وجہ کچھ بھی ہو، یہ سب بالکل صحیح ہے تو اس سیاسی قوتوں کو ایک سیاسی وزیرِ اعظم کا ساتھ دینا چاہیے تھا کہ ورنہ وہی میں بیٹھے جسے ایک جنرل کا نہیں جنرل ضیاء نے نواز شریف اور جو نیچے کے درمیان اختلافات کا بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ بہت سے حکومت قبضہ کر رہی۔

تاکہ راجہ جیو داس کے اعداد بھی ایک سیاسی دور کر زد ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب نیا دے

جو بیجو کی حکومت ۱۹۷۷ء سے اس انکشن کے خلاف ایک بڑا اور دار بیان دیا۔ یہ بیان چھ کرکوں اور شریف نے ۱۵ کرکوں کیا اور یہ جماعت کی کہ وہ اس طرح کے بیان دینا بڑھ کر دینی اور ۱۵ مارچ ہو گئے۔

میں نے ۵۰ سے پانچ لاکھ جنرل ضیاء کی شخصیت کس طرح کی تھی۔ وہ بولے ضیاء نے بڑے غلطے مزاج کے تھے اور بڑی شہرت سے بچل آتے تھے۔ تاہم جو بیج حکومت پر طرف کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک قابل زندگی شروع نہیں کر سکے تھے۔ جو بیج حکومت کی برطرفی سے لے کر اپنی موت تک ۵۰ نے شاید ہی جنرل ضیاء کو اچھے موامش دیکھا ہو۔ ۵۰ نے کہا کہ ایک دن کاہنہ میٹنگ سے پہلے بی بی وی کے کیمرو میں کے آنے سے قبل جنرل ضیاء نے اپنے تمام وزیروں سے کہا کہ وہ پاری پاری کیمرو کے سامنے مسکرائیں تاکہ عام پبلک میں یہ تاثر پائے کہ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھی ہرگز پریشان نہیں ہیں۔ اس ایک بات سے جنرل ضیاء میں پچھلی ٹینشن اور پریشانی کا اندازہ ہوتا تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔

ہاتوں ہاتوں میں تار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ جنرل ضیاء کا عیارہ کرلیش ہونے سے کچھ دن قبل جنرل ضیاء کے سینئر وزیر اسلم ملک نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے لہذا وہ ہوائی جہاز کا سفر ترک کر دیں۔ جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کو بتایا کہ خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ تار کے بقول جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کی بات کو زیادہ سیریس نہیں لیا تھا حالانکہ اسلم ملک کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس کوئی اندر کی انظار میں موجود تھی کہ جنرل ضیاء کو قتل کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جنرل ضیاء پاکستان کی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے لیے اب ایک بہت بڑا ابوجہ بن چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنرل ضیاء اپنی موت سے قبل یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ملک میں نئے انتخابات نہیں کروائیں گے اور مختلف آپشنز پر غور ہو رہا تھا۔ ایک دن جنرل ضیاء نے کیبنٹ میٹنگ بلائی اور اپنے تمام وزیروں سے یہ پوچھا کہ کیا ملک میں نئے الیکشن ہونے چاہئیں۔ وزیروں کی اکثریت نے ملک میں نئے انتخابات نہ کروانے کا مشورہ دیا اور یہ تجویز دی کہ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کر دیا جائے۔ ان وزیروں نے جنرل ضیاء کو بتایا کہ وہ ابھی بھی ملک میں بہت زیادہ پاپولر تھے اور جینظیر بھٹو کو صدارتی انتخاب میں شکست دے سکتے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرتے کے لیے ان وزیروں نے یہ بھی بتایا کہ لوگ ایک عورت کو وائٹ نہیں دیں گے۔ تار نے جب یہ

پہلے تھے۔ مگر ان کے نقل و حرکت اور شریف نے 1991ء میں اپنے کامیابی کے اعلان کی شہادت دے کر
 پوری حکومت اسحاق خان کو ہٹا دیا۔ اس وقت اس نے تمام وزیروں سے حلف لیں۔ تمام وزیروں کو ہٹا کر اس نے خود
 یہ فرائض سر انجام دیے اور اس نے تمام اسحاق خان کے وزراء کو ہٹا دیا۔ اس نے یہ کہہ کر ان کے
 وزیروں کو ہٹا دیا کہ میں چاہتی ہوں کہ تمام اسحاق خان کے وزیروں کو ہٹا دیا جائے۔ اس نے
 اس وقت سے انکار کر دیا کہ جب تک ان کے داماد انور شریف اللہ خان کو وزیر نہیں بنایا جائے گا تو وہ حلف نہیں لے
 گے۔ ان کا ایک مطالبہ تھا کہ انور شریف کے داماد کو ہٹا دیا جائے اور انہوں نے اس وقت سے یہ بات ماننے سے
 انکار کر دیا۔ تمام اسحاق خان نے بھی اسے وزیروں کو حلف دلوانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل ایک گھنٹہ
 تک انور شریف اور تمام اسحاق خان میں بحث ہوتی رہی۔ آخر تک آ کر انور شریف انور شریف اللہ خان
 کو ہٹا دیا۔ یہ چار گھنٹہ تمام اسحاق خان نے یہ اصرار جاری رکھا کہ ان کے داماد کو ہٹا دیا
 دیا جائے۔

اس کا نام میں بنظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان بدھتی ہوئی سیاسی دشمنی پاکستان آرمی کے لیے اسی بے آرمی کا سب سے بڑی قہر ہے۔ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ نے ذرا عظم نواز شریف اور بنظیر بھٹو کے درمیان ایک ملاقات کروائی تاکہ وہ بیٹھ کر اپنے اختلافات دور کر سکیں۔ تاہم جب غلام اسحاق خان کو یہ پتہ چلا تو انہوں نے یہ میٹنگ نہیں ہونے دی۔ انہوں نے بتایا کہ غلام اسحاق خان یہ چاہتے تھے کہ نواز شریف بنظیر بھٹو کو کرپشن کے الزامات پر سیاست سے ہٹا دیں۔ لیکن ان کی یہ کوشش غلام اسحاق خان نے بنظیر بھٹو کے خلاف بہت سارے سوشل سائنس چار کے تحت اٹھائے ہوئے ہیں۔ چاہے نواز شریف انہیں عدالتوں میں دائر کریں۔ غلام اسحاق نواز شریف سے ان کے لیے انا غول تھے کہ ان کی حکومت بنظیر بھٹو کے خلاف کیسز میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ بنظیر بھٹو کے خلاف اپنی ذاتی دشمنی پوری کرنے کے لیے نواز شریف کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہی سبب تھی کہ انہوں نے بنظیر بھٹو کے خلاف جام ساقی کی حکومت کے اقدامات کو پوری طرح تھکے فراہم کرنے تھے۔ ان کے جھل اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام اسحاق خان بہت مخفی اور ذہین شخص تھے اور ان کی سلوکات خان کی بی بی سخت گرفت تھی۔ تاہم وہ ایک بہت ضدی شخص تھے۔ غلام اسحاق کی سوتلی بیٹی بنظیر بھٹو کی والدہ کے خلاف پھنس گئی تھی اور وہ اس معاملے پر نواز شریف کی کوئی بھی بات سننے کو تیار

تھیں تھے۔ نوادر شریف اور نظام الحاق کے درمیان اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جس میں حوالہ آصف
نور کی پہلی تک حوت واقع ہو گئی۔ اچانک حدود میں ایک جنگ کال کی آئی جس میں حوالہ آصف نور
کے مرتے کے بعد سے آرمی چیف کے سامنے فوراً کیا گیا۔ نوادر شریف چاہے تھے کہ حوالہ رحمہ دل بھی
جو اس وقت سب سے سنگرم جنرل تھے انہیں پاک فوج کا نیا چیف بنا دیا جائے تاکہ نظام الحاق خانہ حوالہ
فرخ کو بٹا دیا جائے۔ بعد ازاں وزیر اعظم کے درمیان بہت جتنی ہو گئی۔ نوادر شریف اس جنگ کو
دوسرا چھوڑ کر واپس آ گئے۔

حالات اسکا تک شراب ہو گئے تھے۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ جزل آصف نواز کے جنازے میں تمام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرے کے ساتھ کڑے تو تھے لیکن دلوں نے بات جیت نہیں کی۔ اس ڈیڈ لاک کو توڑنے کے لیے چوہدری نثار نے کوششیں شروع کر دیں اور انہوں نے روداد خیر خان سے ایک ملاقات کی جن کا تمام اسحاق خان پر بڑا اثر و سونخ تھا۔ آخر جزل دھیمہ کا کڑے نام پر معاملہ طے ہو گیا۔ اگرچہ نواز شریف جزل کا کڑے نام پر بھی راضی نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں ابھی ان کی مرضیت آف آدنی منافق بننے کی نہیں تھی۔ تاہم چوہدری نثار نے نواز شریف کو سنا لیا تاکہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان بھاری اس جنگ کو ختم کیا جاسکے۔ اسی اثناء میں نواز شریف تک یہ خبر پہنچی کہ تمام اسحاق خان اور شیخوپورہ پارٹی کے ایڈیٹروں کے درمیان قاصدے بی بی حمزہ سے کم ہوا ہے۔ بدخون قوم پرست ایڈیٹر محمود خان اپکنڈ کی اور افکار گیلانی نے چوہدری نثار اور شہباز شریف کو بتایا کہ وہ ان دونوں کو کھانسی پر پورٹس میں رہے تھے کہ تمام اسحاق خان اور شیخوپورہ پارٹی کسی قسم کی نئی سازش میں مصروف ہیں۔ محمود اپکنڈ کی یہ چاہتے تھے کہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف اپنے اختلافات بھلا کر، متحد ہو جائیں کیونکہ حکومت لے لیں۔ چوہدری نثار نے نواز شریف سے بات کی، تاہم وہ بینظیر بھٹو پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔

چو بدوی تھار نے محمود خان اپکنزئی کی بی بی تعریف کی اور کہا کہ وہ پاکستان کے ایک ایسے لیڈر تھے جنہیں ہمیشہ اندر درہٹ کیا گیا۔

چو ہدیری شمار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ اس موقع پر اپنے قریبی ساتھیوں سے ایک میٹنگ میں نواز شریف نے انہیں بتایا کہ وہ قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ تمام لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی۔ تاہم، نواز شریف نے کہا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی طاقتوں کے آگے نہیں ہٹیں گے

کھانا بنانا اور اس کی خدمت کرنا۔ ان کے لئے ان کے لئے جو کچھ ہے وہ ان کے لئے ہے۔
 بہت سے لوگ اس کے لئے ہیں۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔

جس نے جو بھی ٹار سے پوچھا کہ ایم کیو ایم کے خلاف فوجی آپریشن کی کیا حقیقت تھی تو
 انہوں نے ایک لمبی کہانی سنانی۔ وہ کہنے لگے کہ میں 1992ء میں ہونے والے ملٹری آپریشن کی بات تو
 بعد میں یاد آئی کہ اس سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان سیکرٹ ایجنسیاں اور فوجی
 انٹیلیجنس کیسے جس ایم کیو ایم کو ملک دشمن، غدار اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیتی تھیں، اسے 2002ء کے
 آپریشن کے بعد سندھ اور مرکز میں خودی اقتدار میں لے کر آئیں۔ چوہدری ثار نے 1999ء کے اوائل
 میں ایک ایسی میٹنگ کا ذکر کیا جس میں نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف
 موجود تھے۔ آئی ایس آئی کے اس بریگیڈیئر نے ان دونوں کی موجودگی میں کہا کہ چوہدری ثار کی
 اطلاعات حسین سے لندن میں ملاقاتیں ان کے لیے پرالیم پیدا کر رہی ہیں۔ نواز نے بڑے غصے میں اس
 بریگیڈیئر کو جواب دیا کہ ملک کے لیے پالیسی بنانا آئی ایس آئی کے آفیسر کا کام نہیں ہے۔ اس کا کام
 محض اطلاعات پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسی میٹنگ میں ہی 72 سیاستدانوں کے نام پیش کیے گئے تھے جو
 ان لوگوں کی سرپرستی کرتے تھے۔

چوہدری ثار کو یہ بات کچھ نہیں آ رہی تھی کہ جب وہ ایم کیو ایم کو قوی دھارے میں لانے میں
 مصروف تھے تو اس وقت نواز شریف کو یہ بتایا گیا کہ ایم کیو ایم ایک ملک دشمن جماعت تھی اور یہ بھارت
 کی فوجی ایجنسیوں کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ آئی ایس آئی اور سیکرٹ ایجنسیاں الطاف حسین کی اسی
 اہمیت کے ساتھ ان کے لئے آئی تھیں۔ ثار کے بقول، انہوں نے ایم کیو ایم کی وجہ سے بہت

ساری زندگی بیکار رہی۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔

میں اب بھی جو چوہدری ثار سے 1992ء کے ملٹری آپریشن کے بارے میں پوچھتا چاہ رہا تھا۔
 ثار کو ابھی تک یاد تھا کہ جنرل آصف نواز پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی یہ باؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ایم کیو ایم
 کے خلاف ہونے والے آپریشن کی تفصیلات ٹیلی ویژن کے ذریعے پوری قوم کو دکھائیں۔ نواز شریف
 اس وقت لندن میں الطاف حسین سے ملاقات کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ تاہم ثار نے پی ٹی وی
 کو آپریشن کی ویڈیو دکھانے سے منع کر دیا۔ جب نواز شریف لندن سے پاکستان لوٹے تو انہوں نے
 اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک ملاقات کی اور اس میں فوجی قیادت کے خلاف خاصی سخت زبان استعمال
 کی۔ فوج کے خلاف ہونے والی اس تنقید کو کسی نے اخبارات کو لیک کر دیا اور جنرل آصف نواز نے اس
 کا سخت برا منایا۔ چوہدری ثار نے اس برے وقت میں نواز شریف کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا
 جس پر غصے میں آ کر جنرل آصف نواز نے سیکرٹ ایجنسیوں کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ چوہدری ثار ملی کے
 بھائی جنرل افتخار علی خان اور ان کے ایک اور عزیز پر بڑا دباؤ ڈالا گیا۔ کچھ دنوں بعد چند مشترکہ دوستوں
 نے جنرل آصف نواز اور چوہدری ثار کے درمیان ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ جنرل آصف نے
 چوہدری ثار سے شکایت کی کہ ان کے خاندانوں کے تعلقات بہت پرانے تھے، پھر بھی وہ محض ایک تاجر
 (نواز شریف) کے لیے ان تعلقات کا خیال بھی نہیں کر رہے تھے۔ ثار نے جنرل آصف کو جواب دیا کہ
 جناب کس میں اتنی جرأت ہے کہ کوئی آرمی چیف کے خلاف اپنی توپوں کا رخ کر سکے۔ جہاں تک ان کی
 نواز شریف کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے ثار سے پوچھا کہ فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان بد نظمیوں کے خلاف عوام

Handwritten text in Urdu script, likely a continuation of the letter or a separate note. The text is dense and covers the bottom half of the page.

[illegible]

جوہری دار کے ساتھ میری گئی وہاں پر مجھ کو مل گیا اب اس کا اعلان کرنا چاہی نہیں۔
 ملک سے الگ ہونے کا ارادہ تھا کہ جوہری دار کے ساتھ سیاست دان کے ساتھ ہوتا نہیں گئے دن اور مجھے
 افسانہ کی صورت میں دیکھا جا کر گئی وہاں میں ساتوں کی اسٹیمپ اور سیاست دانوں کے اور یہاں
 ۱۹۷۵ء میں اسٹیمپ کی کچھ آگئی ہے۔ یہ ملو کہانی تھی کہ سیاست دانوں اور اسٹیمپ کے
 ان کو دینے اس ملک میں اس کے افراد کو کافی عوامی نقصان پہنچایا تھا۔ جو اس وقت ہمارے
 ملک میں آ رہی تھی اس وقت کی خزانہ سیاست دانوں نے اب جب کہ فریبوں کے ہاتھوں اتنی بڑی دولت کا
 سامنا کیا تھا تو کیا کیا تھا۔ کیا سیاست دان ابھی بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ بے قصور تھے یا انہوں نے کوئی
 غلطی کی تھی جس کی وجہ سے ان کا یہ انجام ہوا تھا۔

مکی سولہ میں نے جو بدلتی دھار سے پوچھ لیا۔ دھار نے میری طرف دیکھا اور بلا سے اٹھا کر
 بولے کہ خیر عارف پادری لیا دھار سے بھی بہت لطیفیاں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ہم سب کا آرزو

[illegible]

جو ہداری نثار کی یہ باتیں سن کر نواز شریف کا ہکا بکا رو گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ نواز شریف نے اپنے ہاتھ سے ایک پٹ لکھی اور جو ہداری نثار کو بھجوائی، جس میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے نواز شریف نے یہ لکھا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ان سے علیحدگی میں بھی کر سکتے تھے۔ نواز شریف نے اپنی پٹ میں لکھا تھا کہ نثار نے اسے اپنی کاغذ کے قلم و ذریعوں کے سامنے بے عزت کیا ہے۔

رجز منٹ کے بعد جہیز میں جاگت ٹیٹس آف سٹاف کچھ مقرر کرنا چاہتے تھے۔ تاہم، عام توقعات کے برعکس جنرل کرامت کا پینل سیکرٹری کونسل نے کانٹا نہ جان ہی ان کے نواز شریف کے ساتھ اختلافات کی کوئی ایک ہونے لگا۔ نواز شریف کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ جب جنرل کرامت اپنے وطن کے ایک ایسے دوست سے ملے جو نواز شریف کے بھی دوست تھے تو انہوں نے وزیراعظم کے بارے میں کچھ ایسے ریمارکس دیے جنہیں پسند نہیں کیا گیا۔ نواز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت سے اپنے بارے میں کچھ ریمارکس کے بارے میں وضاحت طلب کی تو وہ اپنی بات سے منکر ہو گئے۔ نواز شریف اور جنرل کرامت میں بات چیت بدگئی کی وجہ سے عرب امارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو بے جا دھم دھت کر کے دونوں میں صلح کرانی پڑی۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان ٹینشن کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جنرل جہانگیر کرامت اپنی مرضی کے ایک جنرل علی قلی خان کو اپنے بعد آری چیف بنوانا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے وہ دو رات لائٹ بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وزیراعظم نواز شریف کو سیکرٹری ایجنسیوں نے کچھ ایسی رپورٹیں بھی بھیجی تھیں جو متوقع آری چیف کے خلاف تھیں۔ اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل نسیم رانا بھی نواز شریف کے پاس نئے چیف آف آری سٹاف کے متوقع امیدواروں کے بارے میں کچھ ایسی فائلیں لے کر آئے تھے جو ٹیکہ تھیں۔ جرنیلوں کی حرکتوں اور ان کے کڑوتوں کے بارے میں سیکرٹری ایجنسیوں کی تیار کی ہوئی رپورٹیں دیکھ کر چوہدری ثار پہلی دفعہ بڑے ڈسٹرب ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیکرٹری ایجنسیاں اپنے سرونگ جرنیلوں کے بارے میں بھی اس طرح کی چیزوں کا خفیہ ریکارڈ رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف اور صدر فاروق لغاری کے درمیان تعلقات خراب ہوئے تھے تو جنرل کرامت نے بھی ایک خط وزیراعظم کو لکھا تھا جس پر نواز شریف خوش نہیں تھے۔ جنرل کرامت نے اونٹ کی کمر پر آخری تک اس وقت رکھا جب انہوں نے نیول وار کالج والاہور میں پینل سیکرٹری کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے اس خطاب سے اسلام آباد میں بیٹھے سب لوگ چونک گئے۔ چونکہ یہ وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کرامت نے پینل سیکرٹری کونسل کا نام اپنی تقریر میں نہیں لیا تھا لیکن جب آئی ایس پی آڈیو فیسر علی محمد پر پینل سیکرٹری کونسل کا خط پریس ریلیز میں شامل کر کے پٹی ڈی کو بھجوا دیا تو اس سے

حکومت کو احساس ہوا کہ معاملہ بہت سیر نہیں ہے۔

نواز شریف نے سوچا کہ اب کافی ہو گیا ہے۔ جنرل کرامت نے اپنی حدود سے تجاوز کر لیا تھا۔ نواز نے ہر قیمت پر جنرل کرامت کو گھر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری ثار اور شہباز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت کو ہٹانے کی مخالفت کی لیکن نواز شریف نے یہ کہہ کر ان کی بات مسترد کر دی کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک میں اب سولین لوگوں کی رٹ قائم کی جائے۔ نواز نے جنرل جہانگیر کرامت کو وزیراعظم ہاؤس بلا لیا اور غیر متوقع طور پر کرامت نے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی۔ اسی شام ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کو آ کر دے گئے۔

○○○

اب نواز شریف کو ایک دفعہ پھر ایک نئے آری چیف کی تلاش تھی جو ان کے خیال میں ایک سولین حکومت کو جوابدہ ہو اور وہ نہ تو وزیراعظم کو کسی صدر کے حق میں خط لکھے اور نہ ہی اپنی تقریروں میں کھلے عام پینل سیکرٹری کونسل بنانے کی تجویز پیش کرے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بیٹھ بیٹھے ملک کے وزیراعظم کے خلاف گفتگو بھی نہ کرے۔ جنرل علی قلی خان کے خلاف چوہدری ثار اور جنرل افتخار علی خان پہلے ہی محاذ بنا چکے تھے اور نواز شریف چوہدری ثار سے پوچھے بغیر کوئی نیا آری چیف نہیں لگانا چاہتے تھے۔

جب میں نے ثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف کو کس نے آری چیف بنوایا تھا تو انہوں نے مجھے کہا کہ نواز شریف نے خود ہی مشہور صحافی سہیل وزاچ کو جدہ میں دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ انہوں نے چوہدری ثار کے کہنے پر انہیں آری چیف لگایا تھا۔

چوہدری ثار نے مجھے جنرل مشرف کو آری چیف بنوانے کی کہانی سنانا شروع کی۔

جس شام ڈی جی آئی ایس آئی جنرل رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کے حوالے کر گئے تو نواز شریف نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ وہ کور کمانڈر منگلہ لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ وہ رات کے نو بجے سے پہلے نہیں آ کر ملیں۔ جنرل مشرف کو جب یہ ٹیلیفون کال ملی تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ ملک کا وزیراعظم جس نے کچھ دیر پہلے آری چیف

سے اعلیٰ لیا تھا وہ انہیں اس طرح ہمارے گھر لائے گئے اور انہوں نے ملری تھروزی سے پوچھا کہ کیا میں وزیراعظم سے ملنے کو بللارم میں آؤں یا سادہ کپڑوں میں؟ جزل مشرف کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا وزیراعظم ان سے سرکاری طور پر ملنا چاہتے تھے یا وہ ان سے کوئی ملکی بینک کر رہا تھا ہے جس کا فوج کی اعلیٰ قیادت کو علم نہ ہو لے پائے۔ جزل مشرف کو بتایا گیا کہ وہ سادہ کپڑوں میں بللارم ہاؤس میں وزیراعظم سے ملنے آئیں۔

تاہم، جزل پر وزیراعظم کو پہلے کے دہے ہوئے مقررہ وقت پر وزیراعظم ہاؤس نہ پہنچ سکے۔ یوں پی ٹی وی نے نو بجے کی خبروں میں جزل جہاگیر کراست کے اعلیٰ کی خبر تو چلا دی تھی اور ساتھ میں جزل پر وزیراعظم کو کیا آری چیف ہانے کا بھی اعلان انہی خبروں میں کیا گیا۔ اس وقت جزل مشرف اسلام آباد ایئر پورٹ پر ایک چمکی چمکی تھے جب انہیں سواہل پر ان کے کسی دوست کا فون آیا کہ انہیں لیا آری چیف ہانے دیا گیا ہے۔ اس وقت جزل مشرف کو یہ احساس ہوا کہ انہیں ایئر مینس میں وزیراعظم ہاؤس کیوں بلایا جا رہا ہے۔

چوہدری ثار کے بقول فوج میں ہر آری جزل کی اپنی ایک لابی ہوتی ہے۔ اگر جزل کی لابی پہلے نہ ہو تو آری چیف بننے کے بعد خود کو دین جاتی ہے۔ تقدیر نے جزل مشرف کو آری چیف بنانا تھا لہذا یہ بحث اب بیکار ہے کہ ان کا نام نواز شریف کو کس نے دیا تھا۔

سے آری چیف کی تقرری کے وقت نواز شریف کے پاس تین جرنیلوں کے نام موجود تھے جن میں جزل علی قلی اور جزل پر وزیراعظم بھی تھے۔ تاہم، ثارٹ سسٹم کے بعد مقابلہ جزل علی قلی اور وزیراعظم میں تھا۔ نواز شریف علی قلی خان سے خوش نہیں تھے، غصہ سبب سے جزل کراست کے ساتھ ان کی ٹینشن شروع ہوئی تھی۔ جزل علی نے فوج کی کسی اندرونی میٹنگ میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جنہوں نے شریف کو پسند نہیں آئی تھیں۔ اس کے علاوہ جزل جہاگیر کراست بھی علی قلی خان کے حق میں تھے لہذا یہ بات بھی ان کے خلاف چلی گئی اور جزل مشرف کو آری چیف بنایا گیا۔

○○○

نواز شریف کو جزل پر وزیراعظم نہیں تھا کہ جزل پر وزیراعظم جہاگیر کراست نے

جزل شریف انہوں نے علی قلی خان کو نظر انداز کر کے آری چیف بنایا تھا اور ایک دن ان کے وقت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر نمودار ہو گا۔ کارگل کا آپریشن نواز شریف کے لیے ایک چمکی سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے جن دنوں بھارتی وزیراعظم واجپائی کو بلا اور بلایا ہوا تھا اس وقت ان کے اپنے آری چیف انہیں بتائے بلکہ کارگل پر اپنی فوجیں بڑھانے تھے۔ نواز شریف کو جزل مشرف کے اس خطبہ جان کا اس وقت پتہ چلا جب واجپائی نے ایک رات خود ٹیلی فون پر نواز شریف کو بتایا کہ ان کی آری بھارت کے ساتھ کارگل کے محاذ پر ہاتھ بٹک لاری ہے۔

جب نواز شریف کے نوٹس میں یہ بات آئی گئی اس وقت اگر وہ چاہتے بھی تو وہ کارگل کی اس جنگ کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ ہی اسے Reverse کر سکتے تھے۔ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور جزل مشرف کے اس ایڈ وچر کا نواز شریف کی حکومت پر بہت برا اثر پڑنے والا تھا۔

نواز شریف اور ان کی حکومت کو فوجی قیادت نے کارگل آپریشن کے بارے میں صرف اتنا کچھ بتایا جو ان کے خیال میں سیاسی قیادت کو بتانا چاہیے تھا۔ ساری بات اس وقت کھل کر سامنے آئی جب گورنر ہاؤس لاہور میں نواز شریف کو جزل پر وزیراعظم نے کارگل آپریشن پر بریفنگ دی جس میں اس وقت کے نیشنل چیف فسیج بخاری اور ایئر چیف پرویز مہدی بھی شامل تھے۔ جب جزل پر وزیراعظم نے اس آپریشن کی تفصیلات بتائیں تو اس میٹنگ کے باقی شرکاء کو تو چھوڑیں، وہاں بیٹھے فسیج بخاری اور پرویز مہدی بھی ہکا بکار ہو گئے۔ ان دونوں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا اور بولے کہ انہیں تو کبھی بھی اس آپریشن سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک کھلی جنگ کی صورت میں ان دونوں نے اپنی جوائنٹ دی اس سے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان دونوں کی باتوں سے سب کو یہ تاثر ملا کہ اگر بھارت نے کارگل کو بنیاد بنا کر پاکستان پر فضائی اور بحری راستوں سے حملہ کیا تو شاید صورتحال بہت خراب ہو جائے۔ اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے تمام شرکاء کو کھلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کارگل کی وجہ سے پاکستان ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔

میں نے چوہدری ثار سے پوچھا کہ جزل مشرف یہ دعویٰ کرتے آئے تھے کہ انہوں نے کارگل کا کیا آپریشن نواز شریف کی محکوری سے شروع کیا تھا۔ چوہدری ثار نے اور بولے کہ نواز شریف نے اس کی محکوری دی تھی تو کیا وہ اسے یہ قوف تھے کہ وہ ایک طرف کارگل کا آپریشن شروع کراتے اور وہ

ماہ کے اندر اندر واپسی کو لاہور بلا لیتے۔

گورنر ہاؤس لاہور میں ہونے والی اس میٹنگ کے بعد چوہدری ثار کو وزیراعظم نواز شریف نے فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر ان کے ساتھ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہ پاکستانی فوج کی عزت بچانے کا وقت ہے۔ نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب چوہدری ثار نے انہیں امریکہ جانے سے منع کیا اور کہا کہ میاں صاحب! جن لوگوں نے اپنے سولین لیڈروں کو اتحاد میں لیے بغیر کارگل کا ایڈوانچ شروع کیا ہے انہیں اب اس کے نتائج بھی بھگتنے دیں۔

نواز شریف نے تب یہ جواب دیا کہ چوہدری صاحب! انہیں میں اپنے ملک کی فوج کو بھارتی افواج کے سامنے ذلیل ہونے نہیں دیکھ سکتا۔

ثار نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جس طریقے سے نواز کے امریکہ جانے کی مخالفت کی تھی اس کے گوشتیہاں شریف خود ہیں۔

ثار نے اس موقع پر گہرا سانس لیا اور مجھے دیکھ کر بولے کہ بڑے انسوس کی بات ہے کہ جس فوج کو نواز شریف نے قتل آواز کیا تھا، اسی نے ہی انہیں ایک قلعے میں ڈال دیا۔

ثار مجھے بتاتے تھے کہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس سیاسی وزیراعظم نے فوج کے ساتھ اچھائی کی اسی فوج نے انہیں پتا تو چھائی پر چڑھایا پھر ایک قلعے میں قید کر ڈالا۔

ایسی بات میں حیران پیدا کرنے کے لیے ثار نے کہا کہ یہ بھنوسی تھے جو تو بڑا پاکستانی فوجی بھارتی قید سے واپس لے آئے تھے اور اسی آری نے انہیں پھانسی دی۔ ٹھیک ستائیس سال بعد اسی فوج نے لیکن کا نواز شریف کے ساتھ کیا۔ اپنی فوج کی عزت بچانے کے لیے نواز شریف اپنے اوپر تمام تر تنقید سہے۔ 4 جولائی 1999ء کو امریکی صدر بل کلنٹن سے ملے گئے۔ انہوں نے وہاں امریکی مخالفت کے ذریعے ہماری فوج کی عزت بچالی جو اس وقت بھارتی افواج کی وجہ سے نہایت خطرے میں تھی۔ ٹھیک تین ماہ بعد اسی فوج نے نواز شریف کو جھڑپوں کا وزیراعظم ہاؤس سے گرفتار کر لیا۔

نواز شریف اور جنرل مشرف میں بھی تنازعات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات میں اصل تیزی اس وقت آئی جب یہ خبریں سامنے آئے کہ جنرل مشرف کو کور کمانڈر ایلیٹ جنرل طارق پرویز کو نواز شریف سے ملاقات کرنے پر برطرف کرنے والے تھے۔

شیباز شریف، چوہدری ثار اور جنرل مشرف ڈنر پر اکٹھے ہوئے۔ جنرل مشرف نے انہیں بتایا کہ وہ جنرل طارق کو برطرف کرنے والے ہیں۔ ثار نے جنرل مشرف کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ان کے خیال میں جنرل طارق کے خلاف ایکشن لینا بہت ضروری ہے تو انہیں برطرف کرنے کے بجائے ان کا کہیں ٹرانسفر کر دیں۔ جنرل مشرف نے چوہدری ثار کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔

ثار نے شیباز شریف سے بھی کہا کہ وہ نواز شریف کو مت بتائیں کہ ان کی جنرل پرویز مشرف سے جنرل طارق کے معاملے پر کیا بات ہوئی تھی کیونکہ وزیراعظم پہلے ہی خاصے ناخوش تھے۔ تاہم، شیباز شریف کے پیٹ میں یہ بات نہ رہ سکی اور انہوں نے جاتے ہی نواز شریف کو یہ بات فوراً بتا دی کہ جنرل مشرف جنرل طارق پر پرویز کو ان سے ملاقات کرنے کے الزام میں کوئٹہ کے کور کمانڈر کی پوزیشن سے ٹرانسفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف کی سسرال میں ہونے والی کسی کی موت پر جنرل مشرف ان سے تعزیت کے لیے ان سے ملے گئے تو وزیراعظم نے جنرل طارق کا معاملہ ان کے سامنے اٹھالیا جس سے ان دونوں کے درمیان تلخ مزید بڑھ گئی۔ اگر ابھی بھی کوئی کمی رہ گئی تھی تو اخبار میں یہ خبر چھپ گئی کہ جنرل طارق کو وزیراعظم نواز شریف سے ملاقات کرنے پر جنرل مشرف نے برطرف کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر نواز شریف خاصے اشتعال میں آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر اس کی ایک وضاحت جاری کرے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ کور کمانڈر روپنڈی جنرل محمود نے یہ تجویز پیش کی کہ آئی ایس پی آر کے بجائے وزارت دفاع اپنی طرف سے ایک وضاحت جاری کر دے۔ تاہم، فیصلے سے بھرے نواز شریف نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اسی اثنا میں فوج میں یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ نواز شریف چار جرنیلوں کو کارگل آپریشن کے متعلق وزیراعظم کو بے خبر رکھنے کے الزام میں برطرف کرنا چاہتے ہیں جن میں جنرل محمود، جنرل عزیز، کور کمانڈر رانا درن اور یازد جنرل جاوید حسن اور ڈی جی ملٹری آپریشنز جنرل توقیر ضیاء شامل ہیں۔

ثار نے کہا کہ اس طرح کا تاثر فوج میں جان بوجھ کر پھیلایا گیا تھا تا کہ ایک سیاسی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لا لگایا جائے جیسا کہ جنرل ضیاء نے 1988ء میں جو نیو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اسی طرح کا بہانہ تراشا تھا کہ وزیراعظم جو نیو او جزی کیپ کے ذمہ دار جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

جنرل مشرف نے فوری طور پر چوہدری ثار اور شہباز شریف سے رابطہ کیا اور ان سے پوچھا کہ واقعی نواز شریف ان چار جرنیلوں کو برطرف کرنا چاہتے ہیں جس پر ان دونوں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مشرف کو رازدار کرنے کے لیے انہیں نواز شریف سے جبر میں جانک نہیں آف صاف کھل کا مہدہ بھی دیا گیا۔

اسی اثناء میں جنرل مشرف کے قریبی جرنیلوں نے نواز شریف کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ان کا بیان یہ تھا کہ اگر نواز شریف نے جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی تو وہ اس پرائیکشن لیس کے۔ ان جرنیلوں نے سیاسی حکومت کو ایک باقاعدہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ اگر جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی گئی تو وہ اس پر شدید رد عمل ظاہر کریں گے۔ نواز شریف کے گرد بیٹھے سازشیوں نے انہیں خبردار کیا کہ اگر انہوں نے جنرل مشرف کو برطرف نہیں کیا تو فوج انہیں برطرف کر دے گی۔ دونوں اطراف نے اپنے تئیں برطرفی سے بچنے کے لیے اپنے اپنے انداز میں اپنا رد عمل ظاہر کیا اور فتح ان کی ہوئی جن کے پاس ٹینک اور توپیں تھیں۔

میں نے ثار سے پوچھا کہ سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ جنرل مشرف چاہتے تھے کہ نواز شریف وزارت عظمیٰ کا مہدہ اپنے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو دے دیں کیونکہ وہ انہیں زیادہ بہتر لیزر سمجھتے تھے۔

میری بات سن کر چوہدری ثار مسکرائے اور بولے کہ دراصل شہباز شریف کو تھوڑی سی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اگر آپ نواز شریف کے اقتدار کے آخری دن یاد کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آری قیادت اس پر دہشت میں نہیں تھی کہ وہ نواز شریف کو کسی بات پر ڈکٹیشن دیتی۔ جنرل مشرف نے دراصل مذاق میں یہ بات کی تھی۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ جنرل مشرف، ثار اور شہباز اکٹھے لٹچ کر رہے تھے جب جنرل مشرف نے مذاق کے انداز میں شہباز شریف سے کہا کہ آپ پنجاب پر عسکرانی کرنے کی بجائے اسلام آباد کیوں نہیں آ جاتے۔ مشرف کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلام آباد آ کر ایک طرح سے فوجی پرانم فسطح کا سارا ل ادا کریں اور نواز شریف کو ان کے مسائل سلھانے میں ان کی مدد کریں۔

12 اکتوبر 1999ء کی شام چوہدری ثار علی ٹاکن وزیر اعظم ہاؤس میں موجود تھے جب

نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آری چیف مقرر کر دیا۔

اس سے پہلے یکم اکتوبر کو چوہدری ثار علی ٹاکن ولی ٹاکن سے ملنے کے لیے لندن گئے تھے تاکہ وہ انہیں دوبارہ حکومت میں واپس لائیں۔ وہ لندن میں دس دن رہے اور 10 اکتوبر کو پاکستان واپس لوٹے تھے۔ چوہدری ثار نے 11 اکتوبر کو نواز شریف سے ملنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ وطن گئے ہوئے تھے۔

12 اکتوبر والے دن شہباز شریف نے چوہدری ثار کو وزیر اعظم ہاؤس لٹچ پر بلایا۔ دونوں نے

وزیر اعظم ہاؤس میں شہباز شریف کے کمرے میں بیٹھ کر لٹچ کیا۔ ان دونوں کو بتایا گیا کہ وزیر اعظم ابھی ٹاکن سے واپس لوٹے ہیں اور کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ ثار اور شہباز نے وزیر اعظم کو پیغام بھجوایا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائیں تو انہیں بلا لیا جائے۔

اسی اثناء میں شہباز شریف سو گئے اور چوہدری ثار فی دی دیکھتے رہے۔ اچانک چوہدری ثار

نے پی ٹی وی پر جنرل مشرف کی برطرفی کی خبر سنی اور فوری طور پر شہباز شریف کو جگایا۔ شہباز شریف کو

یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کر دیا ہے۔ انہوں نے بڑے قہصے میں

چوہدری ثار سے کہا کہ وہ ابھی جا کر وزیر اعظم کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیں گے کیونکہ

اگر وہ اپنے سکے بھائی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو اس کے بعد وزیر اعلیٰ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں!

ثار نے بھرے ہوئے شہباز کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ ان کے لیے پہلے ہی بہت بڑے مسائل

کھڑے ہو گئے ہیں، وہ اب نئے مسائل نہ کھڑے کریں۔ چوہدری ثار وزیر اعظم ہاؤس سے نکلے اور

راولپنڈی میں واقع اپنے گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں شہباز شریف کا فون آیا کہ چند فوجی افسران

نے پی ٹی وی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ثار نے دوبارہ اپنی گاڑی نکالی اور

وزیر اعظم ہاؤس کی طرف دوڑا دی لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فوجی وزیر اعظم ہاؤس کو گھیرے میں

لے چکے تھے اور کسی نے انہیں اندر نہیں جانے دیا۔

چوہدری ثار کو سمجھ آ گئی کہ سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔

چوہدری ثار جب اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ فوجوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ پہلے 7
انہوں نے انہیں گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخر کار بجھنے کے بعد انہیں اندر جانے دیا گیا
اور دو سال تک اس گھر میں قید رہے۔

ایک رات انہیں اپنے کس کا شہید درد ہوا۔ وہ ساری رات 11 سے 12 بجے رہے لیکن فوجوں
نے انہیں علاج کے لیے باہر نہیں جانے دیا۔ صبح کے وقت گیس ہا کر ان کا آج بھل ہوا۔
چوہدری ثار علی خان کی زندگی کے سب سے مشکل ترین دن تھے۔ انہوں نے بھی سہا بھی
نہیں تھا کہ ایک دن پندرہ فی ان کے گھر کے گرد گھیرا دل کر انہیں اپنے ہی گھر میں قید کر لیں گے۔ یہ
فوجی ان کی اور ان کے بچوں کی واک کو چمک کرتے تھے۔

ایک دن ٹیپ اور ایف آئی اے کے دو آفسرز چوہدری ثار سے ملنے کے لیے گھر آئے۔ ان
دونوں نے ثار سے کہا کہ وہ نواز شریف کے خلاف ایک تحریری بیان دیں کہ انہوں نے ان سے رائج
کے لیے گیس کی منظوری لی تھی۔ ثار نے ان سے کاندھ بن لیا اور نواز شریف کے حق میں بیان لکھ کر دے
دیا۔

جنرل مشرف کو چوہدری ثار کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ جس دن مشرف نے رفیق تارڑ
کو ہٹا کر خود صدر بننے کا فیصلہ کیا، اس سے ایک دن پہلے غیر متوقع طور پر اس وقت کے ڈی جی آئی ایس
آئی جنرل محمود ان کے گھر پر تشریف لائے۔ جنرل محمود تین گھنٹے تک چوہدری ثار کے ساتھ رہے۔ وہ دو
گھنٹے پہاں منت تک بولتے رہے اور جنرل محمود سنتے رہے۔ ان تین گھنٹوں میں جنرل محمود صرف دس
منت کے لیے بول پائے۔

جو فوجی جنرل محمود چوہدری ثار سے ہاتھ ملا کر صوفے پر بیٹھے ثار نے ان کے بولنے سے پہلے
ہی ان پر تین باتیں بڑی واضح کر دیں۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ وہ نواز شریف کا ساتھ نہیں چھوڑیں
گے، پی ایم ایل کیو کو جان نہیں کریں گے اور جنرل مشرف کی حکومت کے حق میں کوئی بیان جاری نہیں
کریں گے۔

جنرل محمود نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ ٹھیک ہے کہ آپ نواز شریف کو نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں
لیکن نواز شریف کے بارے میں کیا خیال ہے جو انہیں چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں بدھ چلے گئے تھے۔

ثار نے جنرل محمود سے کہا کہ اگر آج انہوں نے نواز شریف سے بے وفائی کر کے اس قید سے
رہائی پا بھی لی تو وہ ساری عمر اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔
یہ بات سن کر جنرل محمود انہیں چلے گئے۔

فوجوں کے ہاتھوں اپنے گھر میں ہی دو سال تک قید رہنے کی وجہ سے چوہدری ثار کے بچوں پر
بڑا شدید برا الہامی اثر پڑا۔ اس برس وقت میں چوہدری ثار کے بچوں کو سب سے زیادہ دردناک سامنا
کرنا پڑا۔

جب چوہدری ثار اپنے گھر میں قید تھے تو جنرل مشرف نے انہیں اپنے ساتھ ملالے کی کوششیں
پہری رہیں۔ انہیں مختلف قسم کی آفرزدی جاتی رہیں۔ انہیں پی ایم ایل کیو کا صدر بنانے سے لے کر
دارالمعلم بنانے تک کی بھی پیشکش کی گئی۔

اسی اثناء میں پی ایم ایل نواز کے لیڈروں کی طرف سے چوہدری ثار علی خان پر الزام لگایا گیا تھا
جانے لگیں۔ سب کو اس بات کا پتہ تھا کہ جنرل مشرف کو آری چیف بنانے والے چوہدری ثار تھے لہذا
حکومت کی برطرفی کا ذمہ دار ایک لحاظ سے انہیں بھی ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ان دنوں کلثوم نواز اور تہیہ و تہ
نے جنرل مشرف کی حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بات مشہور ہونا شروع ہو گئی کہ
جنرل مشرف نے نواز شریف، شہباز شریف، خواجہ آصف، اسحاق ڈار اور پارٹی کے دیگر ٹاپ لیڈروں کو
تو جیلوں اور انک قلعے میں رکھا ہوا تھا جبکہ چوہدری ثار وہ واحد لیڈر تھے جنہیں گھر پر قید کیا گیا تھا۔ بہت
سارے سوالیہ نشانات چوہدری ثار علی خان کی نواز شریف اور پارٹی سے وفاداری پر اٹھائے جا رہے
تھے۔ اور تو اور، کلثوم نواز کی بھی یہی سوچ تھی کہ چوہدری ثار جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور
اس کے بدلے میں انہیں جیل کے بجائے گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں کلثوم نواز، نواز شریف
کے کانوں میں ڈال رہی تھیں جب وہ ان سے ملنے جیل جاتیں۔ اسی اثناء میں یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ
کئی نے رات کے اندھیرے میں چوہدری ثار کو باقاعدہ ڈرائیو تک کرتے ہوئے چکری کی طرف
جاتے ہوئے سونہرے پردے دیکھا تھا۔ ان تمام باتوں کا نواز شریف پر بڑا اثر ہو رہا تھا۔ استثنائی غیر محسوس
طریقے سے نواز شریف ان باتوں پر قائل ہونا شروع ہو گئے تھے کہ چوہدری ثار علی خان بھی جنرل
مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نواز شریف کا ان باتوں پر فوراً یقین کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ

جنرل شریف اور چوہدری نواز شریف نے ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔
انہیں آری شریف شریف کیا تھا۔

چوہدری نواز کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ انہیں پہلی دفعہ نواز شریف کا ان کی ذات پر شک کرنے کا اس وقت پتہ چلا جب ان کی قید ختم کی گئی۔ چوہدری نواز رہائی کے بعد سیدھے لندن چلے گئے۔ وہاں انہیں نواز شریف کا فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے رہائی کے بعد جہاں دیکر لوگوں کا دم لے کر شکر یہ ادا کیا وہاں انہوں نے ان کا نام کیوں نہیں لیا۔ اس پر چوہدری نواز نے انہیں جواب دیا کہ میں صاحب اچھے ان تمام لوگوں نے فون کر کے مبارکباد دی تھی۔ میں آپ کے فون کا انکار کرتا رہا لیکن آپ نے بھی فون کر کے مبارکباد نہیں دی تھی میں نے بھی آپ کا شکر یہ ادا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

چوہدری نواز اور نواز شریف کے درمیان پہلی فون پر ہونے والی اس مختصر گفتگو کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ آپ دونوں کے سیاسی اور ذاتی تعلقات جو 1985ء میں شروع ہوئے تھے، دو سترہ سال بعد آخر کار شکوک و شبہات کی نذر ہو گئے تھے۔ چوہدری نواز نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں گے۔ چوہدری نواز کے ساتھیوں نے اس پر بڑا شدید رد عمل ظاہر کیا۔ انہوں نے چوہدری نواز کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب نواز کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ وہ کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں کیونکہ وہ اپنے ہمیں مسلم لیگ نواز کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے تھے جس کی قیادت نے انہیں اس بات پر سہارے کی بجائے کہ انہوں نے پارٹی سے برے وقتوں میں نہ اری نہیں کی تھی، ان پر شک کیا تھا کہ وہ شاید جنرل شریف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ان کی کردار کشی کی گئی تھی۔

چوہدری نواز نے مجھے بتایا کہ اپنی سیاسی تاریخ کے اس اہم سرے پر میرے پاس دور استے تھے باتوں میں پی ایم ایل نواز کے ساتھ چہارہوں کا میٹنگ پارٹی کو جان کر لوں۔

انہوں نے بی بیخبر بہنو کی قریبی ساتھی آصفہ بیگم کی فیمل فرینڈ تھیں کے ذریعے میٹنگ پارٹی جانے کے لیے قیید بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

جب اس بات کا پتہ چلا کہ چوہدری نواز نے سیاست ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انہوں نے فوری طور پر چوہدری نواز کو اس سے روکا۔ اکتوبر 2002ء کے الیکشن سر پر تھے۔ شریف شریف نے چوہدری نواز کو اپنی پارٹی روٹی کا حوالہ دیکر اپنی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑنے پر راضی کر لیا۔

نواز شریف نے فون کر کے چوہدری نواز علی خان کو مدعو آنے کی دعوت دی۔ جب تین سال بعد نواز شریف اور چوہدری نواز کی ملاقات ہوئی تو نواز نے گدگدایا کہ جنرل شریف کی برطرفی سے پہلے ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر نواز شریف نے یہ جواب پیش کیا تھا کہ اگر وہ انہیں اور شہباز شریف کو یہ بات بتاتے تو شاید وہ انہیں جنرل شریف کو برطرف نہ کرنے دیتے اور وہ ہر قیمت پر جنرل کو کھر بیٹھا چاہتے تھے۔ چوہدری نواز نے نواز شریف سے یہ بھی شکایت کی کہ وہ ان تین سالوں میں اسے برے حالات سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی ان سے یا پارٹی سے بے وفائی نہیں کی لیکن اس کے باوجود بھی پارٹی کے لیڈران کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔

چوہدری نواز علی خان کا اشارہ کلثوم نواز کی طرف تھا جن سے کئی برسوں سے ان کی بول چال تک بند تھی اور آج تک ہے۔

○○○

جب میں چوہدری نواز علی خان سے 2003ء میں ان کے گھر پر ملا تھا، اس وقت پاکستان کا نیوکلیئر ایٹم ایک دفعہ پھر تنازعات میں گھر چکا تھا۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ 1991ء میں ایک دن اس وقت کے آری چیف چوہدری نواز سے ملے اور انہیں وزیر اعظم نواز شریف کے نام ایک بڑا خطیفہ پیغام دیا۔ جنرل اسلم کے بقول کہ اگر پاکستان ایک مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فراہم کرنے پر تیار ہو جائے وہ تو اس کے بدلے میں بارہ ارب ڈالر دینے کو تیار تھا۔

یہ سن کر چوہدری نواز علی خان جو اس وقت وزیر پٹرولیم کے علاوہ نواز شریف کے انکسٹ اسسٹ بھی تھے، ان کے چہروں سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ اس طرح کی

سودے ہادی پاکستان کے مفاد میں ہرگز نہیں ہے۔ جہرانی میں وہ بے چہرہ بنی ٹار نے جنرل سے پوچھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وزیراعظم کے نام کس طرح کی تجویز بھیج رہے ہیں اور پاکستان پر مسلم ملک کو نیوکلیر ٹیکنالوجی ایکسپورٹ کرنے کے الزامات کی بنا پر کس طرح کے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

آرمی چیف چوہدری ثار کی یہ بات سن کر پھر بھی اپنی بات پر ڈٹے رہے اور انہوں نے کہا کہ آپ ایک دفعہ وزیراعظم نواز شریف سے بات تو کریں۔ وہ اس ذیل کے ذریعے پاکستان کو بڑی آسانی سے بارہ ادب ڈال دلوں گے۔

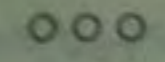
جب چوہدری ثار نے نواز شریف کو جنرل کی اس پیشکش کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گئے اور انہوں نے نہایت غرور سے لہجے میں اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ کہا کہ کس طرح آرمی چیف کسی بھی ملک کو نیوکلیر ٹیکنالوجی فروخت کرنے کی اس طرح کی احمقانہ تجویز اپنے دماغ میں لیے گھوم رہا ہے۔

یہ واقعہ سنا کر چوہدری ثار نے مجھے کہا کہ عمومی طور پر ہمارے یہ فوجی جرنیل سیاسی قیادت کو باطل سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ملک بچانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اب بھلا بتائیں کہ ایسے آرمی چیف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو محض امریکہ کو سبق سکھانے کے نام پر ایک اسلامی ملک کو بارہ ادب ڈالنے کا اوصاعہ اسلام فروخت کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

میں چوہدری ثار کی یہ بات سن کر یہ سوچنا اور مسکراتا ہوا ان کے گھر سے باہر آ گیا کہ جنرل اسلم بیگ پہلے آرمی چیف نہیں تھے جن کے ذہن میں اسے بڑے بڑے اعلیٰ حیالات پرورش ہمارے تھے۔ جنرل بیگ سے بلا کام تو جنرل مشرف نے کر دیا تھا جنہوں نے نہ صرف کارگل پر جنگ شروع کی بلکہ نواز شریف کے ایسے امریکہ اور میان میں اہل کربھارت کو ملنے کے لیے بھجوا دی کارگل کو استعمال کر کے وزیراعظم کو ہتھیاروں کا کاروبار سے اس ملک پر نو سال حکومت کی اور سب سے زیادہ انہوں نے چوہدری ثار کو استعمال کر کے اپنے آپ کو آرمی چیف بنایا تھا۔

یہاں تک کہ ان کے ہاتھ لگے تو ہاتھ لگ گئے اور ان کے ہاتھ لگنے کے بعد ان کے ہاتھ لگے ہیں

زیریں ہیں۔ آپ تصور کریں کہ اگر سیاسی طور پر چالاک اور سمجھدار یہ فوجی جرنیل ہمارے سیاستدان ہوتے اور مؤدب اور اوسط درجے کی ذہانت رکھتے والے یہ سیاستدان ان کے جگہ فوجی جنرل ہوتے تو شاید پاکستان آج ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا!



میراج چوہدری ثار ملی خان کے بارے میں تاثر بڑا اچھا تھا۔ تاہم، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ جیسے سیاسی رہنما کے شوقین بہت جلد ان لیڈروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کیا کچھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو فوجی چوہدری ثار نے قومی اسمبلی میں اپنے پر پرے پھیلا کر شروع کیے تو یہ وہ شخص نہیں تھے جن سے مل کر میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا۔ ان کی آواز اور رویے میں رعونت اور تکبر آچکا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ بھی ملائیں تو اس کے بعد دواش روم جا کر اپنے ہاتھ دھو دیتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر جنرل مشرف کے ایک وزیر کے سیکنڈل کے دستاویزی ثبوت دیے۔ وہ وزیر ان کے حلقے میں ان کا روایتی حریف تھا۔ خبر اچھی تھی لہذا میں نے فائل کر دی۔

کچھ دنوں بعد ان کا مجھے پھر فون آیا۔ وہ بڑے پریشان تھے۔ پکری کے قریب واقع ان کے گاؤں سے ملحقہ زمینوں کو فوجیوں نے ایکواڑ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ وہاں کوئی فوجی تعصیب بنانا چاہتے تھے۔ چوہدری ثار کی اپنی زمینیں بھی اس میں آ رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس پر ایک سنووری قلمبند کروں۔ انہوں نے مجھے کچھ کاغذات بھی دیے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے زیادہ

دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہر حال، میں نے میرٹ پر اپنے ایڈیٹر کو راضی کر لیا کہ ہمیں یہ خبر شائع کرنی چاہیے۔ اس کام میں دو تین دن لگ گئے۔ ایک شام مجھے چوہدری ثار کا بڑے لمبے میں فون آیا کہ میں نے اب تک وہ خبر کیوں نہیں فائل کی۔ میں ان کی فون سن کر بڑا حیران ہوا۔ وہ اپنا مظاہرہ کر رہے تھے جیسے "میرے پاس اہل اور میں کسی سرکاری مجھے کا ملازم۔ اس دن کے بعد میرے ان سے کبھی تعلقات ٹھیک نہیں رہے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملانے کا سوچا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سیاستدان صحافیوں کو محض استعمال کر رہے ہیں۔ اگر آپ ان کی مرضی کی خبر کرتے ہیں تو آپ سے ان کے اور دوست صحافی ہیں۔ اگر آپ اپنے وزیراعظم کو فائل کریں گے تو پھر یہ ایک لمحے میں اپنی آواز بٹا رہے ہیں۔ میں نے چوہدری ثار کے اس رویے سے بہت ہلکا ہلکا اور اس کے بعد میں

نے کسی سیاستدان کو اپنا دوست بھگنے کی حفاظت نہیں کی۔ چوہدری ثار سے رہی کسی امیدیں اس وقت ختم ہو گئیں جب ڈان ٹی وی کے رپورٹر اعجاز سید نے اپنے چینل پر یہ خبر ریک کی کہ چوہدری ثار اور شہباز شریف آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی سے اب تک چھ خطیہ ملاقاتیں کر چکے تھے۔ اس خبر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جیلوں میں مار کھانے کے باوجود بھی یہ سیاستدان فوج کے ساتھ مل کر اس ملک اور اس کی سیاست کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ جنرل مشرف کے دور میں ماضی سے سبق حاصل کرنے کے دعویدار ایک دفعہ پھر نئے آرمی چیف کے دروازے پر رات کو چوروں کی طرح دستک دے رہے تھے۔

جنرل علی قلی خان

جس دن میں نے چوہدری ثار علی خان کا انٹرویو کیا تھا اور انہوں نے جنرل علی قلی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس کے بعد مجھے یہ یقین تھا کہ اس سابق جنرل سے اب گفتگو کرنا شاید اتنا مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ ایک دن میں اسلام آباد میں واقع فرانسیسی سفارتخانے کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لیے گیا تو وہاں علی قلی کے بھائی رضا علی خان سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا وہ پشاور میں فرانسیسی کنسل خانے میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا سنہری موقع تھا کہ میں جنرل قلی کے بھائی کے ذریعے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش کروں کیونکہ ثار کے انٹرویو کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جنرل علی کے پاس بتانے کو بہت کچھ ہوگا۔

دو تین بعد آ کر میرا جنرل علی قلی سے رابطہ ہو گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا، انہوں نے چوہدری ثار کا انٹرویو پڑھ لیا تھا اور اب وہ مجھے گفتگو کرنے کا وقت دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ میں جنرل علی قلی سے ملنے کے لیے ان کے راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قریب واقع گھر میں گیا۔ جنرل قلی اس وقت گھر پر اکیلے تھے۔ انتہائی عزت و احترام اور شائستگی کے ساتھ وہ مجھے اندر لے گئے اور بتانے لگے کہ ساتھ والا گھر سابق آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کا ہے۔ جونہی انہوں نے جنرل کاکڑ کا نام لیا تو میرے اندر ایک رپورٹر کا لالچ پھر جاگ پڑا اور میں نے ان سے اسی وقت درخواست کر

ملی کہ جزل جزل کا کر کے دیکھ لے کر میرا شروع کر دے۔ میں ان کا دیکھتا ہوں گا۔ ابھی میں جزل
 ملی گئی ہے جزل کا کر کا شروع کرانے کی بات کر رہی ہوں کہ ایک بار میں نے جزل جزل گئی کے گھر آ
 گیا۔ جزل صاحب نے اس سے میرا تعارف کر دیا اور بتایا کہ یہ جزل وہی ہے کہ کر کے بیٹے ہیں۔ میں دل
 کی دل میں ہوا کہ میں اس شخص سے قسمت میرے حق میں تھی اور ہو سکتا ہے کہ بہت جلد کا کر
 صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے اور 1983ء کے پاکستانی سیاست کے انتہائی اہم سالوں پر سے یہ وہ
 انقلابا ہائے کہ بھائی کیسے انہوں نے نواد شریف اور قاضی صاحب کو گھر پہنچے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔
 تاہم، آئے والے دنوں میں میرا یہ خیال مضبوط ہوا کیونکہ جزل ملی گئی وہ ایک ریٹائرڈ زندگی گزار
 رہے تھے اور کسی صحافی سے ملنے کے لیے چاہتے تھے۔

میں نے ہاتھ ہاتھوں میں جزل ملی گئی کو تھوڑا سا دیکھا ہوں پایا۔ اپنے ساتھ اس ہونے والی
 انسانی پر وہ پانچ سال بعد بھی ملا تھا۔ باپ سے چنا اور بیٹے سے پوتے تک فوج میں جانے کی
 روایت ٹوٹ گئی تھی۔ ملی گئی کا بیٹا فوج میں چھ سال نوکری کرنے کے بعد کمپن کے طور پر ریٹائرڈ ہو کر گھر
 آ گیا تھا۔ میں جزل صاحب اور جزل ملی گئی کی روایت تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

ملی گئی نے مجھے جو پہلی بات بتائی وہ یہی تھی کہ انہیں سینئر مونس ہونے کے باوجود بھی آرمی
 چیف نہیں بنایا گیا تھا اور یہ ان کا حق تھا تھا۔ جب جزل ملی گئی نے یہ خبر سنی کہ جزل شرف کو چیف آف
 آرمی سٹاف بنایا گیا تھا تو انہوں نے اسی وقت خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ان کا باپ جزل صاحب یہ خبر
 سنے کے لیے زندہ نہیں تھا۔

جزل صاحب ایک پروفیشنل اور قابل جزل تھے۔ جزل صاحب اور جزل موسیٰ دونوں راج میٹ
 بھی تھے۔ جزل موسیٰ ایک ریسرچر تھے جبکہ اس کے برعکس جزل صاحب نے باقاعدہ انٹرین مٹری میں
 کمیشن کے ذریعے آرمی جوائن کی تھی۔ اگرچہ جزل موسیٰ اس وجہ سے ریسرچر تھے کہ ان کا پاس آؤٹ
 جزل صاحب سے پہلے ہوا تھا لیکن جہاں تک اہلیت اور فوجوں کا تعلق تھا ان کا جزل صاحب سے کوئی جوڑ
 نہیں تھا تھا۔ جزل صاحب کو دراصل ایک اوسط اور بے کے جزل کی ضرورت تھی اور جزل موسیٰ ان کی
 ذات کے لیے بہت موزوں تھے۔ میں 1959ء میں صرف 48 سال کی عمر میں جزل صاحب نے جزل
 صاحب کو ریٹائر کر دیا۔

جب جزل صاحب ایک افسر اور فوجی کے ساتھ ریٹائر ہو کر گھر آئے تو انہوں نے
 اپنے بیٹے ملی گئی کو دیکھا اور اسے کہا کہ جانا آرمی جوائن کر کہ تم نے ایک ان آرمی چیف بننا ہے۔

اپنے باپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ملی گئی تھوڑے سے جذباتی ہوئے اور ماضی میں
 کھمبے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ جب ان کی سب سے بڑی بیٹی سن زیب (جو 2003ء میں ایم ایف
 اے تھیں۔ وہ گورنمنٹ کی بڑی اور عوامی بھائی کی والدہ ہیں) ان سے ملنے کر اپنی نکاح تو وہ اپنے
 بیٹے ملی گئی کے فوج میں مستحق کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ وہ ستر پر پیر پڑے تھے لیکن
 وہ اپنے بیٹے کے فوج میں مستحق کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جزل صاحب نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ
 ان سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔ اپنے باپ کی یہ بات سن کر زیب نہایت سیریس ہو گئیں۔ وہ اپنے
 باپ کی طرف جھکیں تاکہ وہ سن سکیں کہ وہ ایسی کوئی خاص بات ان سے کرنا چاہتے تھے۔

جزل صاحب نے اپنی بیٹی کے کانوں میں سرگوشی کی اور بولے کہ زیب دیکھو تمہارا بھائی جزل
 ملی آج اپنی محنت اور قابلیت کی بنیاد پر اتنے بڑے عہدے پر پہنچا ہے۔ تمہارے شوہر گورنمنٹ بھائی کی
 سیاست اس کے آرمی چیف بننے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی چاہیے۔ تم لوگوں کی وجہ سے ملی گئی کے لیے
 کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بیٹی نے اپنے باپ کو حیران بھری نظروں سے دیکھا اور بولی کہ بابا آپ یہ کیسے سوچ سکتے
 ہیں کہ ایک سگی بہن اپنے میاں کی سیاست کی وجہ سے اپنے بھائی کو مسائل میں گھرتے دیکھ سکتی ہے۔
 زیب نے اپنے باپ کو تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔

جزل ملی اب اپنے باپ کی یادداشتوں میں کھوپکے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد جزل صاحب
 کی زندگی اتنی آسان نہیں رہی تھی۔ وہ نو جوان تھے۔ انہوں نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی
 ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آئی تو جزل صاحب پر کرپشن کے الزامات لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔
 اصل وجہ کچھ اور تھی۔

دراصل جزل صاحب اور جزل بیٹی خان ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ جزل بیٹی نے
 کسی دور میں جزل صاحب کے ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹی چاہتے تھے کہ جزل صاحب نیشنل
 پبلس ٹرسٹ کو چلائیں۔ شروع میں جب صاحب نے مزاحمت کی تو ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس کسی

اظہارِ ہمدردی کو چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تاہم، جنرل یحییٰ خٹک نے اپنے بیان سے یہ واضح کرتے ہوئے کہ جنرل
 حبیب اس ہمدردی کے مالی وسائل کو سنبھال نہیں سکتے۔ مشہور صحافی اور کالم نگار زید اے سلیمانی کو اس میں
 فی کرایہ پر مقرر کیا گیا۔ انہی دنوں پاکستان ہائپر میں ڈاکٹر علی ہمدرد کے خلاف ایک خبر بھی۔ اس خبر کا
 جنرل حبیب سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اظہار کے ایڈیٹر تو نہیں تھے۔ تاہم، ڈاکٹر علی ہمدرد اس خبر
 سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ بات دل میں رکھ لی۔ ان دنوں پاکستان میں نئے انکیشن
 اور ہے تھے۔ ایک ان ڈاکٹر علی ہمدرد اور اور مصطفیٰ کمر کے ساتھ جنرل حبیب سے ملنے آئے اور
 ان سے مالی پارٹی کے لیے ہمدرد کا کیونکر جنرل حبیب اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے۔

جزل علی قلی کے لوگوں پر ایک منکرانہت پھیلی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ دراصل ان کے والد کا حراج ایک فوجی کا تھا کہ ایک بزنس مین کا الہذا انہوں نے بہنو صاحب کو ان کی پارٹی کے لیے چند دسپنڈے سے انکار کر دیا۔ اسے اگر یہاں تک رہتی تو بھی معاملہ ٹھیک تھا۔ جزل حبیب نے بہنو صاحب کو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کہ وہ بالی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لہذا وہ اس پارٹی کو انتخابات جیتنے کے لیے اپنی ایب سے چند دسپنڈے سے بچے ہیں۔

بھول چلی کے بقول ان کے والد صاحب کو بھنو صاحب کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا۔ بھنو صاحب نے ان کے باپ کی اس بات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا اور جو بھی وہ لکھتے اور میں آئے بھول صاحب اگر تیار کر کے بری پڑاؤں میں لکھ دیا گیا۔ جو بھی بھول صاحب کی گرفتاری کی خبر پہنچی تو سب لوگوں نے بھنو صاحب کے اس فیصلے کی شدت و حدت کی اور صرف چار دن بعد بھول صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ اب اس وقت وہ اٹلی تھی۔ جو نقصان پہنچا تھا وہ لکھی چکا تھا۔ بھنو صاحب نے بھول صاحب کی تمام لکھنیاں نکال لی تھیں۔ اگرچہ بھول صاحب نے بھنو صاحب کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھایا اور انہیں دیکھیں لیکن انہوں نے کبھی بھنو صاحب کے خلاف ایک خط لکھا ہی نہیں کیا۔

اپنی گرفتاری اور اکلے واس کھانے کے بعد حجاز صوبہ میں ہزاروں بچے ملے۔ خدا کا کار
بہاں لگی۔ سر میں علامہ صاحب کو حجاز صوبہ کی ضرورت پڑ گئی۔ اعظم لنگ میں دونوں صوبہ سرحد کی
اسٹیبل میں بٹکر گئے۔ علامہ صاحب وہاں اپنے بڑی طاقتور کو بیکار اعلیٰ رکھا دیا۔ تھے اعظم لنگ نے
علامہ صاحب کی بات کو کہہ کر اسے جے اے اے کر دیا کہ وہ لنگا لنگا کیے من کا ساتھ دے لنگے چلا۔ صاحب کہ

میں نے جزل ملی تھی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جزل حبیب کو بھٹو کی پھانسی کی ٹیڑھی ملی تو ان کا اس پر کیا رد عمل تھا؟

جزل ملی نے کہا کہ اب تو اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کو چھانسی دینے کا فیصلہ بہت لگایا تھا۔ جزل ضیاء کو انہیں چھانسی نہیں دینا چاہیے تھی۔ جزل قلی کے خیال میں یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت تھی کہ جزل ضیاء اور بھٹو صاحب کے درمیان معاملات اتنی دور تک چلے گئے تھے جہاں ان میں سے صرف ایک ہی زبردور ہو سکتا تھا۔ تاہم، جزل قلی کے خیال میں جزل ضیاء نے بھٹو کو چھانسی دیکر بہت بڑی لاپٹی کی تھی۔

میں نے جزل علی قلی کو اپنے باپ کے ساتھ جزی ماضی کی یادوں سے نکالنے کی خاطر ٹاپک پیسج کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان آرمی میں کیسے آئے تھے؟

جزل علی قلی نے کہا کہ اس میں کوئی اتنی بڑی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک فوجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ شروع سے ہی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے 29 اپریل 1971ء میں کمیشن لیا اور اپنی اچھی پرفارمنس کی وجہ سے انڈین لندن کے Sandhurst School بھیجا گیا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں بھی جزل علی قلی نے انتہائی قابلیت کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہترین غیر ملکی کپٹن کا اعزاز دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ اعزاز ملتا ہے۔ جزل مشرف اور علی قلی جج میٹ تھے۔ علی قلی خان نے اپنے کورس میں ٹاپ کیا جبکہ جزل مشرف کی گیارہویں پوزیشن تھی۔ ان کے ایک اور جج میٹ شجر شریف تھے۔ وہ بھی ایک شاعر اور ری آفیسر تھے جو بعد میں قطر میں شہید ہو گئے۔ تیسرے اہم جج میٹ کرنل افضل تھے جو اس وقت (2003ء) پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین تھے۔ یونیٹ جزل خالد احمد شجر جزل راجہ اور سابق ای سی آئی ایس آئی رانا نسیم بھی ان کے کورس میٹ تھے۔

میں یہ بھی کہ جب 1998ء میں ایک نئے آرہی چیف کی تقرری کا سوال اٹھا تو اس وقت سینیائی اسٹیمپ اور سرگرمی تھے۔ ان کے بعد جنرل خالد لوانہ، جنرل یو جی مشرف اور جنرل حسین رانا

تھے۔ جنرل ضیاء الدین بن بٹ ان سے جو نیکر تھے اور گہرست میں پانچویں نمبر پر تھے۔

جنرل قلی مجھے بتاتے گئے کہ فوج میں سبھر کر قل، بریگیڈیئر اور سبھر جنرل کی ترقی ایک سلیکشن پاس کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جنرل جہانگیر کرامت نے جو اس وقت آرمی چیف تھے، چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کرنی تھی تو جنرل قلی کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک ان کے سچ میٹ جنرل زیدی پہلے ہی ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اب اس پوسٹ کے لیے مقابلہ جنرل قلی، جنرل خالد نواز اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان تھا جو تینوں سچ میٹ تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت نے قلی کی پروفیشنل قابلیت اور اہلیت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں جنرل پرویز مشرف اور جنرل خالد نواز پر فوقیت دی۔ جنرل نسیم رانا کی ترقی ان سے کچھ دن بعد ہوئی تھی لہذا وہ اس دوڑ سے نکل چکے تھے۔ چند دنوں بعد اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار علی خان (چوہدری غار علی خان کے بڑے بھائی) ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ جنرل قلی اس وقت راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے۔ اپنی پدموشن پر جنرل جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کرنے وہ ان سے ملنے گئے تو جنرل کرامت نے انہیں کہا کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنا کر انہوں نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک حقدار کو صرف اس کا حق دیا تھا۔

جنرل جہانگیر کرامت سے ملنے کے بعد قلی خان اپنے قریبی دوست جنرل افتخار علی خان جن کی جگہ اب ان کی تعیناتی ہوئی تھی سے ملنے کے لیے گئے تاکہ وہ ان کا بھی شکریہ ادا کریں۔ وہ جنرل افتخار کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جنرل قلی جنرل افتخار کو اپنا ذاتی دوست سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا دوست ان کی ترقی پر خوش نہیں ہوگا۔ جنرل افتخار کا یہ رویہ دیکھ کر جنرل قلی کو بڑا صدمہ ہوا۔ جنرل قلی کو اس وقت یہ احساس ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ اگر جنرل افتخار جیسا بہانا دوست بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش نہیں آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ معاملات درست نہیں ہیں۔ جنرل قلی قلی اور جنرل افتخار کی دوستی دوسلوں سے پہلی آ رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے والدین آرمی کے دفینوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

جب جنرل قلی جنرل افتخار کے دفتر میں داخل ہوئے تو جنرل افتخار نے کہا کہ ہاں مجھے تمہاری چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر تعیناتی کی خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔ جنرل افتخار نے

انتہائی بے سروتی سے کہا کہ میں نے تین ہفتے بعد یہ کرسی چھوڑنی ہے۔ تم صرف اس وقت ہی آ کر میری اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔

جنرل قلی کو ایک شدید دھچکا لگا کیونکہ وہ تو اپنے اس دوست کے پاس Courtesy call کرنے گئے تھے۔ انہیں بھی پتہ تھا کہ انہوں نے چیف آف جنرل سٹاف کی کرسی پر تین ہفتے بعد بیٹھنا ہے۔

جنرل قلی قلی خان کو جنرل افتخار علی خان کے اس سرد رویے کا معاملہ فوراً سمجھ میں آ گیا جب انہوں نے جنرل افتخار کے دفتر کی کھڑکی سے باہر جنرل پرویز مشرف کو ملتے پھرتے دیکھا۔ جنرل قلی بڑے حیران ہوئے کہ جنرل مشرف جو اس وقت منگلا کے کور کمانڈر تھے وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟ جنرل قلی نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور جنرل افتخار سے کہا کہ آپ جنرل پرویز مشرف کو اندر بلا لیں اور تینوں بیٹھ کر گپ شپ کریں۔

جب جنرل پرویز مشرف کمرے میں داخل ہوئے تو جنرل قلی بڑے گرم جوش انداز سے آگے بڑھ کر جنرل پرویز مشرف سے ملنے لگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ جنرل مشرف کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ جنرل مشرف یہ توقع کر رہے تھے کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنایا جائے گا۔

جب جنرل جہانگیر کرامت کو غیر معمولی طور پر یہ پتہ چلا کہ جنرل پرویز مشرف چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار کے پاس اس دن دفتر میں موجود تھے تو انہوں نے جنرل افتخار کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ جنرل صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ مشرف آپ کے دفتر میں کیا کر رہے تھے؟ آپ نے انہیں بلایا تھا یا پھر وہ چھٹی لے کر آپ سے ملنے آئے تھے۔ جہانگیر کرامت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنرل افتخار سے پوچھا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کور کمانڈر منگلا جنرل مشرف کو اپنے دفتر میں کیوں بلایا تھا؟

جنرل افتخار نے جہانگیر کرامت کو بتایا کہ دراصل جنرل مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر غامض ڈسٹرب تھے۔

یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی جنرل قلی سمجھ رہے تھے۔
گھڑی پکنا شروع ہو چکی تھی۔

کچھ دن بعد جنرل جہانگیر کرامت کا یہ چلا کہ جنرل محمود نے جنرل یونس شریف کے ساتھ
 شریف ایک خط لکھا جس میں لکھا ہے۔ جنرل کرامت نے جنرل محمود کو یہ خط دیا جس کی محتہ سرور میں لکھا کہ جہانگیر
 جب جنرل یونس کے پاس گئے انہوں نے جنرل شریف کو خط دیا ہے۔ ایک جو جنرل محمود کو
 جنرل جہانگیر کرامت نے دی تھا کہ وہ اسے لے کر جہانگیر کے پاس پہنچا کر کہہ دے کہ یہ خط ان کے معاملات
 میں دخل دے گا۔

جنرل جہانگیر کرامت کی ذات میں کہ جنرل محمود سے تھیں ہوئے اور وہ نے کہ دراصل وہ اور
 جنرل شریف ایک ہی شخص سے تھے جس سے وہ ان دونوں شریف چیف آف جنرل سٹاف نے اپنے پر
 عام سے اسٹریٹ میں اپنے ان کی دلجوئی کرنا چاہا ہے۔

تاہم جہانگیر کرامت نے اسے واضح نظموں میں جنرل محمود کو بتایا کہ آج کے بعد تم اس طرح
 کے کسی کام میں ملوث نہیں ہو گے کیونکہ اس سے شہری کے کرائم سسٹم میں شدید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔
 اس واقعے کے ایک دن بعد جنرل جہانگیر کرامت نے ٹین کور کا دورہ کرنا تھا جہاں انہیں ایک
 بدھنگ دی جانی تھی۔ جب جنرل جہانگیر کرامت آئے تو بدھنگ روم میں جانے کے بجائے انہوں
 نے جنرل قلی سے کہا کہ وہ انہیں اپنے دفتر لے کر ملیں۔ وہ ابھی دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ اس وقت کے
 جنرل رانا نسیم جو ڈی جی آئی ایس آئی تھے، وہ اپنی بغل میں ایک فائل لیے آئے اور جنرل جہانگیر
 کرامت سے کہا کہ یہ فائل کھینچ لو گئی ہے۔

علی قلی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہیں پتہ چلا کہ دراصل اس وقت کے
 وزیراعظم نواز شریف نے جنرل علی قلی کے چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کے احکامات روک لیے
 تھے۔ جب جنرل جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے احکامات پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو انہوں
 نے ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم کو نواز شریف کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجا تھا کہ وہ فوری طور پر اس فائل
 کو کھینچ کر لیں۔ ان دنوں نواز شریف کے پاس وزارت دفاع کا مہمہ بھی تھا۔

بعد میں بات کچھ یوں نکلی کہ جنرل افتخار چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر اپنی مدت ملازمت
 میں توسیع پا رہے تھے۔ ان کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کا کیس جنرل جہانگیر کرامت کو بھی بھیجا
 گیا تھا۔ ایک عام فوجی کے برعکس جہانگیر کرامت ایک سٹاف مین تھے۔ جنرل کرامت نے نواز شریف

کچھ دنوں میں انہوں نے جنرل افتخار کو ان کی ملازمت میں توسیع دی تو یہ ان کے جوش کے ساتھ ہی تھی
 یہ کی جان کی مدت ملازمت کے بعد اپنی مدت ملازمت کا انتہا کر رہے تھے۔ نواز شریف کو بتایا گیا کہ اگر
 جنرل افتخار کی خواہش کا احترام کیا گیا تو کم از کم کیا کتنی فوج کے دل سے ہلکا ہو سکتا ہے جہانگیر
 جنرل جنرل قلی اور جنرل پرہیز شریف کو بغیر یہ سوچیں لے کر جاتا ہے کہ۔ یوں جنرل جہانگیر
 کرامت نے جنرل افتخار کو ملازمت میں توسیع دینے سے انکار کر دیا۔ جب یہ بددی نگار علی خان اور
 جنرل افتخار علی خان کو اس بات کا علم ہوا تو ان دونوں نے اپنے دل میں یہ بات بٹھائی کہ دراصل یہ
 جنرل قلی ہی تھے جنہوں نے جہانگیر کرامت پر اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے انہیں مدت ملازمت میں
 توسیع نہیں لینے دی۔

جنرل قلی مجھے بتانے گئے کہ اگر چہ ان کی بدھوشن سے جنرل افتخار، چوہدری غار اور جنرل شریف کو
 تکلیف ہوئی تھی لیکن میرٹ کی بنیاد پر یہ ترقی دی گئی تھی کیونکہ وہ سینیارٹی لسٹ پر نہیں تھے۔
 میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر نواز شریف اور جہانگیر کرامت کے درمیان وہ کون سے
 اختلافات تھے جن کی وجہ سے آخر چیف آف آرمی سٹاف کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا تھا۔
 جنرل قلی نے آخر اس راز سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان معاملات اس وقت بگڑ گئے جب چیف آف
 آرمی سٹاف نے نیول وینس کالج لاہور میں اپنے خطاب میں نیشنل سیکورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش
 کی۔ جنرل قلی اس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ آئی ایس پی آر برادر است ان کے ماتحت تھا۔
 ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر سلیم اللہ نے جنرل قلی کو چیف کی تقریر کے متن کے بارے میں بتایا۔ تاہم
 علی قلی اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ اس تنازعہ تقریر پر کوئی بات کرتے کیونکہ اس وقت وہ
 وہاں موقع پر موجود نہیں تھے۔

اگلے دن جنرل جہانگیر کرامت علی قلی کو اعتماد میں لیے بغیر نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔
 انہدات میں پہلے ہی وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کے درمیان اس تقریر کے بعد بڑھتے
 ہوئے اختلافات کی خبریں چھپ چکی تھیں۔ نواز شریف سے ملنے کے بعد جب جنرل جہانگیر کرامت
 نے آگیا کیواپس آئے تو جنرل علی قلی چیف آف جنرل سٹاف کی حیثیت سے ان سے ملنے کے لیے آرمی

بدی گئے۔ جب جنرل قلی نے نواد شریف سے ہونے والی اس مشق کے بارے میں پوچھا تو
جہانگیر کرامت نے انہیں بتایا کہ یہ طاقت نواد شریف محل میں نہیں ہوئی تھی۔ علی قلی نے جب اپنے بیٹے
کا کھانا منور کیا تو انہوں نے کشتی کا سامان بدل دیا۔

جنرل کرامت نے نواد شریف کے ساتھ ہونے والی اس اہم طاقت کی تصدیقات جنرل قلی کو
نہیں بتائی۔ جہانگیر کرامت نے صرف اتنا لکھ لکھا کہ نواد شریف ان سے یہ تقریر کرنے پر شہید
ہوا تھا۔ جنرل قلی نے اس واقعہ پر جب میں جہانگیر کرامت کو علی دینے کی کوشش کی۔ وہ نواد شریف
سے ملنے کے بعد غائب ہو گیا تھا۔ قلی نے کہا کہ انہیں گھر لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو تین دن میں
ملاقات ہو جائے گی۔

جنرل جہانگیر کرامت نے کسی بھی مرحلے پر جنرل قلی کو نہیں بتایا کہ وہ ہوا میں آ کر پہلے ہی
آری چیف کے ہمد سے استعفیٰ دے چکے ہیں۔

جنرل قلی سے ملنے کے بعد جہانگیر کرامت اس دن اپنے دفتر سے جلدی نکلے اور گھر چلے گئے۔
اسی دن میں چار بیگ کے قریب جنرل قلی کو جنرل جہانگیر کرامت کے گھر سے فون کال آئی۔
انہیں بتایا گیا کہ چیف آف آری ٹاف ان سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ڈی جی آئی
انہیں بتائی کہ انہیں پہلے سے ہی جنرل جہانگیر کرامت کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جو نئی گفتگو شروع
ہوئی تو جنرل جہانگیر کرامت نے علی قلی کو جواب دیا کہ:

"All it was never like that as I told you earlier."

ایک دفعہ جہانگیر کرامت نے یہ کھٹک کھٹک کہا کہ نواد شریف ان کے ساتھیوں
کے ساتھ جھگڑا کرنے کے استعفیٰ کی بات کی ہوئی تھی۔

"اے قلی! میں نے یہ بات تو انہیں بتائی تھی کہ انہیں جہانگیر کرامت صاحب آپ ان بات
میں سے کچھ نہیں سمجھ سکتے تھے۔"

"General JK. Do not even think of it. If you do, many people will be that you will never see I again."

جی جی کرامت نے یہ بات تو انہیں بتائی تھی کہ انہیں جہانگیر کرامت نے ان کی بات کو پسند نہ کیا

کہ وہ پہلے ہی استعفیٰ دے چکے ہیں، اور ڈی جی آئی انہیں آئی رائٹ انم اس وقت ان سے وہ استعفیٰ دے کر
نواد شریف کو پہنچانے کے لیے وہاں موجود ہیں کہ نواد شریف کا حکم صاحب برقی ہے جس سے اس بار قلی
استعفیٰ کا انکار کر رہے ہیں۔

جنرل قلی اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے رات کو پانی پی کر ٹیبلٹ کا خیر نامہ لے رہے تھے
جب یہ اعلان ہوا کہ جنرل جہانگیر کرامت نے استعفیٰ دے دیا ہے۔

اس واقعہ کے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی جنرل قلی کو اس بات کا کچھ تھا کہ جنرل جہانگیر
کرامت نے اسے اہم ایڈیٹر پر انہیں اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ ان کا استعفیٰ دینا صرف ان کا ذاتی فعل نہیں تھا
کیونکہ اس کے ساتھ جنرل قلی کا اپنا مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا تھا۔ خیروں میں یہ بھی بتایا گیا کہ جنرل قلی
کو ان کے یاد کر کے جنرل پرویز مشرف کو چیف آف آری ٹاف لگا دیا گیا ہے۔

آج کا دن اور آج کی رات جنرل قلی کی زندگی کی سب سے زیادہ مایوس کن اور طویل رات
تھی۔ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو ٹھیک 39 سال قبل ان کے والد جنرل صہب کے ساتھ جنرل
ابوب نے کیا تھا۔ تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ ٹھیک 39 سال بعد بیٹے کے ساتھ بھی
وہی کچھ ہوا تھا جو باپ کے ساتھ ہوا تھا۔

اس کے بعد جنرل جہانگیر کرامت جنرل قلی اور جنرل خالد نواد سے ملے۔ وہ دونوں جنرل
مشرف سے ملے تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا:

"Gentlemen, I am sorry."

جنرل قلی اور خالد نواد خاموش رہے کیونکہ ان دونوں کو پتہ تھا کہ اب ان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا
ہے اب محض تین لفظ بولنے سے ان کی زندگیوں میں کوئی فرق نہیں چلے گا۔

اپنے ساتھ ہونے والی اس تاریخی بات کو انہیں بھڑک کر کہتے ہوئے علی قلی کو پھر کے لیے خاموش
ہونے تو میں نے ان سے پوچھا کہ نواد شریف نے انہیں اس لیے آری چیف نہیں دیا تھا کہ جنرل
جہانگیر کرامت کے جب جہانگیر کرامت نے یہ حکم سن لیا کہ انہیں آری چیف نہیں دیا جائے گا۔ انہیں نے قلی کو اپنے استعفیٰ
کے بارے میں بتایا تو انہوں نے نواد شریف کے بارے میں کچھ نہ لکھ لکھا تھا۔

انہوں نے اس بات کو جی جی سے بھلا دیا اور بولے کہ یہ بات غلط تھی۔

بتایا تھا۔

جنرل قلی نے ایک اور نئی کہانی سنائی۔

جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ دینے سے کچھ عرصہ پہلے ہی یہ باتیں شروع ہو گئی تھیں کہ ان کے بعد لیا آرمی چیف کون ہوگا۔ ایک دن جنرل علی قلی کی حیرانی کی حد نہ رہی جب نواز شریف کے ایک بڑے قریبی معتمد خاص نے ان سے رابطہ کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ ان کی نواز شریف سے ایک خطیہ ملاقات کرانا چاہتے ہیں تاکہ کل کو وہ آرمی چیف کی تقرری کے وقت زیر غور لائے جاسکیں۔ علی قلی کو یہ بتایا گیا کہ اگر وہ نواز شریف سے خطیہ ملاقات کے لیے راضی ہو جائیں تو پھر انہیں ایک عام سی کار میں بٹھا کر سادہ کپڑوں میں پرالم سٹر ہاؤس لے جایا جائے گا۔ علی قلی کو تسلی دینے کے لیے یہ بھی بتایا گیا کہ ان سے پہلے جنرل آصف نواز کی بھی اسی طرح خطیہ ملاقات کرائی گئی تھی اور انہیں بھی سادہ کپڑے پہنا کر ایک عام سی گاڑی میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ نواز شریف کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد جنرل آصف نواز کو آرمی چیف بنانے کی بحیرئیں دے دی گئی تھی۔ جنرل علی قلی کو بتایا گیا کہ یہ بات ان کے اپنے فائدے میں ہے اور انہیں جہانگیر کرامت کے بعد آرمی چیف بنایا جاسکتا ہے۔

اس پیغام کے کچھ دن بعد ایک اور بڑے سرکاری افسر جو نواز شریف کے قریب تھے، نے ایک دفعہ پھر علی قلی سے رابطہ کیا اور نواز شریف سے ملانے کی پیشکش کی۔ اس بڑے سرکاری افسر نے جنرل علی قلی کو بتایا کہ وہ ذاتی طور پر انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنوانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وہ پہلے ان کی نواز شریف سے خطیہ ملاقات کرائیں گے اور پھر انہیں آرمی چیف بنانے کا کیس تیار کر کے پیش کریں گے۔

لیکن نواز شریف کپ کی توقعات کے برعکس جنرل قلی نے سادہ کپڑے پہن کر نواز شریف سے خطیہ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل قلی نے انہیں بتایا کہ وہ آرمی چیف بننے کے لیے اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ انہوں نے پیغام رساں کو کہا کہ خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے اور اگر ان کی قسمت میں آرمی چیف بننا ہوا تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر خدا انہیں آرمی چیف نہیں بنانا چاہتا تو پھر نواز شریف سے خطیہ ملاقاتیں کر کے بھی وہ آرمی چیف نہیں بنائے جاسکتے۔

پھر جنرل قلی سے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نواز شریف نے جنرل شرف کو آرمی

چیف بنانے سے پہلے ان سے بھی خطیہ ملاقاتیں کی ہوں گی۔ جنرل قلی نے میرے اس سوال کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ وہ اس طرح کی خطیہ ملاقاتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔

میں نے کہا لیکن جنرل صاحب اسٹن رشید نے تو اپنے انٹرویو میں مجھے بتایا تھا کہ جنرل قلی کو آرمی چیف نہ بنانے کی وجہ ان کے برادر ان لاگو ہر ایوب تھے جو اس وقت نواز شریف کی حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ جنرل قلی نے اس بات سے اتفاق کیا۔ قلی نے مجھے کہا کہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ گوہر ایوب خان انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گوہر ایوب خان نے کبھی بھی انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے نہ تو لابی کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اس پر بات چیت کی تھی۔ قلی کے بقول نواز شریف گوہر ایوب خان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ جنرل قلی نے بھی کبھی گوہر ایوب خان سے یہ بات نہیں کی تھی کہ وہ انہیں آرمی چیف نہ بنائیں۔ قلی کے بقول اگرچہ وہ اپنی پوزیشن بحال کرنے کے لیے ساری باتیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ خاموش رہیں گے کیونکہ ان کی نگلی لیکن گوہر ایوب کی بیوی ہے اور وہ انہیں چاہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو۔

قلی نے کہا کہ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گوہر ایوب خان شاید میرے لیے لائیگ کر رہے تھے۔ وہ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے والد جنرل حبیب خان کو آرمی چیف نہ بنانے والے جنرل ایوب خان اسی گوہر ایوب کے ہی والد تھے۔ قلی نے کہا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

جنرل قلی نے اس بات کو دہرایا کہ دراصل نواز شریف کو آرمی ہاؤس میں ان کی جہانگیر کرامت کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں جان بوجھ کر غلط خبریں دی گئی تھیں۔ علی قلی نے اس بات کو مسترد کیا کہ جب جنرل وحید کا کڑ نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان سے ملاقات کی تھی جس کے بعد انہوں نے استعفیٰ دے دیے تھے تو شاید وہ اس میٹنگ میں موجود تھے۔ قلی نے کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت وہ ڈی جی ایم آئی تھے اور انہوں نے نواز شریف کو دھمکی دے کر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا۔ جنرل قلی کے بقول یہ بات غلط تھی۔ وہ نہ تو اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے نواز شریف کو کوئی دھمکی دی تھی۔ جنرل کا کڑ کے ساتھ اس وقت جنرل جاوید اشرف گئے تھے۔ جنرل قلی نے کہا کہ نواز شریف کو ہر وقت ان کے قریبی لوگ پٹھانوں سے ڈراتے بھی رہتے تھے اور ایک پروپیگنڈہ جاری رہتا کہ پٹھان اچھے لوگ نہیں ہیں اور ان سے ڈریں کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر سب سے بڑا کہ

[illegible]

جزل قلی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جزل شرف کو فنان کر کے مبرا کیا ہوگی۔ جزل قلی نے اگلے دن ہی انکا کیو جہا تھا جس انہوں نے جزل شرف کو بتایا کہ شاید وہ کل وہاں نہ آئیں کیونکہ انہوں نے خود ریف اٹھ جان کے بیٹے اور بیٹی کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ اس شادی میں بہت سے لوگ شریک تھے اور منجائے الہدات میں جزل شرف کے آدمی صرف بیٹے کی خبر شائع ہو چکی تھی۔ سب لوگ جزل قلی سے ایک ہی بات پوچھ رہے تھے کہ اب ان کا ری ایکشن کیا ہوگا۔ جزل قلی نے سب کو ایک ہی جواب دیا تھا کہ ان کا اس پر کوئی رد عمل نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ وہ راولپنڈی واپس جا کر اپنا جوار ۲۲ مارویں گے۔ جزل قلی نے اسی رات اپنا مشغلی ٹائپ کیا اور وہ اس وقت کے وائس چیف آف آرمی ٹائف جزل ہوسٹ کو بھیج دیا جو فی انکا کیو میں مٹری سیکرٹری تھے۔

اس دن کے بعد حلال تھی مگر لی ایچ کیو نہیں گئے۔

کیا جہول مشرف نے آدمی چھپ گئے کے بعد ان سے کبھی رابطہ کیا؟

”نہیں؟“ علی قلی نے ایک مختصر سا جواب دیا۔

تاہم، کچھ مشنرز کہ دوستوں کے فکشن میں آتے جاتے ایک دوسرے سے اتار چڑھا لیتے ہیں:

"Hello PM, how are you?" یا پھر پرامیٹ سے پوچھ لیتے ہیں:

"Hello Ali, how are you doing?"

اس سے لایا اور ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔

تاہم، جس رات جنرل پرویز مشرف کو آری چیف ہانے کا اعلان کیا گیا جنرل افتخار نے ان

کے گھر ٹیلی فون کیا ہو رہا ہے

"All, do not do any thing (resign) now. I am trying something for you."

جزال انکار نہیں اور اصل جہز میں جو ایک آف سٹاف عوام پائے تھے۔

قی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے عزول افکار سے کہا

"Leave it General. If the man (Nawaz Sharif) could not see me as Army Chief then how could he see me as Chairman Joint chiefs of Staff committee."

تھوڑی دیر بعد جنرل انکار نے علی قلی کو دوبارہ قہقہے کیا اور کہا کہ تمہارا دستِ درمست تھا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بے حد غصہ ہو گیا۔

ہاں، منزل طوقی کا 37 سالوں پر محیط فنی کیریئر اس رات اپنے اختتام کو پہنچا۔

ملی قی نے مجھے نواز شریف کے سکل ڈرائنگ کو ایسے کے اعزہ و کواہوں پر جس میں انہوں نے
پی ایس سی کی بھی کر انہوں نے جرنل قی کو آرمی چیف سے کمر قسطی کی تھی۔ نواز شریف کے اہلکار میں
انہیں سب سے بہتر آرمی جرنل (جرنل ملی قی) کو آرمی چیف سے ملنا پڑے تھا کہ کسی ایسے جرنل (جرنل
شرف) کو جو سینئر آرمی افس میں تیسرے نمبر پر تھے۔

حق نے کیا کہ دراصل چوہدری شام علی خان اور جنرل افتخار علی خان نے نواز شریف کو انہیں
آرمی چیف نہیں بنانے دیا تھا۔

بجز لقی چو بدری نثار اور افکار سے خامے ہاں تھے۔ قحی نے بتایا کہ وہ ان دونوں بھائیوں سے

اس طرح کے سلوک کی توقع نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان دونوں کے خاندانی تعلقات وہ نسلوں سے پہلے آ

رہے تھے۔ ان سے پہلے ان دونوں کے والد انٹرن آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

میں نے جنرل قلی سے کہا کہ یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی

حاکم اور سولہویں عہد و نہیں لیا جیسے آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر دوسرا فوجی یہی کچھ کرتا ہے۔ قلعی نے کہا

کہ انہوں نے اس طرح کے عہدوں کے لیے کبھی بھیک نہیں مانگی۔ دوسرے ذکرِ اچھی میں ان کا اپنا ردِ نفس

تو جس کی دیکھ بھال انہوں نے کرنی تھی۔

میں نے علی قلی سے پوچھا کہ ان کے خیال میں جنرل مشرف اور نواز شریف کے درمیان کوئی

ایسی بات ہوئی تھی جس سے ان میں ٹکراؤ ہوا تھا۔ قلی نے بتایا کہ وہ اصل کارگل آپریشن کے بعد معاملات

یہ یسین اور فوجی قیادت کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ پوری دنیا کو وزیر اعظم اور آرمی چیف کے

۱۱۔ مہمانِ امتحانی خوفِ کلام اختیار نہ کرے۔ پھر تلی نے کہا کہ وہ اس وقت فوج میں نہیں ہے

الحمد لله رب العالمين

31. 4/10/13 14.5 1.5 1.2 1.1 1.0 0.9 0.8 0.7 0.6 0.5 0.4 0.3 0.2 0.1 0.0

کتابخانه جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

بہ طرف کیا جائے۔

قلمی نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ان کے پاس اس طرح کی رہنمائی بھی تھی کہ جب جنرل مشرف آرمی ہیڈ کوارٹر آئیں گے اور انہوں نے مختلف کور کے دورے کیے تو بہت سارے فوجی افسران نے انہیں یہ کہا تھا کہ وہ نواز شریف کو اپنے ساتھ وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دیں جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے ساتھ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی جب 12 اکتوبر کو جنرل مشرف کو اس میں کیا گیا تو ان کے ذہن میں اپنے ان فوجی افسروں کا یہ مطالبہ ضرور ہوگا۔

میں نے جنرل قلمی سے پچھا کہ آخر فوج سیاست میں کیوں مداخلت کرتی آئی تھی تو وہ بولے کہ ان کی اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ فوج کو سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے چاہے اس کے پیچھے کتنی بڑی وجہ ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم قلمی نے کہا کہ جب بھی فوج نے کسی بھی سولین حکومت کو گرا دیا تو اس وقت کی سیاسی لیڈر شپ نے ہر قاعدہ و طور پر انہیں اس کے جواز پیش کیے۔ جو مسائل سیاسی انداز میں حل ہو سکتے تھے وہ سیاسی لوگ فوجی لیڈروں کے سامنے لے کر آتے تھے اور یہ بہت غلط اپروچ تھی۔ جنرل قلمی کا خیال تھا کہ سیاستدان اپنے مقاصد کے لیے فوج کو استعمال کرتے تھے جس سے فوجیوں کو بھی یہ بہانہ ملتا تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل اندازی کریں۔ قلمی نے انکشاف کیا کہ جب وہ ڈی بی ایم آئی تھے تو بہت سارے سیاستدان ان سے ملنے بیٹھ کر آتے اور وہ چاہتے تھے کہ فوج اس وقت کی حکومت کو گرانے میں رول ادا کرے۔ تاہم قلمی کے بقول سولین حکومتوں کو گرانے کے لیے یہ وجوہات مناسب نہیں تھیں۔ قلمی کا خیال تھا کہ اگر فوجی قیادت کے پاس کسی سیاسی حکومت کو ہٹانے کی کتنی ہی ضروری وجوہات تھیں تو انہوں نے اپنی فوری طور پر ملک میں ملے انگشتوں کے اقتدار منتخب نمائندوں کے سامنے کر دینا چاہیے کیونکہ ملک پر عسکرانی کرنا فوج کا کام نہیں ہے۔ جنرل وحید نے بالکل یہی کام 1993ء میں کیا تھا جب انہوں نے ملے انگشتوں کے اقتدار منتخب نمائندوں کے سامنے کر دیا۔ یوں ملک میں جمہوریت کاٹی رہی۔ قلمی نے کہا کہ پاکستان میں فوجی مداخلتوں سے نہیں بلکہ جمہوریت کے مسلسل پھٹنے رہنے سے ہی جمہوریت آئے گی۔ جمہوریت ایک مکمل نظام ہے اور اسے پھٹنے رہنا چاہیے۔ آرمی کو سولین عسکرانوں اور پارلیمنٹ کے پیچھے ہٹنا چاہیے کیونکہ اس وقت دنیا میں جمہوریت ہی ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت کسی بھی ملک کو چلایا جاسکتا ہے۔

شاہد حامد

یہ چھ اگست 2003ء کا دن تھا۔ اس دن میری سالگرہ تھی۔ میں نے گھر پر رہ کر سالگرہ منانے کی بجائے تنہا گلی جانے کا فیصلہ کیا۔ دو دن قبل اسلام آباد میں واقع فرانس کے سفارتخانے میں میری پنجاب کے سابق گورنر اور فاروق لغاری کے انتہائی قریبی دوست اور ان کے ایڈوائزر شاہد حامد سے ایک کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں نے چوہدری شجاعت والے تھیلک ٹیڑ پر وفاق اعتراف کے بعد ان تمام لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا جو میرے خیال میں اس وقت بعض اہم جگہوں پر موجود تھے جب اس ملک میں جو سازشیں ہو رہی تھیں یا سیاسی نظام کی بساط کھینچی جا رہی تھی۔ میں شاید کبھی شاہد حامد کے بارے میں نہ سوچتا لیکن انہیں فرانس کے سیر کے گھر کے سربراہ شاہد اب لان میں داخل ہوئی تمام میں اپنی خوبصورت روی کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہلکے کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے اس شخص سے ملنا چاہیے کیونکہ وہ بڑے اچھے طریقے سے ان تمام واقعات سے پردہ اٹھا سکتے ہیں کہ کبھی اور کن حالات میں 9 نومبر 1999ء کو یہ نظریہ ہٹا دیا گیا کہ اس کے اوپر فاروق لغاری نے قیام اور آزادی ہیڈ جہانگیر کرامت کا اس میں کیا کردار تھا۔ چیف جسٹس جہاں علی شاہ کیا اہم کھیل رہے تھے۔ نواز شریف کے ساتھ مستحق کے معاملات کیسے اور کون سے کردار تھا اور سب سے بڑھ کر فاروق لغاری نے کن حالات میں ملک کی صدارت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ آخر

شاہد حامد کیسے اپنے پرانے دوست فاروق لغاری کو اکلیا چھڑ کر پیچھے سے قتل کر دیا۔
 وہ اس قتل کی کڑی تنقید کے بعد منہ پر کھانسی کے کھڑکے سے کہہ رہے تھے۔

جب میں نے شاہد حامد کو اپنا تعارف کروایا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کا اپنے
 اعتبار سے بڑے بڑے اعز و اقارب کو پاؤں دیاں تو مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی کہ شاہد حامد سے زیادہ
 ان کی فہم نے بڑے بڑے بڑے اعز و اقارب میں اس آئینے کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس سے پہلے کہ شاہد حامد
 کوئی مثبت یا منفی جواب دیتے، انہوں نے وہ ان بعد کا مجھے وقت دے دیا۔ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ
 اگر میں ان کا اعتراف کرتا ہوں یا ہوں تو مجھے تنصیغی آنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت کے وزیر خارجہ
 نور شید محمود قصوری کی معاونت کو بھی میں اپنے بچوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ چھڑیاں مٹانے گئے
 ہوئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کرنے والی بیگم شاہد حامد چاہتی تھیں کہ ان
 کے مہاں وہ بارہ پاکستانی سیاست میں شامل ہوں اور ان کی باتیں پوری فیملی کو ایک سے سرے سے
 سیاسی امور سے بے پروا کرتی ہیں۔

وہ ان بعد میں نے اپنے ایک پیارے دوست ڈاکٹر ظفر الطاف سے کازی اور ڈرائیور مانگا اور
 تنصیغی لگی چلا گیا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اچھے،
 خوبصورت اور محسوس کر دینے والے ماحول میں کبھی کسی کا اعتراف نہیں کیا جو نور شید قصوری کی کوٹھی کے
 عقب میں واقع ہالکونی میں بیٹھ کر دھیمی دھیمی ہارٹ اور بدن سے نکلتی سرد ہوا میں بیٹھ کر شاہد حامد کا کیا
 تھا۔ یہ نہیں کیا بات ہے کہ اس ہالکونی میں بیٹھ کر دور تک پہنچی سرسبز و شاداب وادی جسے گہرے ہادلوں
 میں اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، میں کبھی نہیں بھلا سکا اور میں دنیا میں جہاں بھی گیا وہاں اس گھر میں گزرتے
 ہوئے چند گھنٹے میری یادوں میں ہمیشہ شامل رہے ہیں۔

پانچ گھنٹے بعد جب میں اس لحظہ سے اور خوبصورت موسم میں مری کے پہاڑوں پر ذیلی شام
 میں اسلام آباد کی طرف واپس روانہ ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ اس ملک میں رہنے والے مجھ جیسے عام
 لوگ اپنے سفر ان اور ان کی سازشوں اور ٹواٹشوں کی قیمت کیسے ادا کرتے آتے ہیں۔ یقیناً چاہے اگر
 میں شاہد حامد سے نہ ملتا اور وہ بھی بڑی ایمانداری سے مجھے بیٹھ کر بھٹو، فاروق لغاری، نو از شریف، ریچیف
 انٹلجی، شاہد اور جنرل جہانگیر کرامت کی اندرونی باتیں نہ بتاتے تو شاید میں اس ملک کی سیاست کو

میں سے کچھ اور باتیں کہہ دیتا کہ آج میں کہہ سکتا ہوں۔

جب وہ گریب سا اتفاق ہے کہ شاہد حامد کے والد جنرل حامد نے پاکستان کے سر سے آری ڈیکٹر
 جنرل شہباز کے دور میں اس عہد سے قید و بند کی سزا سنائی تھی۔ یہ کہ ان کو قتل پہنچا دینی سے تھا اور
 وہ اپنے آپ کو بھٹو کا وکیل اور قصور کرتے تھے۔ تاہم، وقت کیسے بدلتا ہے۔ یوں کہ جس انسان کیسے بدلتے
 ہیں کہ ان جنرل حامد کے بیٹے شاہد حامد نے 5 نومبر 1998ء کی رات اسی بھٹو کی بیٹی، بیٹھیکر کی حکومت
 توڑنے کے لیے اپنے دوست فاروق لغاری کو ایک صدارتی حکمرانہ تیار کر کے دیا۔ شاہد حامد کے
 اراکین کیسے ہوئے اس صدارتی حکمرانہ سے نے اس ملک کی تاریخ ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دی تھی کیونکہ
 ان کی بدولت آصف زرداری قیام میں گئے جہاں سے وہ 2004ء میں تقریباً دس سال بعد ہوا کہ ملک
 چھوڑ گئے۔ اس سے پہلے بیٹھیکر بھٹو ماری 1999ء میں ملک چھوڑ کر ہلا وطن ہو گئیں اور جب آٹھ سال
 بعد وہ ملک لوٹیں تو راولپنڈی کے بازار میں سرعام ماری گئیں۔ اگر اس رات بے نظیر بھٹو کی حکومت نہ
 توڑی جاتی تو شاید یہ سب کچھ مختلف ہو سکتا تھا۔

نور شید قصوری کی درختوں میں گھری اس خوبصورتی کوٹھی کے مٹی مٹے کی ہالکونی میں بیٹھے
 ہارٹ کے قطرہوں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ میں شاہد حامد کو ابھی بھی وہ 5 نومبر کی رات سات سال بعد
 بڑی اچھی طرح یاد تھی جب ہر پانچ منٹ بعد فاروق لغاری ان کے کمرے میں آتے اور کہتے "شاہد جی
 اب اہم فحاشی کے آرڈر ز جلدی تیار کرو۔"

یہ شاید اس خوبصورت ماحول کا اثر تھا جس نے مجھے چاروں اطراف سے اپنی گرفت میں لیا ہوا
 تھا یا پھر شاہد حامد جیسا ایک نفیس لیکن ذریعہ انسان اپنا دل کھولنے پر تیار ہوا تھا یا پھر فاروق لغاری کے اس
 پرانے دوست کو اس بات کا احساس تھا کہ رؤف اسلام آباد سے اتنی دور صرف اس کا اعتراف کرنے آیا
 ہے لہذا اس سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ بہر حال، جو بھی وہ تھی شاہد حامد نے بڑی ایمانداری سے اس دور
 کے اہم واقعات کو بڑی تفصیل سے میرے سامنے ایک ایک کر کے بیان کرنا شروع کیا اور میں نے اپنے
 آپ کو اس شخص کی طرح محسوس کیا جسے وقت بڑی تیزی سے سات سال پیچھے لے گیا ہو جب کچھ عاتق
 لوگ محض مزید طاقت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور آج وہ
 اس عالم ہرجائی کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کی جگہ جنرل مشرف، صدر اور بھائی وزیر اعظم ہیں۔

جس دن فاروق لغاری اس ملک کے صدر بنے انہوں نے اسی لمحے اپنے انگوٹھیں کاٹنے کے دوست شاہد حامد کو اپنے ایڈوائزر مقرر کر لیا۔ فاروق لغاری نے شاہد حامد سے جو پہلی لیگل ایڈوائس لی وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بارے میں تھی جس میں ججوں کی سینیاری کا فیصلہ دیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر عمل کرنے کو چاہتے تھے۔ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری نے ایک اہم میٹنگ بھی کی تھی جس میں یہ بحث ہوئی تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے۔ اس اہم میٹنگ میں فاروق لغاری اور بینظیر بھٹو کے علاوہ صدر کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر علی خان، شاہد حامد، رضا ربانی، مرحوم جسٹس منیر اور ڈپٹی ایٹارنی جنرل بھی موجود تھے۔ بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ چیف جسٹس سہاد علی شاہ کو برطرف کر دیں۔ فاروق لغاری نے بینظیر کی بات سن کر شاہد حامد کی طرف دیکھا اور اس کی رائے مانگی۔ شاہد حامد نے بتایا کہ ججوں کی سینیاری کا کیس مختلف طور پر سنایا گیا ہے اور تمام ججز اس پر عملدرآمد چاہتے ہیں لہذا یہ کوئی سمجھداری کی بات نہیں ہوگی اگر ہم نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنے کی بجائے چیف جسٹس کو بتا دیا۔

صدر لغاری نے شاہد حامد کی اس ایڈوائس سے پورا اتفاق کیا اور بینظیر بھٹو کی اس بات کو ٹھکرا دیا کہ وہ چیف جسٹس کو فارغ کر دیں۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک ایسی غلطی مائل کر دی تھی جو آخر کار بینظیر حکومت کے نوٹے اور کچھ ماہ بعد فاروق لغاری کے استعفیٰ دینے پر ختم ہوئی۔

اپنی یادوں میں کھوسے شاہد حامد نے یاد کیا کہ یہ اگست 1996ء کی بات ہے۔ وہ اسی گھر میں پھنسیاں مٹانے آئے ہوئے تھے جب صدر پاکستان فاروق لغاری نے انہیں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر اسلام آباد واپس آئیں۔ وہ جو فیصلہ اسلام آباد پہنچے تو فاروق لغاری نے شاہد حامد کو چیف جسٹس سہاد علی شاہ کا ایک خط دکھایا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ ججینز پارٹی کی حکومت نے اب تک ججوں کی سینیاری والے کیس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس خط میں چیف جسٹس سہاد علی شاہ نے یہ بھی وارننگ دی تھی کہ ان کی ججمنٹ پر عمل نہ کرنے سے ایک بہت بڑا آئینی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس خط کے ملنے کے بعد فاروق لغاری بڑے پریشان تھے اور انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسٹس سہاد علی شاہ اس

امام کے ذریعے انہیں کیا بیٹا سمجھنا چاہ رہے ہیں۔

شاہد حامد نے لغاری کو بتایا کہ چیف جسٹس انہیں بڑے واضح الفاظ میں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ملک کو آئینی طور پر نہیں چلایا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس نے صدر پاکستان کو ان کی آئینی ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں جو ان کو انتہائی تنازعہ شق 58(2)b کے تحت حاصل ہیں۔ اس آئینی شق کے ذریعے صدر منتخب حکومت اور اسمبلی توڑ سکتا تھا۔ لغاری نے شاہد حامد سے پوچھا کہ وہ چیف جسٹس کے اس خط پر کیا رد عمل ظاہر کریں۔ شاہد حامد نے لغاری کو مشورہ دیا کہ وہ سپریم کورٹ کو ایک ریفرنس بنا کر بھیجیں جس میں ان سے یہ رائے لی جائے کہ ان حالات میں کیا صدر پاکستان کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔

فاروق لغاری کو شاہد حامد کی یہ تجویز بہت پسند آئی اور فوری طور پر انہیں کہا گیا کہ وہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو ایک ریفرنس بھیجنے کی تیاری کریں۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب بینظیر بھٹو کو فاروق لغاری کے اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سپریم کورٹ کو ریفرنس بھیجنے والے ہیں تو وہ بڑے شدید دباؤ کا شکار ہو گئیں اور انہوں نے فوری طور پر ججز کیس کے فیصلے پر عمل کر دیا۔

تاہم، فاروق لغاری مطمئن نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بینظیر بھٹو حکومت کی خراب کارکردگی سے ناخوش تھے۔ صدر لغاری کے خیال میں اگر بینظیر بھٹو کی حکومت زیادہ دیر تک چلنے دی گئی تو پاکستان معاشی و سیاسی بحران کا شکار ہو جائے گا۔

آخر ایک دن صدر لغاری نے شاہد حامد کو بلایا اور پہلی دفعہ یہ اظہار کیا کہ وہ بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ بات سن کر شاہد حامد چونک گئے اور انہوں نے صدر لغاری کو بتایا کہ بینظیر حکومت کو توڑنے کے لیے محض ایک وجہ نا کافی ہے۔ سپریم کورٹ کبھی بھی صدر لغاری کے حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے فیصلے کو قبول نہیں کرے گی محض اس بنیاد پر کہ صدر کا نشانہ بینظیر بھٹو ہیں۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ اگر ریاست کے ایک سے زیادہ ادارے کرپشن میں ملوث ہیں تو پھر بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کی بہت ساری وجوہات کورٹ کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں۔

شاہد حامد نے صدر لغاری کو یہ تجویز 1988ء سے لے کر 1993ء تک برطرف ہونے والی حکومتوں اور ان کے عدالتوں میں چلنے والے کیسوں اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں دی تھی۔ 1988ء

میں مادی سبب اللہ نے ہنزل ضیاء کے جو نگہ کی حکومت توڑنے کے فیصلے کو پہنچایا تھا۔ 1990ء میں
خود مختار طارق رحم نے علامہ اسحاق خان کی بینظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے خلاف پینشن وائر کی قیامی ہنگامہ
1993ء میں نواز شریف نے علامہ اسحاق خان کے اپنی حکومت توڑے جانے کے خلاف سپریم کورٹ
میں پینشن وائر کی قیامی۔ یہ فیصلہ وہاں ہے کہ سپریم کورٹ نے سندھ کے دو وزیراعظم جو نجی اور بینظیر بھٹو
کی حکومتیں بحال نہیں کیں جبکہ مطالب سے آنے والے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت بحال کی گئی تھی۔
بینظیر بھٹو بیٹھ عدالتوں کے ان فیصلوں کو چنک کا تیو قرار دیتی رہی تھیں۔

بینظیر بھٹو کا کاؤٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔ شاہد حامد کے بقول ایک دن صدر لغاری نے 27
جولائی 1998ء کو انہیں اپنے پاس بلا دیا اور حکومت کی کڑی شرائط سے ہماری موٹی ٹانگوں کا ایک اٹھارہ ان کے
حوالے کیا۔ شاہد حامد کو کہا گیا کہ وہ بینظیر بھٹو کی برطرفی کے آرڈر جاری کریں۔ دن رات ایک کر کے آخر
شاہد حامد نے ان ٹانگوں میں سے نو پانچ اٹھتے تیار کیے جنہیں صدر لغاری کو حکومت کی برطرفی آرڈر کے
ساتھ پارلیمنٹ کے طور پر پیش کیا۔ اس پارلیمنٹ میں یہ الزامات لگائے گئے تھے ان میں سے
بکھڑوں کے نوٹ لپ کے لے کے الزامات، پی آئی اے، موٹی ٹانگوں کیس، آئل لیملڈ اور واپڈا میں
کرپشن کے الزامات بھی شامل تھے۔ شاہد حامد نے ان تمام بارے بارے لوگوں کے ناموں کی فہرست
اپنی حاصل کر لی تھی جن کے لیے نوٹ بینظیر بھٹو کے حکم پر لپ کے تھے۔ اس وقت کے چیئرمین
محکمات و ہم ہار نے فیصلہ دیا کہ شاہد حامد کو ان کا یہ ہانے کے لیے کہ ان کا نام بھی اس فہرست
میں شامل ہے جن کے نوٹ لپ کے تھے۔

تھیوگلی میں واقع اس فہرست میں ان کی انگوٹھی میں ہارن کے ٹھوس کی سندداشت میں میں
نے ایک ایک شاہد حامد سے پوچھا کہ کیا وہ ان کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ وہ خود اسے ان کے
ان کے لئے۔

یہ ان کا سوال تھا کہ کیا ان کی ہارن کے ٹھوس کے لوگوں کے بھی انگوٹھی میں لپ کے تھے
ہے۔ شاہد حامد نے کہا۔ ہاں۔

ایک بات یہ ہے کہ ان میں بار بار یہی قیامی قرار دیتی رات گئے بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کی
کیا ضرورت تھی؟ کیا یہ کام ان میں نہیں ہو سکتا تھا۔

اس پر شاہد حامد نے ایک نئی کہانی سنائی۔

وہ اصل صدر لغاری اس بات پر زور دے رہے تھے کہ حکومت کی برطرفی کا راز کسی صورت بھی
اپنے وقت سے پہلے افشا نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ صرف چار لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ 9 نومبر
1998ء کی رات بینظیر بھٹو حکومت توڑ دی جائے گی۔

میں نے پھر پوچھا کہ وہ چار لوگ کون تھے۔ تو شاہد حامد نے کہا کہ ایک تو خود صدر پاکستان،
دوسرے ان کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر خان، آرمی چیف جنرل گلبرگ کرامت اور تیسرے وہ (شاہد حامد) خود
تھے۔

منصوبہ کے مطابق بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے آرڈر ہنزل جنرل جنرل گلبرگ کرامت کو لکھیں کیے
جانے تھے تاکہ وہ ٹرینڈون بریگیڈ کو جہازات جاری کر سکیں۔ تاہم، جب شاہد حامد بینظیر بھٹو کی برطرفی
کے آرڈر جاری کر رہے تھے تو اسی وقت انگریزی اخبار دی نیشن کے ایڈیٹر عارف نظامی شمشیر خان کے
کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شاہد حامد گھبرا گئے کیونکہ اس مرحلے پر کسی بھی اخبار نویس کی
وہاں موجودگی ان کے حکم پلان کو خراب کر سکتی تھی۔ گھبراہٹ سے شاہد حامد نے فوراً اپنے کاغذات
اٹھنے کر کے شروع کیے تاکہ عارف نظامی کی ان پر لگاؤ نہ پڑ سکے۔ عارف نظامی کے اندر موجود ایک
مہائی نے انہیں شک میں ڈال دیا کیونکہ ان دنوں بینظیر بھٹو اور قاضی رفیق لغاری کے کشاکش کا تذکرہ کیا گیا تھا
بروز اور رات ہو رہی تھیں۔ لہذا انہوں نے پوچھا کہ وہ اس وقت پرنسپل سیکرٹری کے کمرے میں کیسے
کہا گیا تھا کہ وہ یہاں ہے جی۔ شاہد حامد کو بڑی طور پر کوئی جواب نہ دیا تو انہوں نے عارف نظامی کو
دو گونہ سوال کیا کہ ایک تو ان کے شمشیر خان کے کمرے میں کیسے کہ وہ یہاں ہے جی۔ شاہد حامد نے یہاں
کہہ دیا ہے کہ عارف نظامی بھٹو اور بھٹو سے ہوا تھا کہ وہ یہاں ہے جی۔ شاہد حامد نے یہاں
عارف نظامی وہاں مد گھنٹے تک بیٹھے شاہد حامد سے گپ شپ کرتے رہے۔ شاہد حامد کے بچے عارف
نظامی کی کوئی بات نہیں چ رہی تھی کیونکہ ان کے ذہن پر برطرفی کا آرڈر جاری تھا اور یہ "تھک کام" آج
یہ ان کا کام تھا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا اور عارف نظامی صاحب تھے کہ انہیں کام نہیں
لے رہے تھے۔ آخر غصے نے شاہد حامد کی سن لی اور عارف نظامی اب ان صدر سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان
کے جانے کے بعد شاہد حامد نے بینظیر بھٹو کی برطرفی کا آرڈر مکمل کیا اور صدر لغاری نے اس پر دستخط کر

میرے خیال میں فاروق لغاری چاہے تھے کہ ان تمام صحافیوں کو کابینہ میں وزیر بنایا جائے جن کی سرپرستی ملتی تھی اور جو بینظیر بھٹو حکومت سے کرپشن کی وجہ سے نفرت کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے اخبارات و جرائد میں مسلسل حکومت کی نااہلی کے خلاف مضمون لکھتے رہے تھے اور فاروق لغاری اور جہزیل جہاگیر کرامت کو ایک مسجک کے طور پر پیش کرتے رہے تھے۔ نجم سیٹھی اور ارشد احمد حقانی تو اس جھگڑے میں آگئے تاہم عارف لغاری زیادہ پرورش اور ایماندار صحافی ثابت ہوئے اور انہوں نے فاروق لغاری اور شاہد حامد کی دی ہوئی یہ میٹھی گولی کھانے سے انکار کر دیا۔

تقریباً گلی کی فضاؤں میں غنڈہک بڑھتی شروع ہو گئی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ ابھی شاہد حامد سے بہت کچھ سنا اور سچنا ہے۔ میں نے ایک دن سے سو ۱۱۱ات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ جینگیر بھنوں کی ہر طرفی سے پیٹے آغرا کا مینہ کے ناموں کو کس نے جیت کر حتمی شکل دی تھی۔

شاہرہ خانم نے بتایا کہ جب سے فاروق اعجازی نے بینظیر بھٹو حکومت پر طرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں گامیہ کے ان دزیوں کی فہرست بنا چکے تھے جنہیں انہوں نے صفحہ درجہ اول پر نام لکھنا ہوا تھا۔

حکومت برطرف کرنے کے بعد قادیان قاری نے ورلڈ بینک کے ایک ملازم شاہد جاوید
برکی کو خود بخود فون کیا اور انہیں ملک کا وزیر خزانہ بنانے کی پیشکش کی۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر
ولاسٹز نے باقاعدہ فون کر کے صدر قادیان کو پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت برطرف کرنے پر
مہار کہا اور جیل کی۔

مشاہدہ ملک کی اس بات سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ جہاں نواز شریف، عابدہ حسین، شہباز شریف، عابدہ بی بی، علی حسان اور آرمی چیف جہاگیر کریمت جیٹیکر بھٹو حکومت و طرف کرنے کی سازش میں شامل تھے وہاں حالی اور نے بھی باقاعدہ اپنا رول ادا کر رہے تھے۔ بعد میں مجھے جیٹیکر بھٹو اور کے وقت وزیر داخلہ شریز قیصر نے یہ بتایا تھا کہ وہ اصل ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیٹیکر بھٹو کو دہانہ میں رہے تھے کہ وہ پاکستان میں بجلی اور گیس کے نرخ بڑھا دیں۔ تاہم جیٹیکر بھٹو نے ان کی یہ شرائط مانگنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ عام آدمی، ہاؤسنگ، ایلاپا، گیس، ایلاپا، گیس، سڑکوں اور ان کے ورلڈ بینک اور اس

...میر بھی پیش پیش تھے۔

کے علاوہ ہم بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔
بینظیر بھٹو حکومت ہر طرف ہونے کے بعد بہت سارے لوگوں کی لائبریری کھل گئی تھی۔ شاہد حامد کو
تین اہم وزارتوں کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہیں سوچ سمجھ کر وزارت دفاع، قانون اور انسٹیٹوشن کی
وزارتیں دی گئیں تاکہ وہ فوج، عدلیہ اور سول بیورو کرکسی کو اپنے حق میں کر سکیں۔ صدر لغاری چاہتے تھے
کہ سیاسی جماعت سے ان کے دو قہار ہندے بھی کابینہ میں لیے جائیں۔ عابدہ حسین اور شفقت محمود کے
ناموں پر بھی غور کیا گیا۔ کچھ ناموں کا فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ دو اہم صحافیوں مجسم طغی اور ارشد حقانی
کو بھی وزیر بنایا گیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے بینظیر بھٹو کے خلاف صدر لغاری کے
ہاتھ مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ملک معراج خالد لاہور میں واقع اپنے گھر میں سو رہے تھے
جب آدھی رات کو انہیں ٹیلی فون کر کے بتایا گیا کہ انہیں ملک کا گھرانہ وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔
شاہد حامد نے یہ دعویٰ کیا کہ معراج خالد کو بینظیر بھٹو کی ہر طرفی کے منصوبے کا ہرگز علم نہیں تھا۔

چاہم، مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایک دوسرے کے دشمن لغاری اور نواز بینظیر بھٹو حکومت کی طرف کرنے کے لیے ایک نکتے پر کیسے راضی ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے گہرا سانس لیا اور مجھے بتایا کہ دراصل پہلے دن سے ہی بخاری اپنی حیثیت صدر
پاکستان کے طور پر منوانا چاہ رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ انہیں صدر پاکستان سمجھیں نہ کہ
مہاجر پارٹی حکومت کا جیالہ! یہی وجہ تھی کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ بھی رابطہ کرنے کی کوئی صورت ڈھونڈ
رہے تھے۔ تاہم، نواز شریف زیادہ سمجھدار تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر قاریق بخاری اور ان کے
دور میں کوئی ملاقات ہو تو اس میں کوئی اہم باتیں یا ایجنڈا انکس ہو نا چاہیے۔ محض چائے پینے یا کھانا
کھانے کے لیے وہ ملاقات نہیں کریں گے۔ اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں اطراف سے پہلے ایک ایم
ٹائی جوائنٹ اور بخاری کے درمیان ملاقات کے ایجنڈے کے لیے تیاری کرے۔ شاہد حامد کو صدر
بخاری نے نامزد کیا کہ وہ نواز شریف کی ایم سے ملاقات کریں گے جبکہ نواز شریف نے سر تاج عزیز،
انزل امجد ملک، چوہدری شامعلی اور شہباز شریف کو اپنی طرف سے نامزد کیا۔ یوں ان لیڈروں کی پہلی
ملاقات عابد حسین کے اسلام آباد میں واقع گھر میں ہوئی۔ شاہد حامد، عابد حسین کے گھر گئے جہاں نواز
شریف کے علاوہ چوہدری شامعلی، عابد اور شہباز شریف موجود تھے۔ ملاقات کے دوران شاہد حامد نے یہ

جوبڑی کی نواز شریف کو لغاری سے ملنا چاہیے۔ تاہم، سیاسی طور پر سمجھدار نواز اور ان کے ساتھیوں کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گزبڑ ہے لہذا وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو سے 1993ء میں نواز شریف کے بھائے اسحاق خان کا ساتھ دینے پر اسے سزا دینے کا سنہری موقع ان کے ہاتھ آ رہا تھا۔ لہذا نواز اور ان کے ساتھیوں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ اگر ان کی فاروق لغاری سے ملاقات ہوتی بھی ہے تو اس کے بدلے میں انہیں کیا ملے گا۔ شاہد حامد نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو نواز نے بتایا کہ سب سے پہلے لغاری کو پاکستان مسلم لیگ نواز کے بینظیر بھٹو حکومت کے خلاف لیے گئے سینڈ کی تائید کرنی چاہیے۔ اگر ان دونوں کے درمیان ملاقات بھی ہو تو اس ملاقات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلنا چاہیے۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان میں سے کسی نے شاہد حامد سے یہ پوچھ لیا کہ کیا ان کے پاس واقعی فاروق لغاری کی اتنی اتھارٹی موجود ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم فیصلے بینظیر بھٹو کے پاس کر سکیں۔ اس خفیہ ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ نواز شریف شاہد حامد سے چند مضبوط یقین دہانیاں لینے کے بعد صدر لغاری سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ شاہد حامد نے صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے سب سے بڑی گارنٹی یہ دی کہ اس ملک میں جب بھی الیکشن ہوں گے وہ آزادانہ اور شفاف ہوں گے۔ میں نے شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب عابد حسین کے گھر پر یہ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو کیا ان میں یہ بات بھی چھپی گئی تھی کہ اگر الیکشن کے بعد نواز شریف اس ملک کے وزیراعظم بنتے ہیں اور ان کی قلم کے دوران ہی فاروق لغاری دوبارہ صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار بنتے ہیں تو کیا مسلم لیگ نواز انہیں سپورٹ کرے گی۔

شاہد حامد نے جواب دیا کہ جب نواز اور لغاری کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی تو اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ تاہم، شاہد حامد نے اس بات کا انکشاف کیا کہ جب نواز شریف کے ساتھی صدارتی نمائندوں کے ساتھ بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کے لیے صلاح مشورے میں مصروف تھے تو انہوں نے یقیناً صدر لغاری کو دوسری دفعہ صدر بنانے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ چوہدری ثار علی خان اور شہباز شریف دونوں نے ہا قاعدہ طور پر فاروق لغاری کو صدر بنانے کے حوالے سے شاہد حامد کو آفر کی تھی۔ اس کے بعد جب لغاری اور نواز شریف کی مزید ملاقاتیں ہوئیں تو نواز شریف نے براہ راست بھی

فاروق لغاری کو خود پیشکش کی تھی۔ تاہم، فاروق لغاری نے ہر دفعہ دوسری فرم کے لیے صدر بننے سے انکار کیا۔ لغاری کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس ملک کو آئینی تقاضوں کے مطابق چلایا جائے۔ شاہد حامد نے یہ بھی انکشاف کیا کہ بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے بعد عابد حسین خود ایک پیشکش لے کر آئی تھیں کہ پاکستان مسلم لیگ نواز نے انتخابات میں فاروق لغاری کے امیدواروں کو 20% ٹکٹیں دینے کے لیے تیار تھی۔ تاہم، لغاری نے انکار کر دیا۔

میرا اپنا یہ خیال تھا کہ نواز شریف، شہباز شریف اور چوہدری ثار علی خان صدر لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے جو بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری اور آفتاب شیرپاؤ کے ساتھ مل کر 1993ء میں اسحاق خان کے ساتھ کھیلا تھا۔ جب نواز شریف اور اسحاق خان میں اقتدار کے لیے کشمکش بڑھی تو دونوں نے اس وقت کی اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا کیونکہ یہ طے تھا کہ جس کے پلڑے میں بینظیر بھٹو اپنا وزن ڈالیں گی وہ جیت جائے گا۔ بینظیر کو نواز شریف یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ ان کی حکومت ڈس مس کرانے میں حصہ دار نہ بنیں تو ان پر اور آصف زرداری پر قائم ہونے والے مقدمات جو 1990ء میں اسحاق خان کے کہنے پر قائم کیے گئے تھے انہیں ختم کر سکتے ہیں اور ایک نیا آزاد الیکشن کمیشن بھی بنایا جاسکتا ہے تاکہ جب نواز شریف کے پانچ سال پورے ہوں تو انتخابات آزاد اور شفاف ہوں۔ دوسری طرف اسحاق خان اپنے داماد انور سیف اللہ کے ذریعے یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ قومی اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں جو صدر کو اسمبلیاں توڑنے کا جواز فراہم کریں گی تو وہ نئے الیکشن کے بعد انہیں دوبارہ وزیراعظم قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔ اس کے بدلے میں بینظیر بھٹو سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ 1993ء میں ان کی صدارتی معیاد ختم ہو رہی تھی لہذا انہیں پانچ سال کے لیے مزید صدر بنایا جائے گا۔ صدر اسحاق اور نواز شریف میں اختلافات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف صدارتی انتخابات سے چھ ماہ پہلے ہی باقاعدہ یہ اعلان کر دیں کہ وہ ان کے صدارتی امیدوار ہوں گے۔ نواز شریف حکومت کے انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد نے بھی یہ بات مجھے خود بتائی تھی کہ نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل اختلافات اسی بات سے شروع ہوئے تھے کہ وزیراعظم اسحاق خان کو پانچ سالوں کے لیے مزید صدر بنانے کی گارنٹی دینے کو تیار نہیں تھے۔ یوں غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لیے وہ بینظیر

بھونکی رہ رہا ہے تھے۔ بینظیر بھٹو کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں۔ ایک طرف اگر وہ صدر اسحاق کا ساتھ دیتیں تو نہ صرف نواز شریف کو 1990ء میں اسی صدر اسحاق، اسلم بیگ اور جنرل عید گل کے ساتھ مل کر ان کی 8 اگست کو حکومت پر طرف کرانے پر نہ صرف اب ان کی حکومت اس مس کر کے سزا دی جاسکتی تھی بلکہ نئے انتخابات کی وجہ سے وہ فوری طور پر ملک کی وزیراعظم بھی بن سکتی تھیں اور آصف زرداری بھی فوری طور پر رہا ہو سکتے تھے جبکہ نواز شریف کا ساتھ دینے میں بینظیر کو دو سال مزید انتخابات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یوں غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ صدر اسحاق کا ساتھ دے کر ایک تیرے سے کئی ٹکڑے کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر اسحاق خان کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ چھڑ پارٹی نے اصولوں پر سمجھوتہ کر کے ایک ایسے شخص کا ساتھ دیا جس نے بینظیر بھٹو اور آصف زرداری کو کرپشن چارجز پر ہر طرف کر کے ٹیل میں ڈال دیا تھا۔ کسی سیاست نے مشورہ دیا کہ اتنی معمولی سی بات کو اتنے بڑے کار کے سامنے رکاوٹ نہ بنے دیں اور یوں یہ طے پایا کہ اسی کرپٹ شخص کو صدر اسحاق خود اپنی کابینہ کا ممبر بنا کر اور اس سے حلف لے کر ایک طرح کی اسے کلین چٹ فراہم کر دیں گے۔ یوں آسمان نے یہ اعلان بھی دیکھا کہ جس آصف زرداری کو اسحاق خان کے کہنے پر کرپشن الزامات میں تین سال ٹیل میں رکھا گیا تھا اسی صدر نے اسے اپنے ہاتھوں سے حلف دیا۔ ان مذاکرات کے درمیان صدر اسحاق یہ گارنٹی چاہتے تھے کہ انہیں دوبارہ صدر بنایا جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے بھی یہ گولی صدر اسحاق کو دیدی کہ وہ انہیں دوبارہ صدر منتخب کریں گی۔ صدر اسحاق بھی یہ گولی اس لیے نگل گئے کیونکہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نواز اور نصر اللہ خان کے مقابلے میں انہیں اپنا صدیقی امیدوار بنا چکی تھیں بلکہ ان کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم، صدر اسحاق خان یہ بات بھول گئے تھے کہ ان پانچ سالوں میں بینظیر بھٹو نے بھی بہت کچھ سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ انہیں اب سیاست کے ٹکڑے آ گئے تھے۔ اسحاق خان یہ بھول گئے تھے کہ 1988ء میں جنرل اسلم بیگ اور جنرل عید گل پاکستان کو چلا رہے تھے اور پانچ سال بعد پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ اگرچہ اسحاق خان کو یقین تھا کہ فوج کے ایک پٹھان سپہ سالار عبدالوحید کا کڑا اپنے ایک پٹھان بھائی غلام اسحاق خان کا ساتھ دیں گے تاہم یہ ممکن نہ ہو سکا۔ یوں نواز شریف کی برطرفی اور ملک میں نئے انتخابات کے بعد جب نئے صدر کے انتخابات کا مرحلہ آیا اور غلام اسحاق خان پشاور سے دوڑے دوڑے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرانے آئے تو پتہ چلا کہ

جیم ہاٹ پکلی تھی۔ اپنے داماد انور سیف اللہ کے ایف سیون میں واقع گھر میں بیٹھ کر اس زمانے کی بے ہمتی، دھوکے بازی اور سیاسی چال بازیوں کو روک رہے۔ تاہم، وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے تھے۔ سیاست کے سینے میں نہ دل ہوتا ہے اور نہ خون کے رشتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ تو چالیں ہوتی ہیں۔ جو چل گیا وہ جیت گیا جو پیچھے رہ گیا وہ اپنی باری کا انتظار کرے یا پھر پشاور میں واقع اپنے گھر کی لائبریری میں بیٹھ کر تالستانی کا مشہور ناول War and Peace کو سلسلے سے پڑھے اور اپنی یادداشتوں کو قوم کی امانت سمجھ کر قلمبند کرنے کی بجائے ایک رات خاموشی سے اپنے بستر میں خدا کو پیارا ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ نواز شریف بھی فاروق لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ لغاری کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو انہوں نے اسحاق خان کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ تاہم، انسان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ انہی حالات میں برائسی اور شخص کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے ساتھ نہیں ہوگا یا اپنے اوپر بڑھتے ہوئے غیر ضروری اعتماد کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے بعد سب سے طاقتور شخص سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور جب منہ کے بل گرتا ہے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی کچھ نواز شریف کے وزیراعظم بننے کے بعد فاروق لغاری کے ساتھ ہوا۔ وہی نواز شریف جو بینظیر حکومت کرانے کے لیے فاروق لغاری کو دوسری مرتبہ صدر بنانے کے لیے تیار تھے، ان ہی شاہد حامد کے ہاتھ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں مگر نہ پارلیمنٹ کے ذریعے ان کا احتساب کر کے انہیں گھر بھیج دیا جائے گا۔

صدر غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری ایک بات بھول گئے تھے کہ ان کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ اگر وہ ان لوگوں کے وفادار ثابت نہیں ہوئے جنہوں نے انہیں صدر بنوایا تھا تو بھلا ان سے دوسرے لوگ وفا کی کیا توقع رکھیں۔ شاید یہ بات چنگیز خان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بغداد شہر کے حکمران کے خلاف چند لوگوں نے اس کے فوجیوں کی مدد کی اور فتح کے بعد ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنے انعام کا انتظار کرنے لگے تو اس نے ایک تاریخی فقرہ کہہ کر ان سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا تھا کہ جو لوگ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کے وفادار نہیں وہ بھلا کسی اور کے کیا وفادار ہوں گے۔

تھیابیگی کے خواہسہرے جنگلوں اور پہاڑوں پر سے دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور میں ابھی بھی اس کشش کا شکار تھا کہ آخر غار روق غار ی بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور میں نے نظیر بھٹو کو اپنی دین سمجھتے تھے۔ پھر بھی وہ کیونکر ان کا بڑا قدم اٹھانے پر تیار ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے اپنے مخصوص دھیسے انداز میں مجھے بتانا شروع کیا کہ ماضی کے ان دور پرانے دوستوں کے درمیان اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ یہ نہیں کہاں سے صدر لغاری کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مہراں بینک اسکیٹل کے پیچھے آصف زرداری کا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے ان کا عوام کی آنکھوں میں جو ایک صاف ستھرا منج تھا وہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ وہ انکوائری کمیشن جو اس اسکیٹل کی تحقیقات کر رہا تھا، اس نے قاروق لغاری کو بیگناہ قرار دیدیا تھا لیکن اس کمیشن کی رپورٹ کبھی میڈیا یا عوام کو ریلیز نہیں کی گئی۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ بینظیر حکومت نہیں چاہتی تھی کہ لغاری پر لگنے والے کروڑوں روپے کے اس دھبے کو صاف کیا جائے۔ قاروق لغاری اس وجہ سے بھی بینظیر بھٹو سے خفا تھے کہ جب بھی انہوں نے محترمہ سے ان کی حکومت پر لگنے والے کرپشن کے الزامات پر بات کرنی چاہی تو وہ شدید ناراض ہو جاتی تھیں۔ محترمہ نے قاروق لغاری پر اتنا ٹک کرنا شروع کر دیا تھا کہ انہوں نے تمام وفاقی میکانیزموں کو باقاعدہ یہ احکامات جاری کیے تھے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر صدر سے ملاقات نہیں کریں گے۔ تاہم ان تعلقات میں خرابی اس وقت آئی جب بینظیر بھٹو نے سپریم کورٹ کے ججز سیدانی کیس پر عمل کرنے سے انکار کیا تھا۔ کراچی میں مرتضیٰ بھٹو کے قتل نے ری سی کس پوری کر دی جب بینظیر نے یہ راستہ صدر لغاری پر یہ الزام لگایا کہ وہ مرتضیٰ کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ بینظیر بھٹو کے اس خفا کا الزام نے عوام صدر کے کہنوں کی جیندی میں جاس کر دی تھی۔ شاہد حامد کے قتل جب بینظیر بھٹو نے مرتضیٰ کے قتل کا الزام عوام صدر پر لگایا تو وہ خود بھی بہت پریشان ہو گئے تھے۔ کیس یہ تھی کہ آغا حشر سے لے کر یہ صدر کو سپریم کورٹ کی اور پانی رات بینظیر بھٹو کی حکومت اس میں ہونے تک خفاقی خفاقی تقریباً پانچ سو چالیس سال تک شاہد حامد کے کمرے میں ضرور تحریف ہاتھ ملنے پائی تھی کہ یہ طرفہ کا آثار پیدا کرنے میں آتی رہی ہوتی ہے تاکہ عوامی یہ پاراجیٹ تیار ہو سکی اور بینظیر بھٹو کو بھیج دیا جائے۔ مرتضیٰ کے قتل کا الزام لگنے کے بعد اب قاروق لغاری کی صورت بھی بینظیر حکومت کا ہتھیار بن گیا ہے۔ کچھ عرصہ تک یہ لگتا تھا کہ محترمہ صدر نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ

595

یہ بھڑکی برطرفی کا آ رہا تیار کرنے کے لیے انہیں پی آئی اے ہسپتال کی وادیوں، واپے اور دیگر محلوں کی
کوشش کی جو قائم دی گئی تھیں وہ کس نے فراہم کی تھیں۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ اگر آری چیف
جائیداد کرامت صدر لکھاری کے ساتھ تھے تو پھر یقیناً یہ نیک فریضہ آئی ایس آئی نے سرانجام دیا ہوگا۔

جونہی پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو پنجاب سے پیپلز پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کے فون آنے شروع ہو گئے۔ وہ سب قاروق لغاری کا ساتھ دینا چاہ رہے تھے۔ تاہم قاروق لغاری نے اپنی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ انہی دنوں میں کننگز پارٹی بنانے کی سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔

ہاتوں ہاتوں میں شاہد حامد نے ایک اور انکشاف کیا کہ جہازل جہانگیر کرامت 1997ء کے انکیشن ملوثی کرانا چاہ رہے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جہانگیر کرامت نے لغاری کو یہ بھی پیغام دیا تھا کہ اس کے کور کمانڈر اس بات کے حق میں تھے کہ پہلے ملک میں سیاستدانوں کا بے حرمان حساب کیا جائے اور اس کے بعد انکیشن کرائے جائیں۔

ابھی میں اس شاک سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ جہانگیر کرامت بھلا کیسے اس طرح کی بات کر سکتے تھے کہ شاہ حامد نے میرے سر پر ایک اور ہم مارا کہ جہانگیر کرامت کو تو چھوڑیں، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ بھی نئے انتخابات کے خلاف تھے۔ موصوف نے تو صدر اتھارٹی کو ایک خط بھی لکھا تھا کہ ”جناب صدر! کیا آپ نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ سپریم کورٹ سے رابطہ کر کے عمر ان حکومت کا دورانیہ بڑھایا جائے۔“

شاہد حامد کی بات سے یہ بیوقوف ہر شخص تھا کہ اس وقت کے آری چیف اور چیف جسٹس دونوں مل کر پاکستان میں سیاسی نظام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور اس کام کے لیے انہوں نے قاضی قاضی کا استعمال کیا تھا۔ لیکن اخلاقی بھی ایک حد تک استعمال ہونے کے بعد ان دونوں کے ہاتھوں حریر استعمال ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

تھاری کو یہ بھی بھاننے کو دیا جا رہا تھا کہ ملک میں نئی مردم شماری کرانے کے نام پر انتخابات
مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم تھاری نے یہ تمام تجاویز مسترد کر دیں۔ قابض تھاری اس بات سے خوفزدہ
تھے کہ اگر تمہیں نے مگر ان حکومت کے قیام کا دورانیہ یہ حد دیا تو سیاسی جماعتیں اس پر اپنا شدید رد عمل
ظاہر کریں گی۔ تھاری اس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ اگر ملک میں انتخابات نہ ہوئے تو یہ بھی ممکن تھا کہ

کچھ عرصے بعد فوج آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لے۔ بہانہ یہ بتایا جائے گا کہ فاروق لغاری کی کمزور کابینہ کرپٹ سیاستدانوں کا احتساب کرنے میں ناکام رہی تھی۔

جہاں ایک طرف آرمی چیف اور چیف جسٹس ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہے تھے وہاں کابینہ کے چند وزیروں اور صوبائی گورنر بھی لغاری پر مسلسل یہ زور ڈال رہے تھے کہ وہ انتخابات نہ کرائیں بلکہ پہلے احتساب کیا جائے۔ فوجی قیادت بہت زیادہ بے چین تھی اور وہ ہر صورت ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہی تھی۔ جب لغاری پر دباؤ بڑھ گیا تو ایک دن فاروق لغاری کو جی ایچ کیو بلایا گیا جہاں انہوں نے کوارٹروں کو پانچ گھنٹے تک اس بات پر دلائل دیے کہ ملک میں وقت پر انتخابات ہونا کتنے ضروری تھے۔ سول اور فوجی حکمرانوں کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر نیشنل سیکورٹی کونسل کا آئیڈیا سامنے آیا۔ بال فاروق لغاری اس ملک کے پہلے صدر تھے جنہوں نے فوج کے سیاست میں باقاعدہ دخل کو تسلیم کیا۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھا ہی لیا کہ اگر بینظیر بھٹو، آصف زرداری اور پارلیمنٹ کے وہ تمام ارکان جنہوں نے فاروق لغاری کو ووٹ دے کر صدر بنوایا تھا، وہ کرپٹ تھے تو پھر فاروق لغاری نے خود استعفیٰ کیوں نہیں دیدیا۔ اگر انہیں ووٹ دینے والے کرپٹ تھے تو پھر انہیں بھی اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا فاروق لغاری پر اخلاقی اور سیاسی طور پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے تمام کرپٹ ساتھیوں کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ انہوں نے ایک عجیب روایت قائم کی کہ جنہوں نے ان کو صدر بنوایا تھا وہ تو کرپٹ تھے اور موصوف خود اپنے آپ کو بہت ایماندار سمجھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہد حامد کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

شاہد حامد اپنے ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے بولتے رہے۔ بینظیر بھٹو حکومت ختم ہو چکی تھی۔ نئے نئے منصوبے بن رہے تھے کہ اچانک ایک دن پتہ چلا کہ فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت میں اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی برطرفی پریم کورٹ میں چیلنج کر دی تھی۔ سپریم کورٹ کے متوقع فیصلے سے ایک دن پہلے بحث کرنے کے لیے ایک میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اس میٹنگ میں فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت بھی شریک تھے۔ اس میٹنگ کا ایک ہی بات موضوع تھا کہ سپریم کورٹ کیا فیصلہ دے گی۔ سب کی نظریں شاہد حامد کی طرف اٹھیں کیونکہ ان دنوں وہ اس کیس کو براہ

راست ڈال کر رہے تھے۔ شاہد حامد نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ سپریم کورٹ چھ کے مقابلے میں ایک ووٹ سے بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے فیصلے کو برقرار رکھے گی۔

میٹنگ کے شرکاء میں سے اچانک کسی ایک نے ایک انتہائی تکلیف دہ سوال پوچھ لیا کہ اگر سپریم کورٹ نے بینظیر بھٹو حکومت کو بحال کر دیا تو کیا ہوگا۔ ابھی سوال پوچھنے والے کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ فاروق لغاری نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ پھر وہ کل صبح ہی صدارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ فاروق لغاری کی اس بات نے اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو سخت حیران کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی ان سے اس طرح کی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ فاروق لغاری نے ان سب لوگوں کو ایک بہت بڑا واضح پیغام دے دیا تھا کہ وہ ان سب کو انتقام سے بھری بینظیر بھٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی زیریں جا کر ڈیرہ لگا لیں گے۔ اس میٹنگ کے شرکاء کو یہ احساس ہوا کہ فاروق لغاری ایک خود فرض انسان ہیں اور آنے والے دنوں میں ان کے دوستوں کے درمیان اسی ایک بات سے پیدا ہونے والے اختلافات شدید ہوتے گئے اور آخر ایک دن وہ ایوان صدر میں اتنے تہوارہ گئے کہ نواز شریف کے ایک پیغام پر انہیں استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

میں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑا اور شاہد حامد سے پوچھا کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کو ہرانے کے لیے انتخابات میں دھاندلی کرائی تھی۔ شاہد حامد نے مجھے ایک عجیب سی بات بتائی۔

انتخابات کے نتائج نے ایوان صدر کے مکیوں کو بھی حیران کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ نواز شریف دو تہائی اکثریت لے کر الیکشن جیت جائیں گے۔ اس حیرانی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ الیکشن سے کچھ دن پہلے آئی ایس آئی نے اپنی ایک رپورٹ ایوان صدر بھیجی تھی جس میں 2 فروری 1997ء کو ہونے والے انتخابات کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے ہارنے اور جیتنے پر بینظیر بھٹو کی گئی تھیں۔ آئی ایس آئی کے بقول نواز شریف کی پارٹی کو توڑے اور سو کے درمیان جبکہ بینظیر بھٹو کو پچاس اور ساٹھ کے درمیان سینیٹ ملنے کی توقع تھی۔ تاہم، جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو ایوان صدر کے مکیں آہستہ آہستہ حیران اور پھر پریشان ہونا شروع ہو گئے کیونکہ وہ تو یہ توقع کر کے بیٹھے تھے کہ آئی ایس آئی نے جو کہہ دیا تھا وہ فاضل تھا۔ ایک بات واضح تھی کہ پیپلز پارٹی کے مایوس کارکن

ہوت ڈالنے کے لیے اپنے گمروں سے نہیں نکلتے تھے۔

میں نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے شاہد حامد سے پوچھا کہ جب نواز شریف وزیراعظم بن گئے تو پھر لغاری اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ شاہد حامد نے لے کہ شروع میں دونوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایک پرائیویٹ ڈانر کا اہتمام کیا گیا جس میں فاروق لغاری، پرائم منسٹر نواز شریف اور شاہد حامد شریک ہوئے۔ صدر لغاری نے نواز شریف کو ایک قانونی پر بریٹنگ دی۔ شاہد جاوید برکی نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ ملے پانے والے معاہدوں کی تفصیلات بتائیں۔ نواز شریف چاہتے تھے کہ شاہد جاوید برکی ملک کے وزیر خزانہ کے طور پر کام کرتے رہیں لیکن ورلڈ بینک کے اس ملازم نے انکار کر دیا۔ اسی ڈنر پر شاہد حامد نے نواز کو دفاع اور قانونی معاملات پر بریٹنگ دی۔ نواز نے شاہد حامد کو بھی اپنی کابینہ میں وفاقی وزیر بنانے کی پیشکش کی۔ تاہم، فاروق لغاری چاہتے تھے کہ وہ پنجاب کے گورنر بن جائیں۔ جب کہ شاہد حامد کی یہ خواہش تھی کہ وہ فیڈرل منسٹر بن جائیں تاکہ وہ نواز اور لغاری کے درمیان ایک پلی کارول ادا کر سکیں۔ شاہد حامد نے محسوس کیا کہ فاروق لغاری کی شخصیت میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی جس کا نام ڈیرہ غازی خان کی مقامی سیاست تھا۔ ایوان صدر میں بیٹھ کر بھی وہ اپنے حلقے کی چھوٹی موٹی سیاست میں ملوث رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ڈیرہ غازی خان ان کی انگلیوں پر ناچتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو لغاری نے ذاتی طور پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف سے یہ درخواست کی تھی کہ ڈیرہ غازی خان ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی اجازت دی جائے۔ جب ایک دن فاروق لغاری کی مقامی سیاست کے حوالے سے چھوٹی موٹی باتوں پر شاہد حامد تھوڑا سا جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئے تو صدر صاحب نے انہیں ایک طعنہ مارا: "شاہد حامد صاحب آپ چونکہ اقتدار میں کسی سیاسی جدوجہد یا عمل کے ذریعے نہیں آئے لہذا آپ کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جب تک مقامی سیاست میں اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں نہ کی جائیں انتخابات نہیں جیتے جاسکتے۔"

شاہد حامد اپنے پرانے دوست کے احرام میں خاموش تھے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ بات کہتا جا رہا ہے کہ کس طرح ایوان صدر میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو حکومت کو کرپشن اور بیڈ گورننس کے الزامات پر برطرف کرنے والے مہم سونے کس طرح سے اپنے مخالفین کو حقانہ پکھری اور جہانوں کے ذریعے جک کر

کے دھوکے کھانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ تاہم، لگتا ہے کہ قاضی کوڈل لیل کرنے کے بارے میں بھی فاروق لغاری اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو اپنے حلقے میں نہیں سنبھال سکے اور 2008ء کے الیکشن میں وہ نقص جو 1998ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایک لاکھ سے زائد ووٹوں کی لینے سے جیتا تھا، وہ بحال نہیں

دفعہ اپنے حلقے میں ووٹ دوبارہ گنوا کر ایم این اے بن سکا۔ شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو فاروق لغاری خود چاہتے تھے کہ صدر کے اسمبلی توڑنے کے اختیارات کو ختم ہوتا چاہیے۔ شاید لغاری یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ایک صدر صرف ایک دفعہ اسمبلی توڑ سکتا ہے۔ اگر وہ دوبارہ یہ کوشش کرے گا تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو غلام اسحاق خان کا ہوا تھا۔ جب 6 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت توڑی تھی تو فوج، عوام، میڈیا اور سیاستدانوں نے زیادہ رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید بینظیر بھٹو کا زیادہ قصور تھا۔ تاہم، جب تین سال بعد مارچ، اپریل 1993ء میں غلام اسحاق خان نے وہی کام نواز شریف کے ساتھ کیا تو پھر سب نے یہی سمجھا کہ صدر کے ساتھ ہی کچھ مسئلہ ہے جو سیاسی حکومتوں کو نہیں چلنے دے رہا۔ جب تک اس کی چھٹی نہیں ہوگی ملک کا نظام آگے نہیں چلے گا اور یوں غلام اسحاق خان کو سول ملٹری بورڈ کرہی کی تمام تر حمایت کے باوجود استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا تھا۔ یہی بات شاید فاروق لغاری کے ذہن میں بھی تھی کہ وہ اپنا اختیار ایک دفعہ استعمال کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ ان کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔

جب فاروق لغاری نے اپنی اس خواہش کا اظہار جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے کیا تو صدر صاحب بڑے حیران ہوئے جب آرمی چیف نے یہ فرمایا کہ جناب آپ کو یہ 58-2b ختم کرنے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ صدر لغاری کے لیے یہ پیغام بڑا واضح تھا کہ جناب آپ کے لیے استعمال کرنے کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آرمی چیف شاید بینظیر کی طرح نواز شریف کی چھٹی بھی صدر لغاری کے ذریعے کرانا چاہ رہے تھے۔

نواز شریف صدر لغاری کے اس اختیار کو بڑے احسن طریقے سے ختم کرانے کے موڈ میں تھے۔ لگتا ہے کہ انہوں نے چوٹی زبیریں جا کر صدر لغاری کو ان کی اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات ختم کرنے کے مسئلے پر اجماع میں لینے کا فیصلہ کیا۔ جب میٹنگ شروع ہوئی اور نواز شریف نے یہ بات لغاری

کے آگے رکھی کہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر صاحب کے اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں تو لغاری صاحب نے فوراً کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ نواز شریف نے اسلام آباد واپس آ کر پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس حکم کو ختم کر کے لغاری صاحب کے ہاتھ سے آرڈی چیف اور دیگر اہم قیادتیں کرنے کی پادشاہی اپنے ہاتھ میں لے لی تو یکدم سب لوگوں کو محسوس ہوا کہ لغاری صاحب اور نواز شریف میں اختلافات کافی بڑھ چکے ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف چینی زیریں جا رہے تھے تو گورنر شاہد حامد بھی ان کے ساتھ تھے۔ راستے میں نواز شریف نے شاہد حامد کو بتایا کہ آپ لغاری صاحب کو یہ بات بتائیں کہ ہم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دوسری دفعہ بھی ملک کے صدر بنیں۔ تاہم، لغاری صاحب کے ساتھ ہونے والی بیٹنگ سے پہلے شاہد حامد نے نواز شریف کو بتایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آرڈی چیف کون مقرر کر رہا ہے صدر یا وزیراعظم کیونکہ جو فی ایک جنرل آرڈی چیف بنتا ہے تو وہ فوری طور پر چیف آف آرمی سٹاف بن جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پھر اپنے ادارے کے ساتھ ہوتی ہیں نہ کہ صدر یا وزیراعظم کے ساتھ۔

شاہد حامد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ 58-2b کے ختم ہونے سے صدر اور وزیراعظم کے اب تک اچھے تعلقات میں بدلتا فرق پڑا۔ شاہد حامد کو اس بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ نواز شریف اور لغاری کے درمیان اس حکم کا خاتمہ بالآخر آنے والے دنوں میں دونوں کے درمیان شدید اختلافات اور صدر لغاری کے استعفیٰ پر ہوا۔

شاہد حامد نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ الیکشن ہونے سے پہلے فاروق لغاری نے نواز شریف کو بہت بڑی غور کی تھی، یعنی جب امیدواروں کی قابلیت کے مسئلے پر چند چیزیں جو نواز شریف کو الیکشن لڑنے سے روک سکتی تھیں، انہیں ختم کر دیا گیا۔ نواز شریف اور خالد انور نے شاہد حامد سے یہ بات کی تھی کہ فاروق لغاری کو کہیں کہ وہ کسی امیدوار کی الیکشن لڑنے کی شرائط میں سے یہ بات نکال دیں کہ وہ تمام لوگ انتخابات لڑنے کے اہل نہیں تھے جو کسی ایسی بل یا کمپنی کے مالک تھے جو کسی بینک کی مقرض ہو۔ نواز شریف یہ چاہتے تھے کہ اس قانون میں سے کنٹرول اور بل مالک کے الفاظ نکال دیے جائیں۔ جب یہ بات مگر ان کا مینڈیٹ رکھی گئی تو تمام وزیر و محضروں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ وزیروں کا خیال

تھا کہ نواز شریف بڑے لیڈر تھے لہذا ان کی یہ بات مان لی جاوے تاکہ وہ الیکشن لڑ سکیں جبکہ باقی وزیروں اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں اگر صرف نواز شریف کے لیے اس قانون میں تبدیلی کی گئی تو فاروق لغاری اور ان کی مگر ان کا مینڈیٹ کی سادہ برے طریقے سے غراب ہوگی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف خود اس حکم سے برے طریقے سے متاثر ہوں گے۔ نواز شریف کا جواب سن کر شاہد حامد حیران رہ گئے۔ نواز نے انہیں بتایا کہ دراصل اس حکم سے انہیں ذاتی طور پر تو کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اگر اسے نہ بنایا گیا تو چوہدری شجاعت حسین الیکشن نہیں لڑ سکیں گے۔

صدر لغاری نواز شریف کی اس درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور "اصولوں کی بنیاد" پر ان تمام لوگوں کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی جو ان کمپنیوں یا ملوں کے مالک تھے جن کے ذمے بینکوں کے کروڑوں یا ارب روپے کے قرضے واجب الادا تھے۔

الیکشن ہو گئے تھے۔ نواز شریف وزیراعظم بن چکے تھے۔ 58-2b کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ شاید اب سیاسی انتشار ختم ہو چکا ہے۔ تاہم، کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ صدر لغاری کے نواز شریف سے بھی عدلیہ کے مسئلے پر اسی طریقے کے اختلافات شروع ہونے والے تھے جیسے کہ بینظیر بھٹو سے ہوئے تھے جو پیپلز پارٹی حکومت کی برطرفی پر جا کر ختم ہوئے۔ دھیرے دھیرے فاروق لغاری کو یہ احساس ہوتا شروع ہو گیا کہ نواز شریف بھی ہمارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہ رہے تھے۔ وہ اختلافات جو دراصل وزیراعظم نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان شروع ہوئے تھے اس کی لپیٹ میں فاروق لغاری بھی آ گئے حالانکہ شروع میں فاروق لغاری کا ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نواز شریف اور سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب وزیراعظم نے ملک بھر میں انٹی میزارسٹ کورس بنا کر عدلیہ کے سامنے ایک نیا ادارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سجاد علی شاہ نے نواز شریف کو بتایا کہ وہ نئی عدالتیں نہ بنائیں کیونکہ موجودہ قوانین کے تحت بھی دہشتگردوں کو سزا دی جاسکتی ہے۔ ابھی اس مسئلے کی گرد نہیں بیٹھی تھی جب سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد پر ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ نواز شریف لاہور ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کرنے کے خلاف

[illegible][illegible]

حضرت علیؓ کا بیٹا اس وقت گویا ہاتھ میں کریمہ کاٹا ہوا انھوں نے ایک ہاتھ میں حقیر
 کی طرح سر جھکا رکھا اور جو کہ اس وقت قادیان کے امیر تھے ان کے پاس گئے کہ مجھے میں تمہارا
 یہ ایک سونے کی انگلی مل گیا ہے اس طرح اس کا حال معلوم ہوا کہ اس سے اس وقت قادیان ہی میں
 تھوڑے سے علاقے میں تھی۔

[illegible]

نواز شریف اور شایبہ خانہ کو اس وقت اسلام آباد میں لگا کر یہ بات سن کر غارِ روقی تقاری نے ان کے حشر پہ کہا کہ ہاں مجھے علم ہے کہ نواز شریف ان لوگوں پر کام کرتے رہے تھے۔ اسی وجہ سے آج انہوں نے اپنے بیٹے جسٹس کے خلاف جہاد کر دی ہے۔

میں نے شاہ جہاں کو لاوا اور اس سے بچھا کر اس ہاتھوں میں کئی صدقات بھی کرنا شروع کر دیے
تو وہ بڑے شکر مند بن گئے اور اس کے لئے کوششیں کرتے رہے۔

شاہد عالم اپنا تک بیچیدہ ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں نوادر شریف نے کسی جگہ کو کوئی پیسہ نہیں دیا ہے۔ وہ ان تمام ملکوں کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ انہوں نے سہ ماہی شاہ کے خلاف بغاوت کیوں کی تھی۔ سارا کام کوئٹہ سے شروع ہوا تھا جہاں تین جگہ کام

120

[illegible]

یہ بات بھی اعلیٰ سطح تک ضروری تھی اور میں نے شاید حکمت سے یہ جواب دیا کہ یہ بات عام فاضل
عالم کی کھوشیوں میں آ رہی تھی اور انہوں نے تو لاشریف کے کہنے پر کھڑی ہو کر یہ
گفت کے بغیر سوئے گا کو بیٹھ بیٹھ کیوں نہیں دیکھ لیا۔

مشابہ حامد نے میرے سوال کے جواب میں ایک اور کہانی سنائی۔ ان کے قول فاروق لغاری کے دل میں نواز شریف کے خلاف اب نفرت بھر چکی تھی۔ وہ نواز شریف کے ساتھ حویہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فاروق لغاری اب یہ سوچ رہے تھے کہ نواز شریف کی باتیں ماننے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ استغنیٰ دیکر گھر چلے جائیں۔ تاہم، جب فاروق لغاری کے بچوں کو اور ان کے دوستوں کو یہ علم ہوا کہ وہ استغنیٰ دینے والے ہیں تو سب نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی۔

پہریم کورٹ کے ججوں کا یہ خیال تھا کہ شاہد حامد فاروق اللہاری کے بہت زیادہ قریب تھے لہذا وہ ان سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ پہریم کورٹ کے جج کیا پہنچتے تھے۔ ان تمام ججوں نے شاہد حامد پر ایک بات واضح کر دی تھی کہ وہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے اندر کام نہیں کریں گے۔ یوں جب فاروق اللہاری نے نواز شریف کے مطالبے پر ان سے رائے مانگی تو شاہد حامد نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ سجاد علی شاہ کی پھلتی کرادیں۔

ہزل جہا نگیر کرامت بھی چپ کر کے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ وہ بھی صدر اور وزیر اعظم کے

درمیان بیٹے ہوئے اختلافات کی کہانیوں سے ہا خیر تھے۔ ایک دن جزل جہاگیر کرامت نے شاہ حامد کو فون کیا اور ان سے ان دنوں کے بارے میں قانونی رائے مانگی جنہوں نے سہادہ علی شاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ شاہ حامد نے جہاگیر کرامت کو وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ دس بجوں کی بغاوت کے بعد سہادہ علی شاہ کو اب گھر جانا ہوگا۔ شاہ حامد کی بات سن کر جہاگیر کرامت نے کہا کہ بی ایچ کیو کی لیگل برانچ نے بھی انہیں یہی رائے دی ہے کہ سہادہ علی شاہ کو اب جانا پڑے گا۔

قاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان اختلافات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ چیف جسٹس سہادہ علی شاہ ان کی جس انداز میں توہین کر رہے ہیں اس کے پیچھے قاروق لغاری کا ہاتھ ہے جبکہ قاروق لغاری کا یہ خیال تھا کہ نواز شریف اور جہاگیر بھٹو کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ دونوں عدلیہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔

نواز شریف نے آخر ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ قاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لا کر ان کی صدارت سے چھٹی کرانیں گے۔ جب شاہ حامد کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھاگے بھاگے چوہدری نثار اور شہباز شریف کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ وہ لغاری کے ساتھ یہ سلوک نہ کریں۔ تاہم شاہ حامد یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ جزل جہاگیر کرامت کی بات سنی گئی جنہوں نے قاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر گھر جانے سے بچالیا اور بات لغاری کے استعفیٰ ختم ہو گئی۔

قاروق لغاری کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف نے جنوں پر کام کیا تھا لیکن شاہ حامد کو یہ بات کچھ نہیں آتی تھی کہ بعد ایک ہی وقت میں ایک شخص دس بجوں پر کیسے کام کر سکتا تھا۔ ان کے خیال میں لوگ یہ بات کیل بھول جاتے تھے کہ باقاعدہ ایک فن کورٹ منعقد ہوتی تھی اور سب سے سینئر جج نے اس کی صدارت کی اور حلف لیٹے کے وقت سہادہ علی شاہ کو جتایا گیا تھا۔

جب جہاگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ قاروق لغاری استعفیٰ دینے والے ہیں تو انہوں نے انہیں اس بات سے منع کیا۔ قاروق لغاری نے نواز شریف کو بیچہ م بھیجا کہ وہ حکم سہادہ کو اس ملک کا قائم مقام صدر بنادیں جن کا خیر چیف جسٹس سہادہ علی شاہ کو جانے کی سہی نہ دیا کرتے وقت دستبرداشت نہیں کرے گا۔

قاروق لغاری کے ایمان صدر جس آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے شاہ حامد بولے کہ استعفیٰ اپنے سے کچھ دن قبل قاروق لغاری نے ان سے قانونی معاملات پر مشاورت بند کر دی تھی۔ اب اس نے کام کا فریضہ ان کے لئے دوست خواجہ طارق رحیم اور شہزادہ جہاگیر ادا کر رہے تھے۔

شاہ حامد نے گہری سانس لی اور کہا کہ اگرچہ چیف جسٹس کو ہٹانے کے معاملے پر وہ اپنے دوست قاروق لغاری کے ہم خیال نہیں تھے لیکن ان کے خیال میں لغاری کو استعفیٰ نہیں دینا چاہیے تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور سوال آیا اور میں نے تھپتھپائی کے ماحول میں بڑھتی ہوئی فضا کے درمیان شاہ حامد سے پوچھ لیا کہ جب ان کے دوست قاروق لغاری استعفیٰ دے رہے تھے تو کیا یہ ان کی بھی اخلاقی ذمہ داری نہیں بنتی تھی کہ جو شخص انہیں اتنا اوپر لے آیا تھا، جب وہ کسی صحیح یا غلط وجہ سے استعفیٰ دے رہا تھا تو انہیں بھی اپنے دوست کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر شاہ حامد نے بھی قاروق لغاری کی ذوقی ہوئی کشتی میں بیٹھنے کی بجائے نواز شریف کے جہاز میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا چہتا ہوا اور تلخ سوال سن کر شاہ حامد نے انکشاف کیا کہ جس دن قاروق لغاری نے صدارت سے استعفیٰ دیا تھا اس دن دوسرے صوبائی گورنروں کی طرح انہیں بھی لاہور سے بلایا گیا۔ نواز شریف نے بڑی تفصیل سے ان سب لوگوں کو وہ حالات و واقعات بتائے جن کی وجہ سے قاروق لغاری کو آج استعفیٰ دینا پڑ گیا تھا۔ نواز شریف سے ملنے سے پہلے شاہ حامد ایئر پورٹ سے اترنے کے بعد سیدھے آرڈی چیف جہاگیر کرامت سے ملنے گئے جہاں انہوں نے بیٹھ کر اس نئی صورتحال پر سیر حاصل کشتی کی۔ اس کے بعد وہ سیدھے نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ جب گورنر سے نواز شریف کی بیٹگ ختم ہوئی تو شاہ حامد نے چپکے سے اپنی جیب سے استعفیٰ نکالا اور نواز شریف کے حوالے کر دیا۔

تاہم نواز شریف نے شاہ حامد کو کہا کہ وہ گورنر پنجاب کے طور پر کام کرتے رہیں۔ نواز نے شاہ حامد کو بتایا کہ وہ انہیں گورنر پنجاب کی پوزیشن سے اس لیے بھی نہیں ہٹائیں گے تاکہ کہیں یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ قاروق لغاری کے آدمی تھے لہذا ان کی بھی چھٹی کرادی گئی۔

جب نواز شریف نے شاہ حامد کا استعفیٰ مسترد کیا تو انہوں نے وزیراعظم کو قاروق لغاری سے الگ ہونے والی بیٹگ کے بارے میں بتایا جو انہیں ابھی جا کر کرنی تھی۔ یہ سن کر نواز شریف نے شاہ

عالم کو کہا کہ وہ ساجی سدا کوہا کہ ان کا خیر سگالی کا بیٹا ہے یہی اور ان سے بڑھیں کہ ان کے اسماعیلی کے بعد
وہ ان کے لیے کہا کر سکتے ہیں۔ شام عالم مسکرائے کیونکہ انہیں بلوچ سردار کی ایک ذاتی کمزوری کا پتہ تھا
پتا پتہ اور شریف سے پوچھا کہ کیا وہ غازی کو اس بات کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ وہ دیرہ غازی
خان کی مقامی سیاست کے کاغذ پر رہیں گے اور وہ جیسے چاہیں گے دیرہ غازی خان کی انتظامیہ ان
کے اداروں پر مسلط کی۔

نور شریف مسکرائے اور شاہد حامد کو کہا ہاں اگلے آپ انہیں یہ گارنٹی دے دیں۔
شاہد حامد اگلے دن قاروق عھاری سے ملے اور انہیں یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ اپنے علاقے میں
داخلی کی طرح ایک گاؤں قاروقین کے مقامی سیاست دانہ قبیلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ شاہد حامد نے قاروق
عھاری کو یہ بھی آفر کی کہ وہ مشغلی دینے کو تیار ہیں تاہم قاروق عھاری نے انہیں منع کر دیا۔

میرے دل میں چھوٹی شجاعت کی وہ بات موجود تھی کہ نواز شریف نے ایک بڑی ہائی لیول میٹنگ میں بیٹھ کر ایک ریفرنڈم کر لیا تھا جس کے بعد پنجاب کے صوبوں میں خصوصاً لاہور کے عدالت نقل شروع ہو گئے تھے۔ شہباز شریف وزیر اعلیٰ اور شاہد حامد ان دنوں گورنر تھے۔ میں نے شاہد حامد سے پوچھا کیا کہ ان دنوں پولیس کے ہاتھوں لاہور کے عدالت ہاؤسز کیوں شروع ہو گئی تھیں۔ میرا سوال سن کر شاہد حامد سمجھو ہوئے اور انہوں نے شہباز شریف کی پالیسی کو فیصلہ کن شروع کیا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بتایا کہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں دہشت گردی کا جن قسم کرنے کے لیے اس طرح کے اقدامات کیے جاتے رہے ہیں، مثلاً 1982ء میں فرانس میں ایک عظیم Rally دہائی گئی تھی جس کا کام اس طرح کے دہشت گردوں کو قسم کرنا تھا۔ یہی کام کینیڈا میں کیا گیا۔ یہ دیکھ کر آپ نے بھی آئرلینڈ، ری پبلک آئرلینڈ کی قرینٹ کے ساتھ اسی طرح کے اقدامات کیے۔ 9/11 کے بعد اب امریکی حکومت بھی نعرہ زام کوکا کوکا کرنے کے لیے یہی کچھ کر رہی تھی۔ شاہد حامد کے بقول کبھی کبھار کسی ریاست کو اپنی جہاد کے نام پر قانون سے ماوراء ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔

تھیا گئی کی سر دلوں سے پھاڑا ہوں ہاں شام داخل رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ وقت توڑا رہ گیا ہے اس لیے میں نے بی بی سے کہنی سے شام عام سے یہ پوچھ لیا کہ انہوں نے نواز اور شہباز شریف کو اپنے دوست فاروق اعجازی سے مل کر اہمیت دی تھی لیکن پھر بھی ان دونوں بھائیوں نے کچھ کرے

124

عبدالغنی صاحب کی گورنمنٹ سے ملا دیا تھا۔

شاہد حامد نے گھبرا سانس لیا اور اشارہ کیا کہ شاہد اب ان دونوں شریف بھائیوں کی نگاہ میں
ان کی اہمیت قائم ہو گئی تھی۔ انہوں نے ان سے جو کام لینا تھا وہ لے چکے تھے۔ ایک دن نواز شریف کے
پائل پیکراری سعید مہدی کا انہیں فون آیا۔ انہوں نے فون بند کیا۔ اپنا سامان اٹھا لیا اور صوبہ فتحی تارکو
جسٹس لکس کر کے گورنر ہاؤس سے نکل گئے۔

میں نے بھی نہیں پوچھا۔ شاہد حامد نے بھی نہیں بتایا کہ سعید مہدی نے انہیں فون پر کیا کہا تھا۔
 اور شریف سے اتنا بھی نہیں ہار سکا کہ وہ خود فون کرتے اور شاہد حامد کو یہ خبر سنا دے کہ اب میں کا رول ختم
 ہو چکا ہے لہذا وہ مگر جائیں۔

شاہ حامد کی آواز میں خسرو کی محسوس کر کے میں نے بات تبدیل کرنے کی کوشش کی اور ان سے پوچھ لیا کہ کیا 12 اکتوبر 1999ء کی ہنگامات کے بعد ان کی نواز شریف سے کبھی ملاقات ہوئی۔ شاہ حامد نے ابتداً سر ہلایا اور کہا کہ ہاں ایک دن رتنزادہ سپریم کورٹ کے دفتر میں نواز شریف سے سامنا ہو گیا تھا۔ انھیں سپریم کورٹ میں جنرل مشرف کے حکیمانہ مداخلت کیس کے سلسلے میں لایا گیا تھا۔ نواز شریف کو اپنی حالت میں دیکھ کر شاہ حامد کو یہ احساس ہوا کہ ان کے بقول یہ نواز شریف کی زندگی کے چند اہم حالات میں سے ایک تھا۔ اس کے بعد ایک دفعہ نواز سے ان کی ملاقات جہدہ میں ہوئی۔

میں نے ہمارے لئے کی کوشش کی اور شاہد حامد سے پوچھا کہ قادیان کھاری کی سیاست آج سے پانچ سال بعد 2008ء میں کیسی ہوگی۔

شاہ حامد نے پھر اپنی بات دہرائی کہ قادیانیوں کو استغفری نہیں دینا چاہیے تھا کیونکہ ان کے ہاتھ کی جھ سے پہرہ اسلم غیر متوازن ہوا۔ شاہ حامد اس بات پر بھی خوش نہیں تھے کہ قادیانیوں کو ملک کا مسودہ بنے کے بعد ایم پی اے یا ایم این اے کا الیکشن لڑنا چاہیے تھا۔ جسے سال گزارنے کے بعد شاہ حامد اس بات سے بھی ناخوش تھے کہ انہوں نے پیپلز پینٹ حکومت کے بعد جو مگر ان کی جگہ چلی تھی اس میں لیے گئے وزیروں کا انتخاب بھی درست نہیں تھا۔ جن لوگوں کو وزیر بنایا گیا تھا وہ لوگوں کی اوقات پر ہر انکس اتارے۔ شاہ حامد کہہ رہے تھے کہ جسے سال پوچھنے میں گزارنے کے بعد آپ اگر انکس پر موقع دیا جائے کہ وہ فی کاؤنڈے جائیں تو 1996ء کے برعکس وہ اپنا وہ پھر لوگوں کی فہرست چار کر

نہیں تھے۔

شاہ جلد بھی ماضی میں گم ہوئے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ وہ فاروق لغاری کے لیے اور کیا کر سکتے ہیں۔

میں نے ان سے پھر پوچھا کہ کیا ابھی فاروق لغاری نے ان سے کوئی ٹھکر کیا تھا کہ وہ دوستوں کے تھے لیکن ضرورت لانے پر انہوں نے ساتھ نواز شریف کا دیا تھا۔
وہ نے کہیں فاروق لغاری نے اس طرح کی شکایت بھی نہیں کی۔

آخر تصدیق پر تمام بات آتی تھی۔ میرے تمام سوالات ختم ہو گئے تھے۔ تاہم میں نے جاننا چاہا کہ ایک آخری سوال ابھی پوچھ کر رکھا ہو گا۔ میں جاننے سے پہلے شاہ جلد سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ان کے دل میں ابھی کیا ہے تو کم از کم میرے متوجہ شدہ کوئی فرق نہ پڑے۔ میں نے شاہ جلد سے پوچھا کہ ان کو یہ سب بتا دینا کہ شاہ جلد نے کتنی اپنے سیاسی مفادات کے لیے اپنے چالیس سال پرانے دوست فاروق لغاری کی بیٹی سے بھروسہ کر لیا تھا۔

میرے اس حیرت انگیز سوال کو اگر شاہ جلد کا جواب دینا چاہتا ہے تو اس کے لیے وہ اس سے ہم آہنگ نہیں ہونے چاہتے۔ اپنے آپ کو سچا اور سچا کہتا ہے کہ جب نواز شریف کے جیسے کائنات میں علم ہوا کہ وہ فاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے لیے صدارت سے ہٹا دیا ہے۔ یہ تو میں نے نواز شریف کے اس منصوبے کی جلدی شروع کر رکھی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ نواز شریف پھر بھی یہ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں جانتا تھا کہ فاروق لغاری سے ملنا اور ان سے ملنا کہ اس مشکل وقت میں ان کے ساتھ ہوں۔ اگر نواز شریف فاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لے کر آتے تو وہ فوری طور پر گھر نہ بچناپ کے عہدے سے استعفیٰ دے کر اپنے دوست فاروق لغاری کے گھر میں کران کا کس لڑتے۔

میں نے اپنے دوست کو کوئی دھوکا نہیں دیا تھا۔

اسحاق ڈار

اس واقعے کے تقریباً چار سال بعد اسحاق ڈار نے مجھے بتایا کہ میں نے احمد انور پریشان پستھا اس سٹیٹ کے شریک بنوا دیا۔ ایک کر کے مجھے بتائے تھے کہ وہ کمر بھڑکتے ہوئے دیکھتا تھا۔ میں اس کے لیے ایک وفاقی وزیر بن گیا۔ بلکہ حیرت انگیز شرف کا حقدار بننے والا تھا جسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔
اسحاق ڈار بھی ان چند گئے چنے سیاستدانوں میں سے ایک تھے جو ایک قلم میں حیرت انگیز شرف کے آئینہ پر قید میں رکھے گئے۔

ان دنوں اسحاق ڈار کے بیٹے کی سنگتی نواز شریف کی بیٹی سے تیار ہوا۔ میں نے ان دنوں باتوں میں محسوس کیا کہ اسحاق ڈار کے پاس جو اس ملک کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہے تھے بہت سارے راز ہیں اور مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ وہ ان رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھے۔ باقی تو چھوڑیں، وہ یہ بات بتانے کے لیے بھی پہلی دفعہ تیار ہوئے کہ نواز شریف اور حیرت انگیز شرف کے درمیان پاکستانی جیل چھوڑ کر جدہ کے سرور مجلس میں رہنے والی ذیل کی اصل کہانی کیا تھی؟
ان دنوں سے ہم بعد میں پردہ اٹھائیں گے۔ پہلے آپ کی ملاقات اس اسحاق ڈار سے کراتے ہیں جب وہ ابھی سیاست میں نہیں آئے تھے۔ اسحاق ڈار کے ایک عام چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے پاکستان کے سب سے طاقتور وزیر خزانہ اور ابوظہبی کے حکمران شیخ النہیان کے ایڈوائزر بننے تک کی کہانی بھی ایک

ایک روپہ ہوتا ہے جس سے آپ اور کے اندر بھی غمینیات کا آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔
 بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اسحاق ڈار اور نواز شریف جو دونوں کشمیری ہیں۔
 گورنمنٹ کاٹھماوند میں 1984ء میں ملاں چلا گئی تھی۔ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو انہوں نے
 ان کی رہائی سے تصدیق رکھنے والے اپنے اس کھان قبضہ کو واپس آف انوسٹ کا فیئر مین لگا دیا۔ جب تمام
 اسحاق خان نے 1989ء میں نواز شریف کی حکومت پر طرف کی تو انہوں نے اسحاق ڈار کو یہ پیشکش کی کہ
 وہ اپنے عہدے پر کام کرتے رہیں۔ ایک ارادہ اقبال کے مالک کو یہ پیغام دیکھان کے پاس بھیجا گیا لیکن
 اسحاق ڈار نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔

نواز شریف کی برطرفی کے بعد اسحاق ڈار نے سیاست کو باقاعدہ جان کر لیا۔ 1993ء میں
 لاہور میں ہونے والے ہائی الیکشن میں انہوں نے ایم این اے کی سیٹ جیتی۔ سیٹ اس وقت جیتی جب
 اسلام آباد میں جنرل یحیٰی خان اور مہاراجہ میں ان کی پارٹی کی حکومت تھی۔ انہیں نواز شریف سے صلہ
 کرنے کے لیے ایک وقتی وزیر کو ان کے پاس بھیجا گیا اور اس کے بدلے میں بہت ساری پیشکشیں کی
 گئیں۔ ان کے اظہار پر پٹنہ پارٹی کو بڑا فائدہ آیا۔ ان کے خلاف الیکشن ٹریبونل میں ایک پینشن فائل کر
 کے انہیں اس بات پر اس کو ایٹھائی قرار دے دیا گیا کہ وہ بورڈ آف انوسٹ کے چیئرمین ہونے کے
 باوجود دو سال تک الیکشن لڑنے کے اہل نہیں تھے۔ تاہم بعد میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک جج
 نے اسحاق ڈار کے حق میں یہ کہہ کر فیصلہ دیا کہ کوئی بھی شخص اگر کسی سرکاری عہدے پر بغیر تنخواہ اور
 مراعات لیے کام کرتا ہے تو اس پر دو سال کی شرط لگائی نہیں ہوتی۔ کئی برسوں بعد سپریم کورٹ کے ایک جج
 نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ انہیں آصف زرداری کے پریشر پر الیکشن ٹریبونل سے اس کو ایٹھائی کر لیا گیا تھا۔
 نواز شریف کو اسحاق ڈار کی یہ ادا دینی پسند آئی۔ یہی وجہ تھی جب 1997ء میں وہ دو تہائی
 اکثریت سے جب دوبارہ اقتدار میں آئے تو انہوں نے ڈار کو اپنا وزیر تھارت مقرر کر دیا۔ وزیر ہفتے ہی
 ڈار نے ان پانچ وجوہات کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا جو سیاسی حکومت لوگوں کو رشوت کے طور پر استعمال کر
 کے اقتدار میں اپنے دن گزارنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کے نزدیک وہ پانچ چیزیں جو رشوت کے
 طور پر استعمال کی جاتی رہی تھیں ان میں وزیراعظم کا صوابدیدی اختیار کہ وہ کسی کو بھی پلاٹ لٹ کر سکتے
 تھے، ٹیکسٹائل کوٹنے میں صوابدیدی اختیارات، صدر، وزیراعظم، آر پی جی اور گورنرز کا ڈیوٹی فری

مہینہ سپورٹ کرنے کا اسحاق ڈار اسٹیٹ بینک سپورٹ پر شس اور کیش ایچ پیسٹ مگر شس شامل
 تھیں۔

اسحاق ڈار نے سب سے پہلے ٹیکسٹائل کو تسلیم کیا۔ مرسینہ جگہ کیوں کی ڈیوٹی فری سپورٹ تسلیم
 کر دی گئی اور ساتھ ہی سپورٹ ایکسپورٹ اسٹاکس پر شس بھی بند کر دیے گئے۔ حرس کی بات یہ ہے کہ
 ان کے اس فیصلے کا اسحاق سب سے پہلے اس وقت کے صدر رفیق تارڑ اور آر پی جی جیل پرویز
 شرف پر ہوا مگر ان سے پہلے جو بھی اقتدار میں آیا اس نے ڈیوٹی فری گاڑیاں ضرور منگوائیں۔ بقول
 ڈار کے نواز شریف نے دونوں دفعہ وزیراعظم ہونے کے باوجود ڈیوٹی فری گاڑیاں نہیں منگوائیں۔
 جونہی اسحاق ڈار نے صوابدیدی اختیارات کے تحت ٹیکسٹائل کوٹنے کو تسلیم کیا ان سے طاقتور سیاستدان
 ایم این ایز اور وہ بزنس مین ناراض ہو گئے جو ماضی میں ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ پہلی
 دفعہ ملک میں ٹیکسٹائل کوٹنے کی الاؤنسٹ نیلامی کے ذریعے کی گئی اور 3.3 بلین روپے میں یہ کوٹنے بیچے
 گئے جبکہ بینظیر بھٹو کے دور میں ان کوٹوں سے صرف 73 کروڑ روپے کمائے گئے تھے۔

جونہی ڈار کے اس فیصلے کا لوگوں کو پتہ چلا تو وہ دوڑے دوڑے نواز شریف کے پاس گئے اور ان
 کے خلاف شکایتوں کا ایک انبار لگا دیا گیا۔ تاہم نواز شریف نے اسحاق ڈار کو کھل کر سپورٹ کی اور یوں
 1998-99ء میں آنے والی ٹریڈ پالیسی کے ذریعے سیاست میں کوٹوں کی کرپشن کو ختم کر دیا گیا۔

ایک دن نواز شریف نے اسحاق ڈار کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ انہیں سر تاج عزیز کی جگہ ملک کا
 نوازیر خزانہ مقرر کر رہے ہیں۔ اسحاق ڈار کے لیے یہ ایک نئی خبر تھی۔

میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر نواز شریف نے سر تاج عزیز کو ہٹا کر ڈار کو وزیر خزانہ
 لگانے کا فیصلہ اپنا تک کیوں کر لیا تھا۔

اسحاق ڈار نے دھیرے دھیرے ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا تھا جن کی تلاش
 میں میں ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔

جس دن پاکستان نے مئی 1998ء میں نیوکلیر ٹیسٹ کیے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مالی
 معاملات بگڑنا شروع ہو گئے۔ اس وقت کی معاشی مہم کے لیے عالمی اداروں کی طرف سے لگائی گئی
 پابندیاں کے بعد معاملات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ جس دن پاکستان نے نیوکلیر ٹیسٹ کا تجربہ کیا اس

Handwritten text in Urdu script, likely a continuation of the letter or a separate note.

اور کہ جو کہ چھوٹی دکانوں پر لکھ دیا جائے کہ وہاں کہ جس کے پاس وہ لکھ دیا جائے

میں ان باتوں سے زیادہ اس صاحب سے یہ پوچھنے کے لیے بہت میں تھا کہ آخر اس وقت یہ فیصلہ کس نے کیا تھا کہ جٹوں میں سید محمد پاکستانیوں کے خلاف کرنسی اکاؤنٹس کو فریڈ کر لیا جائے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس سے نواز شریف کی کریڈیٹبلیٹی پاکستان اور پاکستان سے باہر حمایت برے طریقے سے قرب ہوئی کیونکہ لوگوں کے خیال میں نواز شریف حکومت نے ان کی بیجوں پر دن و سارا دن

دار نے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز شریف حکومت کا یہ فیصلہ غلط تھا لیکن ان کا اس فیصلے میں ذاتی طور پر کوئی کردار نہیں تھا۔ جس دن نواز شریف بم کا قہر پہ کیا گیا اس دن نواز شریف نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی ساز سے گیارہ بجے کے قریب پرائم منسٹر ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے تھے لہذا انہیں اس فیصلے کا پتہ بعد میں چلا جب انہوں نے صبح کے اخبارات پڑھے۔ باقی باتیں تو چھوڑیں، اکائیڈ کے ممبران کو بھی یہ فیصلہ کرنے سے پہلے احواز میں نہیں لیا گیا تھا۔ دار نے اس بات کا انکشاف کیا کہ دراصل یہ فیصلے کرانے کے اسے دار اس وقت کے گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب، سیکرٹری فنانس معین افضل اور پانک ڈویژن کے اپنی ڈیپارٹمنٹ حیدر پاشا تھے۔ ان سب نے مل کر نواز شریف اور سر تاج عزیز کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ فارن کرنسی اکاؤنٹس کا طریقہ کار بہت ضروری ہے۔

میرے چہرے پر تاثرات دیکھ کر اسحاق وار نے فوراً کہا کہ اس میں سر تاج عزیز کا اتنا زیادہ

۱۔ اگر کسی شخص نے کسی اور شخص کو
 ۲۔ اگر کسی شخص نے کسی اور شخص کو
 ۳۔ اگر کسی شخص نے کسی اور شخص کو
 ۴۔ اگر کسی شخص نے کسی اور شخص کو
 ۵۔ اگر کسی شخص نے کسی اور شخص کو

[illegible]

دار نے کہا کہ وہ آٹھ ارب ڈالر کو پیش کر اسے اور کمر چس دیکھوں سے اور دار اسے چلتے۔ وہ
 تمام فورسز جو Dollarisation of economy میں مصروف تھے ان سے کہا جاتا کہ وہ اپنے دار
 پاکستانی روپوں میں تبدیل کر انیں اور اپنے اور دار انش بھی ایسے جسٹ کر انیں۔ اسے جس ارب ڈالر
 دار ان سمجھنا پرورد جو بینک اکاؤنٹس میں پڑا تھا انہیں بچ بھی نہ کیا جاتا۔ دار کے خیال میں یہ سہاری
 حکومت کے ان معاشی فیروز کی تھی کہ وہ سر تاج عزیز کو بھیج مسودہ تھال بتاتے، لیکن وہ اپنا کام کرنے میں
 لگا رہا۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ سرتاج عزیز کا اس میں زیادہ قصور نہیں تھا، لیکن مجھے ذرا یہ تو بتائیں کہ آخر اس نے بڑے سکرٹ فیصلے کی بجائے کچھ طاقتور لوگوں کو پیلے سے کیسے پہنچا گئی تھی کہ انہوں نے راتوں رات اپنے ٹیکوں سے ڈالر نکلا کر باہر شفٹ کر دیے تھے۔ ڈار صاحب بولے کیونکہ وہ اس وقت فنانس منسٹری نہیں چلا رہے تھے لہذا انہیں اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس طرح کی انفارمیشن کس طرح لیک ہوئی تھی۔ تاہم، ڈار صاحب نے کہا کہ یہ بات ضرور تھی کہ نواز شریف اس بات پر بڑے برہم تھے کہ ان معاشی ٹیم نے فارن کرنسی اکاؤنٹس فریز کرنا کر ان سے ایک بہت ہی غلط فیصلہ کرایا تھا۔ نواز شریف کی یہ برہمی ایک دن سرتاج عزیز کی فنانس منسٹری کی پوسٹ سے پھٹی پر جا کر ختم ہوئی۔ اگست 1998ء میں نواز شریف نے حفیظ پاشا کو سرتاج عزیز کی جگہ اپنا فنانس ایڈوائزر مقرر کر دیا۔ حفیظ پاشا سے بھی معاملات نہیں سنبھالے گئے اور ڈالر کی قیمت 67 روپے تک چلی گئی۔ مارکیٹ میں یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کہ دسمبر 1998ء تک ڈالر کی قیمت 100 روپے ہو

ہائے کی اور رات کی کھانسی سونہ چاہئے۔ چاند کوکے دروں روپے کو روپے سے بیکہ ملک
 عمل میں لائی کی طرف سے ہوا تھا۔ ایک دن نواز شریف نے اس صاحب کو بلایا اور کہا کہ آج سے وہ
 ان کے لئے دو لاکھ روپے کی رقم کے لئے اس میں حقیقت پاشا ہے۔ اس سے اسے پشیمان کیا گیا کہ اس نے اس
 سے۔ ۱۹۹۸ نومبر ۱۹۸۸ کو جب اسحاق ڈار کو پاکستان کا وزیر خزانہ بنایا گیا اس وقت پاکستان کے دارن
 ۱۹۸۸ صرف ۴۱۹ ملین ۱۹۸۸ تھے۔ دارن ان دنوں اس ملک کے وزیر خزانہ بنے تھے جب کوئی بھی
 کچھ اور نہیں تھا یہ پست پلے کی کوشش نہ کرتا۔ پاکستان کو فوری طور پر غیر ملکی ایئر لائنز، ملٹی بینک کمپنیز،
 بینک انٹرنیشنل اور انگریز کی مد میں دو ارب ۱۹۸۸ سے زیادہ کی ادائیگیاں کرنی تھیں۔ ان ادائیگیوں سے کسی
 طور پر بھی نہیں بچا جاسکتا تھا کیونکہ یہ ادائیگیاں جس ملک اور لندن ملک کے ساتھ قرضوں کی ہونے
 والی رہی تھیں ملک کے علاوہ تھیں۔ جب حقیقت پاشا وزیر خزانہ تھے تو انہوں نے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک
 کے ایک کسٹمر فیم کے ساتھ ۱۹۸۵ ملین ۱۹۸۵ کے قرضے کے لئے مذاکرات کیے تھے لیکن اس قرضے کے ساتھ
 جو شرائط رکھی گئی تھیں وہ اتنی خوفناک تھیں کہ ڈار کے لئے انہیں تسلیم کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ قرضے پر مارک
 اپ رینٹ مارٹ ۱.۵% سے ہٹ کر ۵% آتے گئے تھے۔ پاکستان سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے تین
 لاکھ ۱۹۸۵ ملین آئی ریٹرنسری انٹرنیشنل اور ملکی پیدا کرنے کے پائش قرضہ دینے والے بینک کے
 پاس گروی رکھوائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ خوفناک شرط یہ تھی کہ اس ۱.۵ ملین ڈالر کے قرضے میں
 سے ۱۲ ملین ۱۹۸۵ ملین اس کسٹمر فیم کے انجی مبران کو پہلے جانے تھے جو قرضہ دے رہے تھے۔ یوں
 درحقیقت پاکستان کے پاس صرف ۳۰۰ ملین ڈالر آئے تھے لیکن پاکستان پر اس قرضے کی معاوضہ میں
 مزید ۲۴۰ ملین ڈالر اضافہ ہوا۔

دار نے اس پر کافی غور کیا اور انہوں نے قسم اٹھا کر اس کا حق پر گیر بھری جس پر یہ
 ساری شرائط اور نا تھیں۔ دار نے ۱۲ ملین ڈالر کے قرضے کو ری ٹینڈ ونگ کرانے کے لئے مذاکرات
 شروع کیے اور جون ۱۹۸۸ میں اس کا سہا پہ ہو گئے۔

دار کے انتقال بعد سعودی شہنشاہ نے اسے نواز شریف کو سہا پہ کرتے ہیں۔ جو ملکی پاکستان
 سے لے کر کھینچ کر لیا تو سعودی عرب ۱۹۸۸ میں اس کا سہا پہ کر لیا اور اسے پارہ سہا پہ ہو گیا۔
 سعودی عرب سے اس کے بعد اسے صرف ایک شرط رکھی گئی کہ وہ بینک آئی ایم ایف یا مشنری

مراک کو اس بات کا پتہ نہیں چلتا چاہیے کہ سعودی عربیہ پاکستان کو ملت میں اسے رہا ہے کیونکہ ان
 حالات میں جب پاکستان پر پابندیاں لگ چکی تھیں سعودی عرب کے لئے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔
 سعودی عربیہ کی اس شرط کا پتہ صرف سات لوگوں کو تھا جن میں نواز شریف، سر تاج عزیز، اسحاق ڈار،
 حیدر شریف، حقیقت پاشا اور گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب بینک اور معین الفضل شامل تھے۔ ان ساتوں شخصیات
 سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ قومی مفاد میں اس راز کو راز رکھیں گے کہ سعودی عربیہ پاکستان کو دو ارب
 ڈالر سالانہ کالٹ جیل فراہم کر رہا تھا۔

ابھی اس بات کو ایک دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اسحاق ڈار کو جوان دنوں لندن میں
 نواز شریف کے ساتھ ستمبر ۱۹۸۸ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سیشن کو انٹینڈ کر کے واپس آ رہے
 تھے، گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب نے ٹیلی فون کیا اور جو بات انہوں نے اسحاق ڈار کو بتائی اسے سن کر وہ
 ایک لمبے کے لیے سن ہو کر رہ گئے۔ ڈار کو بتایا گیا کہ آئی ایم ایف کی جو فیم اسلام آباد میں مذاکرات کے
 لیے آئی ہوئی ہے اس کو فنانس مشنری کی فیم نے نہ صرف سعودی عربیہ کے دو ارب ڈالر سیکرٹ آئل کے
 بارے میں بتا دیا ہے بلکہ پاکستانی روپے کو ڈالر کے مقابلے میں چار سے پانچ روپے کم کرنے کی بھی
 منظوری دے دی ہے۔

یہ بات سن کر لندن میں موجود نواز شریف کا وفد سکتے میں آ گیا۔ نواز شریف نے اسحاق ڈار کو
 کہا کہ وہ فوری طور پر واشنگٹن جائیں جہاں حقیقت پاشا ایک فیم لے کر آئی ایم ایف سے دو بارہ مذاکرات کر
 رہے تھے۔ ڈار ایئر پورٹ سے اترتے ہی سیدھے آئی ایم ایف کے ایک انتہائی سینئر ڈائریکٹر کے پاس
 گئے جو پاکستان کے بھی خواہوں میں سے ایک تھے اور انہیں قسم دے کر پوچھا کہ آئی ایم ایف کو سعودی
 جس کے بارے میں کتنا کچھ علم ہے۔ پاکستان نے آئی ایم ایف کو یہ بتایا تھا کہ سعودی عربیہ نے یہ جیل
 پاکستان کو ایک طرح کے اصرار پر دیا ہوا ہے۔ آئی ایم ایف کے اس ڈائریکٹر نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ
 بلاشبہ اسے اس صاحب آپ کی فنانس مشنری کے لوگوں نے اسے اسلام آباد میں اس راز سے آگاہ کر دیا
 تھا آپ اپنے اصرار پر اس علم کے ساتھ نواز شریف کے پاس گئے۔

مگر اسے اسحاق ڈار سے پوچھا کہ ان سات لوگوں میں سے کس نے اسے اس راز کو راز رکھا؟
 انہوں نے کہا کہ اسے اسلام آباد میں بتایا تھا اسحاق ڈار نے مجھے اس علم کا پتہ دیا ہے کہ اسے

یہ ہے جسے آپ کو صرف ایک اشارہ دے سکتا ہوں کہ فوراً ۱۹۹۸ء میں اس وقت کے کونسلر ایڈوانسڈ
پاکستان پر ہونے والی فائنل میں انھیں کوہستان کرنے کی بجلی دی گئی۔

میں کافی دیر تک سلسلہ رہا کہ اسحاق ڈار کو یہ بتا دیا کہ وہ ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانے
کے لیے کہیں جیتے جاگتے ہیں انھیں نے اپنے ملک کے ۱۰۰ ارب ڈالر کے راز کو پتہ لگوں میں آئی ایم ایف
کو لے دیا تھا۔ میں یہ بھی سوچا ہوا تھا کہ کیسے مالی ادارے اپنے پاکستانی ایجنٹوں کے علاوہ اس کا
خیال رکھتے ہیں۔ وہی شخص جسے نواز شریف نے قومی راز افشا کرنے پر اس میں کیا تھا وہ مشرف حکومت
میں نیٹو کی جیل میں اس کے بعد سے رہا ہوا۔ آئی ایم ایف نے انھیں ان کا انعام دلوا دیا تھا۔

اداروں کی بدعتی ہوئی وقت نے اسحاق ڈار کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ سے F-16 طیاروں کی ریکی
ہوئی رقم کی ادائیگیاں کرانے کے لیے بل کھنٹن حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ 2 دسمبر 1998ء کو نواز شریف
بل کھنٹن سے وائٹ ہاؤس میں ملے۔ ان کے ساتھ سر تاج عزیز، اسحاق ڈار، شہباز شریف اور مشاہد
حسین بھی تھے۔ بل کھنٹن نے نواز شریف کو کہا کہ وہ F-16 کے باقی پیسوں میں سے ستر فیصد واپس لے
لیں۔ باقی تیس فیصد امریکہ اپنے پاس رکھے گا اور اس معاوضے کو ہمیں قسم سمجھا جائے۔ اسحاق ڈار نے
جب یہ آفر سنئی تو وہ تیس فیصد نقصان کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے بل کھنٹن سے کہا کہ سراجب یہ
خبر پاکستان پہنچے گی کہ امریکہ نے پاکستان کے F-16 طیاروں کی تیس فیصد رقم بغیر کسی وجہ کے رکھ لی ہے
تو اس کا کوئی اچھا اثر عام پر نہیں ہوگا کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بل کھنٹن اور نواز شریف اچھے دوست ہیں
اور ایک دوست دوسرے کے ساتھ اس طرح کی بات نہ کر سکتا۔

بل کھنٹن نے بڑی حیرانی سے اسحاق ڈار کی بات سنی اور پوچھا کہ امریکہ کی سپریم جوڈیشیل
کونسل نے انھیں جو ایڈوانس دی تھی اس کے تحت وہ اتنا کچھ انھیں آفر کر سکتے تھے اور اس سے زیادہ کا ان
کے پاس اختیار نہیں تھا۔ کھنٹن نے بتایا کہ ان کے پاس کافر نہیں میں بھی اکثریت نہیں تھی جہاں سے وہ
سپریم جوڈیشیل کونسل کے فیصلے کے خلاف پاکستان کو F-16 طیاروں کی سو فیصد رقم کی واپس کا فیصلہ کرا
دیتی۔

دار نے تجویز پیش کی کہ اس کا دوسرا مل یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو گندم اور کاربن کی بڑی
شد ضرورت ہے۔ ان دنوں حکومت پاکستان یہ دونوں چیزیں خریدنے کے لیے بینک رو کر رہی ہے لہذا

امریکہ نے ان دنوں بھی کسی معاہدے کے تحت پاکستان کو ملکی ضرورت دے سکتا ہے۔ آخر اس کا ملکی یہ بات
ان کے سامنے رکھ کر پاکستان کو ۱۴۰ بلین ڈالر کی گندم اور کاربن فراہم کرے گا۔

وزیر خزانہ جتنے کے بعد ڈار کا کردار بہت زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ ان کے پاس اس فوجی سامان کی
اداری کے معاہدے بھی آنے لگے جن کے لیے وزارت خزانہ نے ادائیگیاں کرنی تھیں۔ ایک دن
دار کو پتہ چلا کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت سوئٹزر لینڈ سے پانچ الٹی ایئر
کرافٹ گن لینا چاہ رہے ہیں جس کے ساتھ پاکستان کا ایک بہت بڑا پروٹوکول وہاں موجود ہے جس
سے وقت دونوں ممالک مشترکہ طور پر اپنی ایئر کرافٹ گن تیار کریں گے۔ اس معاہدے کی اہمیت اس لیے
ہی زیادہ تھی کیونکہ سوئٹزر لینڈ کے ایک مینوفیکچر نے حال ہی میں ترکی اور چین کے ساتھ اس طرح کے
معاہدے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پروٹوکول کے تحت اگر پاکستان اس مینوفیکچر کو پانچ الٹی ایئر
کرافٹ گن مینوفیکچر کرنے کا آرڈر دیتا تو وہ پاکستان میں بھی ان گنوں کی تیاری شروع کر سکتے تھے۔
اسحاق ڈار کا خیال تھا کہ اگر اس معاہدے کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں اپنی ایئر کرافٹ گنوں کی
تیاری شروع کر دی جاتی تو بڑے آرام سے اس فوجی اسلحے کو چین اور ترکی جیسے ملکوں کو ایکسپورٹ کر کے
کئی بلین ڈالر کمائے جاسکتے تھے۔ اسحاق ڈار نے سب سے پہلے سعودی عربیہ کے ساتھ بات کرنے کا
فیصلہ کیا۔ کراؤن پرنس عبداللہ اور ملائیشیاء کے وزیر اعظم مہاتیر محمد سے بات چیت کی گئی۔ ان دونوں نے
انتہائی مثبت جواب دیا اور کہا کہ اگر پاکستان میں اپنی ایئر کرافٹ گنوں کی تیاری شروع ہو گئی تو وہ یقیناً
پاکستان کو بلین ڈالر کے آرڈر دیں گے۔

جب ڈار نے یہ ساری بات چیت سعودی عربیہ اور ملائیشیاء سے شروع کی تو اس کے بعد
جہانگیر کرامت اب کسی غیر ملکی مینوفیکچر کو اپنی ایئر کرافٹ گنیں تیار کرنے کا آرڈر نہیں دے سکتے تھے لیکن
ساتھ ہی افسوسناک بات یہ ہوئی کہ جنرل جہانگیر کرامت نے ان گنوں کی تیاری کا آرڈر ہیوی میکیکل
کلیںس کو بھی نہیں دیا جس سے پاکستان کو اچھا خاصا نقصان ہوا کیونکہ ان گنوں کو سوئٹزر لینڈ کی مدد سے
تیار کر کے سعودی عرب، ملائیشیاء اور دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کیا جاسکتا تھا۔

میں ڈار سے پوچھنے کے لیے بے چین تھا کہ آخر کار گل آپریشن پر کون جھوٹا اور کون سچا تھا۔
نوسو ساچھ ماہ پہلے چوہدری شجاعت نے مجھے ہی ایک انٹرویو دے کر پاکستانی سیاست میں ایک نئی بحث

پہلے ہی جی کہ کارگل آپ بلیں کا دار و دار کون تھا۔ شہادت کے بقول جنرل مشرف نے یہ آپ بلیں
نواز شریف سے اہارت سے کر لیا تھا۔ میں نے یہ سوال اسحاق داری سے پوچھا کہ وہ اس وقت اس
جگہ کے دار و دار تھے وہ کارگل کی جنگ لڑی ہو رہی تھی۔

اور نے مجھے بتا دیا کہ ان کارگل کے بارے میں کچھ بہت کم پتہ تھا۔ وہ اس تمام حالات سے
۱۹۹۱ء میں اس وقت فوج اور پولیس لیا رہا تھا۔ وہ یہ تھے۔ مجھے اس بار سے میں بتانے سے
پہلے انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک جوڈیشیل کالوں والا ہائے میں کے ساتھ فوج اور تمام افسران
رہیں گے انہیں سن کر ہر ایک ایک انداز میں ہائے گا۔ اسحاق داری نے کہا کہ وہ ہمارے داروں سے ۷۰۰
ایں تھے جن کالوں وہ ہمارے صرف جوڈیشیل کالوں کو تھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس بار سے
معاہدے میں سب سے اہم بات جی کہ ۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف نے ایک دن اسحاق داری اور سرکاری
علاج کو اس وقت دار و دار تھے۔ جی ایچ کے ملاری آپ بلیں روم میں ایک بریک دی۔ اس کے
بعد انہیں ایک کھلی کی کھینکڑی تھی اور جن میں نواز شریف کی سربراہی میں ملحقہ کی گئیں جن
میں جنرل عہد ملک، راجہ ظفر الحق اور مشاہد حسین کے علاوہ اس کھلی کے مستقل ممبران نے بھی شرکت کی
میں میں آری چیف، انڈل چیف اور ایئر چیف بھی شامل تھے۔ سب یہ فیصلہ کیا گیا کہ نواز شریف 4
جہازوں کو فوری طور پر امریکہ جائیں گے جہاں وہ مل فائن سے ملاقات کر کے بھارت سے متوقع ایک
بڑی جنگ کو روکنے کی کوشش کریں گے تو اس سارے معاہدے پر گفتگو کے لیے دو اہم مہنگی گئیں۔

اور کے لیے میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف صرف فوج کو بچانے کے لیے امریکہ گئے
تھے۔ جنرل مشرف برقیہ پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کارگل سے پیدا ہونے والی صورتحال کو
سننے کے لیے امریکہ کی دعوت پر تھے۔

میں نے کہا کہ اگر صاحب ایہ بات تو بعد میں کریں گے۔ پہلے یہ بتائیں کہ کیا نواز شریف کو
کارگل آپ بلیں کے بارے میں پہلے ان سے پتہ تھا یا نہیں۔

اور نے بڑی جی سے کہا ہر گز نہیں!

اور نے باقی بات تو پھر دہرائی جی کہ فوج کے کمانڈر راجہ ظفر اور جنرل چیف کو بھی کارگل
آپ بلیں کی جنگ نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ نواز شریف کو بھی پہلے راجہ ۱۶ مئی کو اس آپ بلیں کے بارے

میں اطلاع دی گئی تھی۔

اور نے انکشاف کیا کہ کارگل آپ بلیں شروع کرنے سے کئی ماہ پہلے مگر وہ میں ایک بریک
اتھام کیا گیا تھا جسے کسی صورت میں بھی نواز شریف سے کارگل آپ بلیں کی منظوری قرار دیا جائے گا۔
کارگل آپ بلیں کو بطور کسی جاری اور ملحد ہادی کے جنرل مشرف نے شروع کیا۔ پاکستان کی اعلیٰ سیاسی
قوت سے صرف اس وقت رابطہ کیا گیا کہ سب کارگل آپ بلیں کی خبریں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ خیال لیجیے
سب سے کہا گیا کہ سب کو ملے راستہ نکال کر ان کی مدد کی جائے۔ جنرل مشرف سے ایک بریک مل گئی
اور ان سے نواز شریف نے پہلا اعلیٰ سوال یہ کیا کہ جنرل صاحب اپنی آپ بلیں کے بارے میں کیا کہیں گے آپ نے
مجھے اس آپ بلیں کے بارے میں کچھ نہیں بتا دیا تھا۔

اور نے کہا کہ نواز شریف صرف اور صرف جنرل مشرف کی اعلیٰ درخواست اور اسرار پر امریکہ
گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نواز شریف کو نوڈ چھوڑنے کے لیے لاہور اور پاکستان پر وہ جہاز تھے۔ نواز شریف
نے انتہائی سنجیدگی اور غلوں سے فوج کی عزت بچانے کی کوشش کی تھی۔ نواز شریف ان تمام بین کو بھی
بھانا چاہتے تھے جو کارگل کے حوالہ پر لارہے تھے۔ ہاتھیں کرتے کرتے اسحاق داری پاک فک رگ گئے۔
انہوں نے کہا کہ اگرچہ انہیں اس بار سے میں بہت کچھ علم تھا لیکن وہ کارگل پر اس سے زیادہ گفتگو نہیں
کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ باقی باتیں وہ کسی جوڈیشیل کمیٹی کے سامنے کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح
کے راز اگر اس طرح افشا کیے گئے تو شاید پاکستان کے مفاد میں نہ ہوں۔

میں نے کہا دار صاحب ایہ تو بتائیں کہ جنرل مشرف کو آری چیف کے عہدے سے کیوں ہٹایا
ہوا تھا؟

اور نے مہری سانس لی اور بولے کہ نواز شریف کی جنرل مشرف سے فوجی کے چھپے کئی عناصر
تھے۔ ایک دن کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کی درخواست پر پاکستان تشریف لائے۔ نواز شریف نے
ان سے درخواست کی تھی کہ وہ پاکستان سے فوجی ساز و سامان خریدیں۔ کراؤن پرنس کے لیے ایک
بریک کا انتظام کیا گیا۔ اس میں اسحاق داری بھی شامل تھے۔ چیف آف آری سٹاف مشرف نے ایک
نکدہ جنگ دی جس کا معیار اتنا گرا ہوا تھا کہ پاکستان سعودی عرب کو اس بات پر قائل نہیں کر سکا کہ وہ
ہم کو تھیں اور نے کا آ رہا رہے۔ مشرف نے سعودی بادشاہ کو بتایا کہ پاکستان نے پچھلے ایک سال میں

صرف ملازمین اور کارکنوں کے لئے ہے۔ یہ ہنگامی کوئی اور شریف صاحب کا نہیں ہے۔

ایک اور ہنگامی ملازمین کے لئے کوئی اور شریف صاحب کا نہیں ہے۔ اس میں اسحاق ڈار اور سربراہان میں بھی شامل ہے۔ اس ہنگامی میں جنرل شریف نے نواز شریف سے درخواست کی کہ وہ ایک ایجنسی کو نیشنل ہائیکورٹ میں ایک ایجنسی کے لئے کوئلے سے متعلقہ جنرل شریف نے اس ہنگامی میں یہ بھی درخواست کی کہ آرمی چیف کی آسانی سے جیٹ میں چارٹ چٹس آف سٹاف کا مہمہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل شریف یہ مہمہ بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

دار مجھے بتاتے رہے کہ جب جنرل شریف اور نواز شریف میں اختلافات زیادہ ہو رہے تھے شروع ہوئے تو ایک دن جنرل شریف نے اسے کہا کہ میں صاحب سے ملنے راجپوت بنگلے گئے۔ اس سے پہلے وہ شہباز شریف کو جو 1999ء میں یہ پیشگی کر چکے تھے کہ وہ اسلام آباد شریف لے آئیں اور وزیراعظم کے مشیر کے طور پر کام کریں کیونکہ اس سے ان کے بھائی کی فیڈرل حکومت کی کارکردگی بہتر ہو جائے گی۔ دار نے انکشاف کیا کہ جنرل شریف کی راجپوت پانڈا کے بعد انہیں جیٹ میں چارٹ چٹس آف سٹاف ملا دیا گیا۔ نواز شریف اور جنرل شریف کے درمیان اختلافات اس وقت شدت اختیار کر گئے جب جنرل شریف نے کوئلے کے کوارنٹین پر دباؤ کو یہ کہہ کر اس میں کودا کہ وہ جاکر وزیراعظم سے ملے تھے۔ 10 اکتوبر کو اس کی نواز شریف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے وزیراعظم کو شدید پریشان دیکھا۔ وہ دار پر دباؤ ڈال رہے تھے اس وقت دار نے اس سے کہا کہ وہ فوراً طور پر اپنا دور مختصر کر کے اور بنگلے گئے تھے۔ دار نے ملاقات کے بعد دار پر دباؤ ڈال کر نواز شریف سے ملنا تھا۔

دار بھی یہ بات بتا رہے تھے کہ انہیں یہ نہیں کیا تھا اور وہ مجھے بتاتے تھے کہ جنرل شریف سے ان سے ایک دفعہ ملاقاتی اور اس سے کہے آری وہ پینڈا ریسٹ کے لیے چاکا اور پورے کی آمداری تھی۔ وہ اس طرح آری وہ پینڈا ریسٹ کو ان کی مالی رقم اسے پورا کر دے کہ اس ریسٹ کے مالی حالات بہتر ہو جائیں۔ اس طرح اس نے کہا کہ اسے پورا کر دے کہ اس ریسٹ کے مالی حالات بہتر ہوں۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اس نے اسحاق ڈار کے ساتھ ایک سرکاری ملازم کو لایا اور اس کی طرف سے اسحاق ڈار کا دفتر پر ایک سرکاری ملازم کو لایا اور اس کی طرف سے اس کی ملازمت کے اعلیٰ مہمہ داران کے لئے لوگوں کو لایا۔ دار نے اس کا نام ملک

میں 1999 اکتوبر کا واقعہ ہونے کی وجہ سے فوری طور پر ملازمین اور آری وہ پینڈا ریسٹ کو ایک اور سرے میں مل گیا تھا۔

میں نے کہا کہ دار صاحب 1999 اکتوبر کو کیا ہوا تھا؟

دار صاحب نے مگر اسٹاف لیا اور اسے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس دن وہ شاید عمارت کے دورے کرتے جنہیں یہ کہہ سکتے ہیں تھا کہ ان کے دفتر کے باہر کیا ہو رہا ہے اور ان کی سپاہی حکومت کب کی آگ ہو چکی ہے۔ انہیں پاکستان میں فوری بحالت کا علم شام کو چھ بجے ہوا۔ وہ چھ بجے سے کاش کروڑ لاکھ لاکھ ایم این ایز اور دیگر لوگوں کے ساتھ کپاس کی قمیضیں ملے کرنے کے لیے ایک میٹنگ میں مصروف تھے۔ اس میٹنگ میں شہباز شریف نے بھی شریک ہوا تھا، تاہم آخری لمحے تک ان کی سیٹ چلی رہی کیونکہ وہ اس میٹنگ میں نہیں نکلی سکتے تھے۔ ساڑھے چھ بجے اسحاق ڈار نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ وہ پرائمری مشن ہاؤس فون کر کے شہباز شریف کا پتہ کریں۔ انہیں بتائیں کہ میٹنگ شروع ہو چکی ہے لہذا وہ جلدی سے آجائیں۔ تاہم، سیکرٹری کو بتایا گیا کہ شہباز شریف وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ میٹنگ میں ہیں۔ ان سے اس وقت بات نہیں ہو سکتی ہے۔ میٹنگ جاری رہی۔ خاصی دیر بعد اچانک ایک ایجنسی سیکرٹری کمرے میں داخل ہوئے اور سیدھے اسحاق ڈار کے پاس گئے اور ان کے کان میں سرکشی کی کہ ملک پر فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ غیر ارادی طور پر اسحاق ڈار نے جب یہ خبر اس میٹنگ میں شریک لوگوں کو سنائی تو ان سب کے لیے یہ ایک بم ٹپا تھا۔ ماسوائے اسٹاف سیکرٹری، اسٹاف سٹیس اور پرائیویٹ سٹاف کے باقی سارے لوگ کمرہ چھوڑ کر بھاگ گئے اور اعلیٰ داران کے پاس پہنچے۔ سب لوگوں کو اس طرح ہال سے بھاگتے ہوئے دیکھتے رہے۔

چار سال بعد مجھے اس لمحے کی یاد آ رہی ہے کہ اسحاق ڈار کو یہ نہیں آ رہا تھا کہ ملک کی سپاہی لہذا شہباز شریف کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ دار نے یاد کیا کہ جولائی 1999ء میں ان کی ملاقات میں دار نے ان کی ایک فارم میں کھانا روکھا تھا۔ جنرل شریف نے ان کی سہ ماہی شریف کی تھی اور روزی کے پاس شریک کو لایا تھا کہ اس طرح اسحاق ڈار نے ملک میں ہمارے ملک پر پورے طور پر اسٹاف اور آری دار صاحب کے لیے وہ کی تھی۔ جنرل شریف انہیں بھانسنے کے لیے ہار لے آئے۔ دار صاحب کو بھی اس واقعہ کی یاد آ رہی ہے۔ ان دنوں اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں۔

اے ایس جیل اور اس کی سہولتیں اور سزا کے اور کیا کیا آپ جیل میں کوہاں
تاکیں کہ وہاں وہاں اور ان کے ساتھ ساتھ ایک کریں۔

ملک میں لگائے گئے بارش لاگو نہیں کیے گئے۔ چھ ہے۔ اسحاق اور ابھی تک اپنے گھر میں تھے۔
 ۲۰۰۰۰ روپیہ کے بارش لاگو کر کے گھر کے رات کے اندر سے میں آئے۔ ان کی
 لڑائی ایک آری اخیر کر رہا تھا۔ انہوں نے اسحاق اور پوٹا والا کہ وہ انہیں ان تمام لڑائی کی
 قصبات کا نہیں ہونا چاہی ہے ان کی وزارت سے حاصل کیے تھے۔ دار صاحب کو یہ بھی کہا گیا کہ وہ
 وزارت کے بارش کی چلی کے ادا توں اور وزارت کے بارے میں بھی بتائیں۔ دار صاحب نے انہیں کہا
 کہ توں کے پاس ان کی روٹوں وزارتوں کا ریکارڈ ہے وہ اسے چیک کریں۔ اگر کوئی ایسی چیز ملے
 ہے تو وہ انہیں بتائیں۔ دار صاحب نے انہیں بتایا کہ انہیں وزارت کے ذاتی ادا توں یا ان کی چلی کی
 وزارت کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ بات باتوں میں انہوں نے اسحاق اور کے درمیان لگی
 لڑائی۔ اس آری ایم نے دار صاحب کو بتایا کہ انہوں نے کچھ گزرا ہوا ہے جس نے انہیں گھر میں
 لے گیا ہے اور ان کے ہائی وے وزارتوں اور چلیوں میں لے گیا ہے۔ یہ فقرہ ان کے
 اسحاق اور اس آری اخیر کے درمیان واقعہ ہوا۔ چلیوں کا بھی ذکر ہوا۔

[illegible]

18 مارچ 2000ء کو اسحاق ڈار کو انتہائی جلدی میں لا اور کے چاہہ ہاؤس لے ہالیا گیا۔ چاروں بعد جزل امہد نے ان سے آدھی رات کے وقت ملاقات کی۔ جزل امہد نے ان سے ملنے ہی کہا کہ 12 اکتوبر کے بعد وہ پہلے قیدی ہیں جن سے وہ ملنے کے لیے آئے ہیں۔ جزل امہد نے اسحاق ڈار کو کلین پیس دیتے ہوئے کہا کہ یہاں ان کی دونوں وزارتوں کے ریکارڈ کو چیک کیا ہے اور ان کو کہیں سے بھی ایک روپے کی بدعنوانی کی شکایت نہیں ملی ہے۔ ڈار کو ایک مہینہ چاہہ ہاؤس رکھنے کے بعد 25 اپریل کو ان کے گھر بھیجا گیا جہاں وہ ایک دن دیر تک قید کر دیے گئے۔

فک میں داخلہ کے بعد جس طریقے سے اسحاق دار اور ان کی فیملی کے لوگوں کے ساتھ
حکام کیا گیا اس پر دار صاحب شہید داخل تھے۔ ان کے بچوں نے سب سے زیادہ اوجھڑے اٹھائے۔

انہیں گھر سے لے کر وقت سکول جانے سے پہلے علاقہ کے مراہل سے گزرتا پڑتا۔ گھر کی خواتین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

”کیا میں خدا تھا“ اسحاق ڈار نے بڑی جفا سے مجھ سے سوال پوچھا۔

میں چپ رہا۔

25 اپریل سے لے کر 6 دسمبر 2000 تک فوج نے اسحاق ڈار سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے گھر میں قید رہے۔ آخر ایک دن لٹلیٹ جنرل محمودان سے ملنے کے لیے ان کے گھر لاہور آئے۔ جنرل محمودان نے ڈار صاحب کو بتایا کہ جنرل مشرف کے بعد اگر کوئی سب سے مصروف شخص تھا تو وہ تھے لیکن پھر بھی وہ ان سے ذاتی طور پر ملنے لاہور آئے ہیں۔ جنرل محمودان نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ آرہی کی باپ لیڈر شپ ان کی ملک کے لیے کی گئی خدمات کو سراہتی ہے اور وہ جانا چاہتے تھے کہ ڈار صاحب کے آپ سیاسی منسوب کیا ہیں۔ اسحاق ڈار نے بڑے طریقے میں جنرل محمودان کو جواب دیا کہ جی ہاں آپ درست فرماتے ہیں اس ملک کے لیے اتنی خدمات دینے کا انعام مجھے ۱۶2 کتوبر کے بعد قید میں رکھا کر پیسے دیے گئے تھے۔

جنرل محمودان نے وضاحت کی کہ اسحاق ڈار صاحب کو نواز شریف کے سب سے قریب و قریب سمجھا جاتا تھا۔ ایک طرف سے اس کی پالیسی ہم منظر تھی۔ دوسری طرف اس کا خیال تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسحاق ڈار نے نواز شریف کو ان کی جگہ لکھائی گئی تھی۔ اس لیے یہ وہاں سے بے ہوش ہو گئے تھے۔

ڈار صاحب نے جنرل محمودان کو بتایا کہ 2000 اپریل کو جنرل احمد نے انہیں طوع ایک ٹیکس چٹ دی تھی۔ اب اس کی کوئی کاپی اسحاق ڈار کے پاس ہے۔ یہ وہاں چھپے تھے کہ اس کی کاپی اسحاق ڈار کے پاس ہے۔ اس نے ان کے پاس اس کے خلاف کی شہادت لکھی ہے۔

جنرل محمودان نے ڈار صاحب کو بتایا کہ ان سے ملنے کے لیے اس وقت آئے ہیں جب ان کے خلاف یہ دوسرے دوسرے حقائق کے تحت عمل کر رہے تھے۔ انہیں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اسحاق ڈار کے خلاف نہیں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں تھی جس پر وہ کوئی اعتراض کرتے۔ اسی لیے وہ ذاتی طور پر ملنے کے لیے آئے ہیں۔ صرف جنرل مشرف کو اس پر شک کا علم ہے۔

پھر جنرل محمودان نے ڈار صاحب سے جھگڑا کیا کہ نواز شریف کو پھونکا دیا۔

25 دسمبر 2000 کو آئی ایس آئی پنجاب کے چیف نے ڈار صاحب کو مطلع کیا کہ 27 دسمبر کو انہیں اور مشاہد حسین کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈار صاحب کو کہا گیا کہ وہ یہ بتائیں کہ 28 دسمبر کو عید کی نماز کہاں پڑھنا پسند کریں گے تاکہ ان کے لیے سکیورٹی کا انتظام کیا جاسکے۔

اگلے دن 26 دسمبر کو ایک آئی ایس آئی آفیسر میاں محمد اعظم کو ان سے ملوانے کے لیے لے آئے۔ اسحاق ڈار کو یوں محسوس ہوا کہ ملک کا وزیراعظم ان سے ملنے کے لیے گھر آیا ہے۔ میاں اعظم کو اس طرح پرہیزگاروں کو دل دیا گیا جارہا تھا جیسے وہ اس وقت ملک کے وزیراعظم ہوں۔ میاں اعظم بھی ایسے ہی اچانک کر رہے تھے جیسے وہ واقعی بغیر ملک اٹھائے اس ملک کے وزیراعظم تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر میاں اعظم نے اسحاق ڈار کو کہا کہ وہ جنرل مشرف کے زیر سایہ بننے والی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اسحاق ڈار نے انکار کیا اور میاں اعظم کو یاد دلایا کہ ان دونوں کو سیاست میں لانے والے نواز شریف تھے اور اس وقت نواز شریف کو پھونکا جاتا تھا۔

اسحاق ڈار کا انکار سن کر میاں اعظم نے ایک لمبی وضاحت پیش کی کہ انہوں نے نواز شریف کو کیوں پھونکا تھا۔ میاں اعظم نے ڈار کو بتایا کہ ان کے پاس آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ جنرل مشرف انہیں ذاتی طور پر پسند کرتے ہیں۔ میاں اعظم نے جب بات بننے نہیں دیکھی تو انہوں نے اسحاق ڈار پر طعن کیا کہ جناب! جب نواز شریف ڈیل کر کے سعودی عرب جا رہے تھے تو ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اسحاق ڈار کو دیکھ کر سنا تھا اور آج وہ بیٹھے نواز شریف سے وفاداری کا اصول دہرتے رہے ہیں۔ میاں اعظم وہ کھٹے تنک اسحاق ڈار کے ساتھ رہے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بات ٹھیک ہی تو کوٹ گئی۔

میاں اعظم نے جا کر جنرل مشرف کو ان کے خلاف انتہائی نیکی پر رپورٹ پیش کی۔ فروری 2001 میں دہلی نئے ذکے انجمن کو سپریم کورٹ حلقہ دے دے یہ ساری رپورٹ اخبار میں شائع کر دی۔

یہ مضمون کا آخری روزہ تھا۔ ڈار صاحب ابھی انٹرویو سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آپریشن نے انہیں بتایا کہ ان کے لیے بدو سے ٹیلی فون کال ہے۔ فون پر دوسری طرف نواز شریف تھے۔ نواز شریف نے جنرل محمودان کے خلاف سخت لفظ استعمال کیے اور ڈار صاحب کو بتایا کہ اس پنجابی جرنیل نے ان کے راجہوت کو سلوک کیا ہے۔ ڈار نے بھی نواز شریف کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اسحاق ڈار کو پتہ نہیں تھا کہ ان کی ٹیلی فون پر ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ نواز شریف کی اس کال کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں اس رات رہا کرنے کے بجائے مزید آٹھ مہینے تک گھر پر قید رکھا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنرل محمود کو نواز شریف اور اسحاق ڈار کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا ٹرانسکرپٹ پیش کیا گیا تھا۔ ڈار کے خیال میں ان کے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کے ذمہ دار جنرل محمود تھے ورنہ انہیں جنرل احمد کے ساتھ 20 اپریل کو ہونے والی میٹنگ کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسحاق ڈار نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور جنرل احمد کو فون کیا جو اس وقت لیب سے بنا کر کورنگٹن ہاؤس لگا دیئے گئے تھے۔ اسحاق ڈار نے انہیں تلخ لہجہ میں بتایا کہ قیامت والے دن خدا کے سامنے ان کا گریبان پکڑ کر ضرور انصاف مانگیں گے کیونکہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار تھے۔ جنرل احمد یہ بات سن کر تھوڑے سے نرم ہوئے۔ انہوں نے اسحاق ڈار کو ملتان آنے کی دعوت اور ساتھ یہ بھی کہا کہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے ذمہ دار نہیں تھے۔

جب اسحاق ڈار قید میں تھے تو انہیں کچھ سینئر ملٹری آفیسروں نے یہ مشورے دیئے تھے کہ وہ عدالت کا دورہ نہ لکھتے تکیں۔ ڈار صاحب کا خیال تھا کہ جنرل محمود ان کے اور چوہدری غار کے خلاف دل میں کوئی ذاتی بغض رکھتے ہیں اس لیے ان دونوں کی رہائی نہ ہونے میں ان کا اہم کردار تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اسحاق ڈار کے بیٹے کی سٹی نواز شریف کی بیٹی سے تازہ تازہ ہوئی تھی لہذا اگر کوئی شخص میاں صاحبان کے قریب ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا تو وہ ڈار صاحب تھے۔ لہذا اندر کی باتیں یقیناً انہیں پتہ ہوں گی۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب آخر نواز شریف اور جنرل شرف کے درمیان یہ ڈیل کیسے اور کیونکر ہوئی تھی کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈار صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر رازوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

سعودی کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کو پسند کرتے تھے اور ان کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ عبداللہ کی نواز شریف کے لیے پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریاض

میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران کراؤن پرنس نے نواز شریف کو اپنی بھائی کو رہا کیا تھا۔ دوسرے دن آج بھی سعودی عرب میں خصوصی طور پر ان کے اہل خانہ کو چھائی سے نہ بچانے پر اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نواز شریف کا اہم نام بھی بھڑکی طرح ہو۔ سعودی عرب میں پہلے قطر کے وزیر خارجہ سے کہا کہ وہ جنرل شرف کی فوجی حکومت سے رابطہ کریں اور نواز شریف کی رہائی کے لیے مذاکرات شروع کریں۔ قطر کے وزیر خارجہ نے سعودی عرب کو بتایا کہ جنرل شرف کی حکومت نواز شریف کی مذاکرات شروع کریں۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لبنان کے وزیر اعظم، رئیس حریری کو رہا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لبنان کے وزیر اعظم، رئیس حریری سے بات کی اور ساتھ میں اپنے بیٹوں کو ان کے ساتھ لگایا کہ وہ پاکستان کی فوجی حکومت سے کوئی ڈیل طے کریں۔ تاہم، بات پھر بھی نہیں بن رہی تھی۔ جب سعودی قیادت نے یہ دیکھا کہ جنرل شرف کسی حوالے سے بھی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو آخر ایک دھمکی اسلام آباد کو بھیجی گئی کہ آج کے بعد دوبارہ اہل طاقت میں دیا جانے والا تیل بند کر دیا جائے گا اگر انہوں نے نواز شریف کو رہا نہ کیا۔

جو کام قطر کا وزیر خارجہ، لبنان کا وزیر اعظم اور سعودی شاہ کے اپنے بیٹے بھی نہیں کر سکے تھے وہ دوبارہ ڈار کی اس دھمکی نے کر دکھایا۔

ان مذاکرات میں پہلی کامیابی اس وقت ہوئی جب جنرل شرف نے سعودیوں سے کہا کہ وہ شریف فیملی کے چاروں افراد سے یہ کہیں کہ وہ ملک سے اپنا میڈیکل علاج کرانے کے لیے جانا چاہتے ہیں بل اس درخواست پر نواز شریف اور ان کی فیملی کو میڈیکل گراؤنڈز پر ملک سے باہر بھیجا گیا۔

برسوں بعد جب اسحاق ڈار نواز شریف سے جدہ میں ملے تو نواز شریف نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جنرل شرف سے کوئی براہ راست ڈیل نہیں کی تھی۔ جنرل شرف ابھی بھی سعودی حکمرانوں سے یہ درخواست کرتے رہے تھے کہ وہ شریف فیملی کو سعودی عرب سے کہیں نہ جانے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی ایجنسی کو بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ شریف فیملی کے لوگوں کے پاسپورٹ کی تجدید نہ کریں تاکہ وہاں سے باہر نہ جاسکیں۔

ڈار صاحب کے بقول سعودی حکمرانوں نے پہلے دن ہی پاکستان کی فوجی قیادت کو ایک بڑا سخت پیغام بھیجا تھا کہ نواز شریف کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ڈار صاحب نے دعویٰ کیا کہ یہ ساری ڈیل سعودیوں نے جنرل شرف سے خود ملے کی تھی۔ نواز شریف اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ وہ جیلوں

میں تو اپنے دیگر ساتھیوں کو اس آل میں شامل کرانے کا اپنے ساتھ لے جاتے تھا اب یہ حکایت کرنا
 نوادر شریف ان سب کا اپنے ساتھ لے کر سووی عرب کیوں نہیں گئے تھے اس کا جواب بہت کم ہوتا ہے۔
 میں نے اور صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے نوادر شریف سے جنرل شرف کے ساتھ
 ہونے والی چوکی پر حاصل گفتگو کی تھی۔ وہ بولے کہ ہاں۔ ان کی نوادر اور شہیدانہ دونوں سے اس
 بارے میں بات ہوئی تھی۔ انہوں نے یہی خیال تھا کہ فوجی حکومت نے سب سے زیادہ مارگٹ نہیں کیا تھا
 کیونکہ ان کا جیل تھا کہ اگر وہ اس ملک سے بچے جائیں تو ممکن ہے کہ جیلوں میں زندان کے دوسرے
 یا کسی دوسرے کو بھی پھانسی لگا جائے۔

میں نے اور صاحب سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کی نوادر شریف کی بیٹی سے شادی کیسے ہوئی تھی۔
 وہ بولے کہ اگست 2003ء میں انہوں نے انہوں کے بیٹوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

میں نے کہا کہ اور صاحب! آپ کے خیال میں نوادر شریف حکومت کی سب سے بڑی غلطی کیا
 تھی جس کی وجہ سے اس ملک میں 17 ستمبر 2001ء کا حادثہ رونما ہوا۔ وہ بولے کہ سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ
 قاتل کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کو پتہ چلے کہ وہ دوسرے اعتبار کے نام پر جاری مہم نہ تو انصاف پر مبنی
 تھی نہ ہی شفاف تھی۔ نوادر شریف حکومت کو عرب کا اعتبار کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اسحاق اور صاحب سے آفری سوال پوچھا کہ ان کا زندگی میں سب سے بڑا نقصان
 کیا تھا۔ وہ بولے کہ جیڑ میرے مائنان کے ساتھ وہابی میں ملیں لوگوں نے کیا تھا اس کے بعد
 سب کے ساتھ کوئی نہ ہو سکا تھا۔ اب میرے بچے اس ملک میں ایک غیر جمہوری ماحول میں رہنے کے
 لیے جا رہے تھے۔ میری زندگی کا یہ سب سے بڑا نقصان تھا۔

فیصل صالح حیات

فیصل صالح حیات سے میری پہلی ملاقات 2002ء کے انتخابات کے بعد میرے قہر اللہ بھائی کی
 موت بنے کے بعد ہوئی تھی۔ جس میں وہ پیپلز پارٹی کو تیس دہائیوں کے بعد چھوڑ کر جنرل شرف کے
 ساتھ چلے گئے تھے۔ اس وقت وہ جنرل شرف کی حکومت کے وزیر داخلہ تھے۔

میری ان سے ملاقات پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی جہاں وہ بہت سارے صحافیوں
 میں گھرے بیٹھے ان کے تیز و تند سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کو توڑ کر بنائے گئے
 نئے پیٹریاٹ گروپ کے خلاف میری خبروں سے بڑے ڈالاں تھے۔ مجھے ان کی ہراسنگی کا پتہ جنگ
 گروپ کے مالک میر کلکیل الرحمن صاحب کے مجھے کیے گئے ٹیلی فونز سے چٹکارہ ہوتا تھا۔ میر صاحب نے
 دس تین دفعہ یہ بات کہی تھی کہ فیصل صالح حیات میری رپورٹنگ کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔

جب میں نے فیصل صالح حیات کو پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں دیکھا تو سوچا کہ جا کر ان سے
 ملنا ہوں اور ان کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں خوشگوار موڈ کے ساتھ ان کی میز پر گیا۔ وہ مجھے
 قہر سے نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں
 دی جس سے مجھے تھوڑا سا جھکا لگا کہ کیا وہ واقعی مجھے نہیں جانتے تھے یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے
 یا پھر ان کے خیال میں جو دہریہ جنگ گروپ کے مالک میر کلکیل الرحمن کو براہ راست فون کر کے اس کے

رہا، اس کے خلاف شکایت کر سکا ہوتا ہے، ہر ایک رہاورد کو اسٹاکس کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ان دنوں کی سیاسی رہنمائی شروع کی تھی اور ضرورت سے زیادہ علانیہ جوش تھا۔ میں بھی شہرہ آفاق رہاوردوں کی طرح ایک کرہ تھا، جنہیں تازہ تازہ شکایت ملنا شروع ہوتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ وی اپنے آپ کو کوئی چیز کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ہر جگہ اپنی آواز میں سوال کرتے اور غرور کر رہے تھے، یہ تصور کر لیتے ہیں کہ شاید اس سے انہیں بڑا پروردہ مل لیا جائے گا۔ میں نے بھی وہی وقت کی اور فیصل صلاح حیات سے کسی بات پر غرور شروع کر دی جس سے میرے دلوں کے درمیان فوری یگنی ہو گئی۔

فیصل نے کھڑی کا سطور کرتے ہوئے مجھے کہا کہ آپ اب تک ہمارے سے سیاسی گروپ کے خلاف غریب ہمارا موقف جاننے بغیر شائع کر رہے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ کسی وقت میرے پاس آ کر بیٹھو۔ یہی کوئی سطور اس کے بعد جتنا دانی چاہے کھو۔

میں نے فیصل صلاح حیات کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ایک رہاورد کے لیے ضروری ہے کہ وہ جتنے کہ وہاں سچائی کی مشورے سے تاکہ جب وہ کچھ کے لیے بیٹھے تو اس کے ذہن میں ایک عین تصویر بن جائے۔

کچھ دن بعد میں نے فیصل صلاح حیات کو فون کیا کہ ان سے وقت ملے ہوا نہیں ہے مجھے لیکن بیک وقت میں وہ غریب دوست اور کے ختم میں چلا ہوا۔

ان کے ختم میں جتنا کہ میں نے دیکھا، یہ ایک بڑا بڑا کھٹا ہوا ہے، ہم نے شروع کیے جو اس ملک کے گہرے گہرے ہیں۔ فیصل صلاح حیات کا نمبر 33 تھا۔ اس سے پہلے سکھ مرزا ملک فیروز خان فون کا فون کرتے، وہ ان کا فون پر جہاں جہاں کے پاس بھی وزارت اور عدالت کا چارج رہا تھا۔ میں نے ہم نے جہاں کے بعد فیصل صلاح حیات سے کہا کہ اسے جہاں سے جہاں لوگوں کے پاس دست اور کا پورٹا ہے اس کی کسی چیز نہیں ہے، میں نے انہیں کیا محسوس ہوتا ہے۔

فیصل صلاح حیات نے ان کی کے اشارے سے مجھے کہا کہ میری لبر 18 ہے، کھانا نام چھو۔ میں نے وہ نام چھوڑا اور ان کا فون پر جہاں جہاں۔

فیصل صلاح حیات نے اپنی 33: میں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے کہا کہ مجھے اس بات پر جہاں

فرحان ہوتا ہے کہ کبھی اس وزارت کو میرا لیزر ڈیوالتا علی بھٹو چھوڑا تھا۔

اور اور کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فیصل سے پوچھا کہ وہ سیاست میں کیسے داخل ہوئے۔ ان کا جواب سن کر مجھے حیرانی ہوئی کہ کبھی وہ لاہور میں اسلامی جمعیت طلباء کے رکن تھے۔ بعد میں فیصل صلاح حیات کو محسوس ہوا کہ وہ اس مذہبی جماعت کے سخت ماحول میں سیاست نہیں کر سکتے۔ انہوں نے طالب علموں کے ایک انتہائی گروپ پینٹل سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کو جان کر لیا جس کے خیالات اور فلاحی ان کے اپنے مذہبی اور فیوڈل ریک گراؤنڈ سے ہرگز نہیں ملتے تھے۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو 1977ء میں فیصل صلاح حیات نے پیپلز پارٹی جوائن کر لی۔ پارٹی کے وقت پر انکیشن جیتا لیکن پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے لیے دس سال انتظار کرنا پڑا کیونکہ جنرل ضیاء نے اس ملک پر مارشل لا لگا دیا تھا۔

ضرورت بھٹو فیصل صلاح حیات کو بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ سرکاری بھٹو کے کلاس فیلو تھے۔ فیصل کے اہل خانہ کا کھانا کھانا کشن لڑکا تھا تھے اور وہ بھٹو صاحب کے ایک طرح سے فلی فیلو تھے۔ یہ فیصل بھٹو فلی کے بہت قریب تھے۔

فیصل صلاح حیات کے لیے ضرورت بھٹو کی پسندیدگی کی وجہ سے ان کا گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ پیگم بھٹو ایک زبردست شخصیت کی مالک تھیں اور دل کی بہت اچھی تھیں۔ وہ پیگم بھٹو اور فیصل صلاح تقریباً ایک دوسرے کے ہم عمر تھے لہذا ان کی بہت جلد ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی ہو گئی۔

ان دونوں نے اپنا سیاسی کیریئر بھی ایک ہی پارٹی سے اس وقت شروع کیا تھا جب پارٹی اپنی تاریخ کے بدترین عرصوں سے گزر رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ سیاست کیگی خصوصاً جب جنرل ضیاء اپنی بددلی کی طاقت پر اس ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے سیاسی تعلقات بہت جلد خاندانی تعلقات میں داخل گئے۔ بھٹو صاحب بھی فیصل کو پسند کرتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان جاری یہ تعلقات انہماک سال بعد اس وقت ختم ہوئے جب فیصل صلاح حیات نے 2002ء کے انتخابات کے بعد پیگم بھٹو کے خلاف یہ کہہ کر بغاوت کی کہ وہ چھوٹے موٹے مفادات کے لیے ان کے ختم کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں۔ فیصل کے خیال میں ان کے اور بی بی کے درمیان جو چیز مشترک تھی وہ جنرل ضیاء کے خلاف جدوجہد اور جمہوریت کی بحالی تھی۔

ایک بات میں نے غصے کی کہ بینظیر بھٹو کو پھانسی دے کے بعد بھی فیصل کے دل میں ابھی بھی اس کے لیے بے پناہ احترام موجود تھا۔ اس کے خیال میں بینظیر بھٹو ایک شاندار انسان اور جنگجو تھے۔ ایک ایسی بات تو مجھے یاد ہے کہ ان دنوں کی ملک تھی۔ ہم فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو کی سیاست کو کچھ کے لیے ضروری تھا کہ ہم 1988ء سے مکی کی بینظیر بھٹو اور اس کے بعد کی بینظیر کو ایک دوسرے سے ملھ کر کے دیکھیں جس سے یہ لگے کہ وہ سب کی کچھ ایک رہا اور بینظیر بھٹو میں اتنی جتنی جہد ملیاں آئی تھی جس کی ایک دن اسٹیمپٹ کے آگے جگہ تھی۔

بینظیر بھٹو یہ بات بھول گئی تھی کہ لوگ بینظیر پارٹی سے اس لیے پیار کرتے تھے کہ یہ اپنی اسٹیمپٹ پارٹی تھی۔ یہ ایک ایسی پارٹی تھی جو اپنی اپنی حق میں لیبرل سیکولر اور ملاؤں تھی اور پاکستان کے لیے ایک جدید جمہوری معاشرے کی خواہاں تھی۔ ان اصولوں کے خواب حاصل کرنے کے رومانس میں بینظیر پارٹی کے دور کرنے نے اسٹیمپٹ کے ہاتھوں بے پناہ الہامیتیں برداشت کیں لیکن اسٹیمپٹ نے بینظیر بھٹو کی اپنی جگہ پر ان کے ساتھ کچھ دماڑ کر کے پر تیار ہو گئیں اور یوں ان لوگوں کی آنکھوں میں خواب مر جھا گئے جنہوں نے ان کی تخیل کے لیے ایک لمبی جنگ لڑی تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ یہ بات مانتے ہیں کہ سیاست میں کچھ دماڑ کر رہتے ہیں لیکن ایک اچھے سیاستدان کو ایک سیاسی کچھ دماڑ اور ان کے ساتھ کچھ دماڑ میں ایک لکیر کھینچنی پڑتی ہے۔ ہم سیاست میں ساری عمر ہمیشہ ان دونوں کچھ دماڑ کے درمیان جھپٹتے رہتے رہے ہیں۔ لیڈرز کو کبھی اپنے بنیادی اصولوں اور پالیسیوں پر کچھ دماڑ نہیں کرنا چاہیے۔ فیصل کے بقول بینظیر پارٹی کو 1988ء میں حکومت نہیں ملانی چاہیے تھی اور یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ بینظیر پارٹی نے پہلی دفعہ اسٹیمپٹ کے ساتھ بہت بڑا کچھ دماڑ کیا تھا۔ جمہوریت کے لیے اتنے برس قربانی دینے کے بعد اسٹیمپٹ کے ساتھ اتنا اندھا کچھ دماڑ پارٹی کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے کچھ دماڑ کے بدلے میں بینظیر پارٹی کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اس وقت کی انتظامیہ نے بینظیر پارٹی کو فری وینڈ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت چلا سکتی۔ بینظیر پارٹی حکومت ہر وقت یہ بات ثابت کرنے میں لگی رہی کہ وہ انٹی اسٹیمپٹ پارٹی نہیں ہے اور اسی پکر میں وہ اپنے خواب، ویژن اور کمنٹ کو نبھاتی۔ فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتائیں کہ اگر پارٹی قیادت خود ہی اس طرح کے کچھ دماڑ کر کے ایک مثال قائم کرے گی تو پھر آپ اس پارٹی کے

بہتر سے کیا توقع کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی سیاست کریں گے۔

فیصل کے بقول بہتر انداز میں پارٹی کی نظریاتی بنیادیں اسی دن ہی دفن ہو گئی تھیں جس دن 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیمپٹ کے ساتھ کچھ دماڑ کیا تھا۔ اس کچھ دماڑ سے سارے پارٹی لیڈروں کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ پارٹی اب اقتدار میں جھپٹنے کے لیے رومانوی سیاست کے بجائے عملی سیاست کرے گی۔ اگرچہ تمام سیاستدانوں کا آخری مقصد اقتدار میں پہنچنا ہوتا ہے لیکن یہ مقصد اگر سیاسی عمل سے حاصل کیا جائے تو بہتر ہے نہ کہ اپنی پارٹی کی علاقائی کو قسم کر کے جیسا کہ بینظیر بھٹو اور ان کی پارٹی نے کیا تھا۔ جس دن بینظیر بھٹو نے یہ کچھ دماڑ کیا اسی دن ہی بینظیر پارٹی کا ایجنڈا ایک پراگریسو اور لوگوں کی جماعت کے طور پر ختم ہو گیا تھا۔ 1977ء سے لے کر 88ء تک بینظیر پارٹی نے اپنی اسٹیمپٹ سیاست کی لیکن راتوں رات اس پارٹی نے اتنا بڑا یوٹرن لیا کہ لوگ حیران ہو کر رہ گئے۔ جب آپ نے ایک دفعہ کچھ دماڑ کر لیا تو پھر اس کے بعد ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چل سو چل۔

فیصل نے دعویٰ کیا کہ وہ ان چند سیاسی ورکروں میں سے ایک تھے جو بینظیر بھٹو کو 1986ء میں پاکستان واپس لائے تھے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا کہ بینظیر پارٹی نے 1988ء میں کسی کو مجبور کر کے الیکشن نہیں کرائے تھے۔

فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو نے نوابزادہ نصر اللہ خان کے مقابلے میں غلام اسحاق خان کی مدد کر کے دراصل ایم آر ڈی کی تحریک کو دھوکہ دیا تھا جس نے جنرل ضیاء کے مارشل لا کے خلاف بڑی لمبی جدوجہد کی تھی۔ وہ لوگ جو اسٹیمپٹ کے ساتھ اس طرح کی اندھی ذیل کے خلاف تھے انہیں بینظیر بھٹو نے ایک ایک کر کے سائیڈ لائن کر دیا۔ بینظیر بھٹو کے نزدیک اب سیاسی اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ 1993ء میں انہوں نے اس غلام اسحاق خان کی مدد کی تھی جس نے 1990ء میں ان کی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا اور ان کی پارٹی کے لیڈروں پر مقدمات بنائے تھے۔ بینظیر بھٹو اس غلام اسحاق خان کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں جو نواز شریف کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔

فیصل نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ایک انٹی اسٹیمپٹ پارٹی آخر میں محلاتی سازشوں کا حصہ بن کر رہ گئی۔

پارٹی میں فیصل نے مجھے بتایا کہ بینظیر بھٹو نے 1983ء میں آدلی ہیف نزل دھبہ لاگو
کے ساتھ ہی برصغیر کو کھردرا کر دیا تھا۔ ہم نے اس کھردراؤ کی عکاسات تانے کو چاہی تھی۔
فیصل ایک کے بعد دوسری کہانی سناتے رہے۔

پارٹی نے ایک اور برصغیر شہر کی کھردراؤ اس وقت کیا جب پنجاب میں ایک پھول
سے پانی کو پھول پر لٹا دیا گیا۔ جس کو پ کے لینڈنگ پر لٹا دیا گیا اس کے پاس صرف قوی
اسکول میں چار سالہ لڑکی تھی۔ اس شہر سے پانچویں کے کمرے تھے۔ ان کے لینڈنگ پر پھول
اس کے بعد اس ملک کے لڑکیوں کو منسوب ہے۔ یہ بینظیر بھٹو کی ایک اور بہت بڑی سیاسی تسلی
تھی۔ اگرچہ بینظیر بھٹو نے اس پنجاب میں ایک سکول کے طور پر بھیجا لیکن یہ کم عمر سے اور فیصل نے
اس وقت اس کی سب سے بڑی بات تھی کہ اس کی اپنی پارٹی کے لوگ ہی اس کی باتیں سمجھتے تھے۔
اگرچہ فیصل سارا جانتا تھا کہ اس کے پاس میں مجھے اس فیملی نے اپنے پروفیشنل اعتراف میں یہ کیا تھا
کہ اس شخص کے گھر کے قریب ہی ان کے بچے تھے۔ ان کے بچے نے نزل شرف کو جانشین کیا تھا۔

جب کسی بات میں نے فیصل سارا جانتا تھا تو وہی تو وہی ہے کہ جب اس کی ایسی بات ہوتی
تو وہی طرح ہی 1983ء میں پنجاب میں سکول کی پڑائیں سے استغنیٰ نہ دیتے۔ فیصل مجھے بتاتے گئے
کہ 1988ء سے لے کر اب تک ہتھ پڑائی کی تحریک ایل اور کھردراؤ سے بھری ہوئی ہے تاکہ ہر
وقت ہر وقت اس میں پہنچا جائے۔ فیصل نے اپنے اور اپنی تنقید کی کوئی وہ بھی اسٹیمپڈ کے ساتھ یکے
کے کھردراؤ اور ایل کا وعدہ تھے۔ فیصل کے خیال میں وہ تمام کھردراؤ اصل کچھ عرصے کے لیے
ملاقات حاصل کرنے کے لیے کیے گئے تھے۔

اب ہتھ پڑائی کے کام سے ملنے گئے لے کر اب ہر پارٹی کا ہار ہا تھا کہ وہ اسٹیمپڈ
کے ساتھ مل گئے تھے لیکن ان دنوں کھردراؤ کے بارے میں کیا خیال ہے جو بینظیر بھٹو ماضی میں
اسٹیمپڈ کے ساتھ کرنی آئی تھی۔ فیصل میرا جواب ہے کہ ایک طرف بینظیر بھٹو ہتھ پڑائی کو دنیا
کے سامنے اس طرح پیش کر دی تھی جیسے یہ ایک لبرل اور سکولر پارٹی تھی اور دوسری طرف وہ سارا
فصلی ارمان جیسے لوگوں سے سیاسی تلاش کر کے ان کے اپنے اور سے اور اللہ اس میں قوی اسٹیبل کی
کاڑھ لکھ کر اسے اس کے ساتھ ساتھ لکھ کر پیش کر دی تھی۔

فیصل نے بڑے طور پر انداز میں مجھ سے پوچھا کہ اب آپ اور ہتھ پڑائی سے پرہیز کر
پارٹی کا لبرل اور پروگرام کو بغور اس وقت کہاں کیا جب سوزا کے ساتھ سیاسی اتحاد کیا ہوا تھا۔
فیصل نے کہا کہ یہ ہتھ پڑائی ہی تھی جس نے افغانستان میں طالبان پیدا کیے تھے۔ دوسرا
نمبر اللہ ہارنے ان طالبان کی پروڈکشن کی اور انہیں پسند کیے۔

فیصل نے ایک اور طرح سے مجھ سے پوچھا کہ جناب اب یہ طالبان پیدا کیے جا رہے تھے اس
وقت پارٹی کا پروڈکشن لبرل اور سکولر اور کھردراؤ کہاں کیا تھا۔ اس کی بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ
طالبان ہتھ پڑائی نے پیدا کیے تھے۔ بینظیر بھٹو اپنے آپ کو سطرلی دنیا کے سامنے ایک لبرل اور
پروڈکشن لینڈ ریش کرتی تھیں۔ پاکستان میں وہ مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائیں اور دنیا
پست طالبان کی سرپرستی کرتی تھیں۔

میں نے بات کا رخ سوزا اور فیصل سے پوچھا کہ ہتھ پڑائی کی قیادت پر تھے۔ اسے کرپشن کے
اور ملت میں کیا حقیقت تھی۔

فیصل نے کہا کہ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیونکہ ان تمام کرپشن کی کہانیوں میں ہر
جگہ روڈی فیکٹر موجود تھا۔ سب کو علم تھا کہ ان دنوں ہر اٹم منسٹر آفس میں کیا ہو رہا تھا۔ محترمہ کو پتا ہے تھا
کہ وہ آصف زرداری کے خلاف ان کرپشن الزامات کو تنقید کی سے لیتیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کرپشن کی وہ
کہانیاں بھونی لکھیں لیکن یہ وہ برا عظیم کام تھا کہ وہ ان رپورٹس پر انکیشن لیتیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ کیا نواز شریف اور بینظیر بھٹو کی لڑائی نے اس ملک کو ناقابل حسانی
تبدیل نہیں پہنچایا تو وہ بولے کہ دونوں لینڈ ریز نے سب سے سب سے اور ان کی موقعوں پر انہوں نے ایک دوسرے
کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے کئی غلط کام بھی کیے تھے۔ اپنی بات میں وارن پیدا کرنے کے لیے
انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کی دوسری حکومت میں شہباز شریف ہتھ پڑائی کی حکومت سے ہاتھ دے ایک
ایل کر کے بعد ملک سے باہر گئے تھے۔ اسی طرح مارچی 1999ء میں بینظیر کے خلاف یہ اتنی فیصل
انے سے پہلے ہی نواز شریف حکومت نے ہاتھ دے ایک ایل کے وقت محترمہ کو ملک سے باہر جانے دیا۔

فیصل نے بتایا کہ اگر محترمہ کو مجھ سے اس کی ہی محبت تھی تو پھر 12 اکتوبر 1999ء کو جب
نزل شرف نے اللہ اس کے پیچھے میں لیا، انہوں نے اس کا کیوں بغیر مقدم کیا تھا۔ تمام لوگوں نے جلی

یہ محترمہ کو ایک سیاسی حکومت کے نمائندے پر ایک جنرل کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر

فیصل نے کیا کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ انہیں تو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ محترمہ ۱۹۷۲ء کو ۱۹۷۹ء سے پہلے ہی جنرل شرف کے ساتھ ڈیل کر رہی تھیں۔ یہ تو جنرل شرف تھے جنہوں نے بینظیر کے ساتھ ڈیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فیصل نے کہا کہ اگر وہ نیب کے مقدمات کا سامنا کر سکتے تھے تو بینظیر بھٹو کیوں نہیں اسپریم کورٹ آف پاکستان نے ہی ان کے بینک لون کیس میں ان کی ضمانت منظور کی تھی اور وہ دیر ہوتے ہوئے بھی ابھی تک عدالت میں قانونی جنگ لڑ رہے تھے۔

فیصل نے اٹاٹھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ بینظیر بھٹو اس ملک میں وہ کراپٹ علاقہ قائم کیے جسے مقدمات کا سامنا کیوں نہیں کر سکتی تھیں۔ فیصل نے کہا کہ جنرل شرف کے تین سالہ فونی ۱۱ میں انہوں نے ٹیکس اور میسجنگ کیسز میں ان کی کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ ان کی اپنی پارٹی کے ساتھ کنٹیکٹ تھی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی نے تحریک چلا کر جنرل شرف سے انتخابات نہیں کروائے تھے۔ کسی سیاسی پارٹی کے پاس کوئی سٹریٹ پاور نہیں تھی۔ آپ باقی باتیں چھوڑیں۔ ۱۱ کے بعد افغانستان پر امریکہ کے حملے کے بعد بھی جماعت اسلامی چند ہزار سے زیادہ لوگ سڑکوں پر نہیں آئی۔ جنرل شرف نے نئے انتخابات کرانے کا قوم سے وعدہ کیا تھا جو اس نے پورا کیا۔ اس قوم نے جنرل ضیاء الحق کا کیا کر لیا تھا جب اس نے ۹۰ دن میں انتخابات کا وعدہ کر کے ۱۱ سال تک وادی میں کراں ملک پر حکومت کی۔

میں ابھی تک نہیں جان سکتا کہ آخر فیصل صاحب سیاست کو کس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کا ساتھ چھوڑ کر جنرل شرف کے ساتھ مل جائیں۔ فیصل صاحب حیات کا بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کا فیصلہ کوئی مامہات نہیں تھی۔ فیصل اس پارٹی کے لیے کئی سالوں تک شاہی قلعے کی ازیتیں بھگت چکے تھے۔ آخر کچھ تو ہوا گا جس کی وجہ سے فیصل جیسا بدمعاش اب بینظیر بھٹو سے مایوس ہو کر ایک آمر کی حکومت میں رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جب اکتوبر ۲۰۰۲ء میں اس ملک میں انتخابات ہوئے تو بینظیر بھٹو نے پارٹی کے لیڈروں کو

مرد قاتل پر دیکھ کر سس کرنے کے لیے دعویٰ نکالا۔ فیصل نے محترمہ کو بڑے واضح طور پر یہ بات بتائی کہ وہ اپنے تمام سیاسی کارکنوں میں اسٹیلٹ کے ساتھ کپور و مائزرز اور ڈیل کرتی آتی تھیں۔ ایک دفعہ ہی طرح ایک مرد قاتل بھڑیہ اور سی تھی۔ اسٹیلٹ بینظیر بھٹو کو سب کچھ بتانے کو تیار تھی لیکن اس کے بدلے میں اسے مرد قاتل بھڑیہ اور سی کے ساتھ مل کر ڈیل کرنا پڑا۔ فیصل نے محترمہ کو بتایا کہ بینظیر پارٹی اس پلان میں ہے کہ وہ اپنی تھی کہ بینظیر بھٹو ملک سے باہر رہیں۔ فیصل نے محترمہ کو بتایا کہ بینظیر پارٹی اس پلان میں ہے کہ وہ حکومت بنائے اور اس کو برہنہ حال میں حکومت بنائی جائے۔ فیصل نے بی بی سی سے پوچھا کہ ماضی میں بھی تو وہ بہت سارے ایسے سیاسی گروہوں کے ساتھ مل کر حکومت بناتی رہی ہیں جو انہیں پسند نہیں تھے تو اب کی بار اس میں کیا ہرج ہے۔ فیصل کے خیال میں بینظیر پارٹی اور بینظیر بھٹو کے اصل سیاسی دشمن نواز شریف تھے نہ کہ پی ایم ایل کیو۔ فیصل نے بینظیر بھٹو کو وہ تمام نام گوائے جو نواز شریف کے دور میں جیلوں میں بیٹھے گئے۔ یوسف رضا گیلانی، مشتاق اموان، آصف زرداری ان میں نمایاں تھے۔ یہ نواز شریف ہی تھے جنہوں نے بینظیر پارٹی کو دھوکہ دیا۔ ۲ دسمبر ۲۰۰۰ء کو اسے آرڈی کے نام سے بینظیر بھٹو کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد بنایا اور ٹھیک آٹھ دنوں بعد جنرل شرف کے ساتھ ایک فقیہ ڈیل کر کے ملک سے چلے گئے۔ نواز شریف نے بڑی سمجھداری سے بینظیر پارٹی کی سیاسی طاقت کو جنرل شرف کے ساتھ ڈیل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

یہی وجہ تھی کہ فیصل چاہتے تھے کہ پی ایم ایل کیو کے ساتھ ڈیل کرنے میں بہت بڑا فائدہ تھا کیونکہ پی ایم ایل کیو کسی نظریے کی بنیاد پر تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ اس پارٹی میں وہ لوگ شامل تھے جو اپنی نہیں جیت سکتے تھے اور انہیں طاقتور حلقوں نے ایک پارٹی میں اکٹھا کر دیا تھا۔ بینظیر پارٹی بڑے آرام سے اس حکومت میں اپنی مرضی سے حکومت کر سکتی تھی۔

فیصل نے بی بی سی سے پوچھا کہ وہ بتائیں کہ ٹکراؤ کی سیاست کر کے انہوں نے کیا حاصل کر لیا ہے۔ وہ ایک ڈیل کر کے بڑی آسانی سے پاکستان واپس آ سکتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ اپنے کپور کو بھی عدالتوں سے سبیل کر سکتی ہیں جب ان کی اپنی پارٹی اقتدار میں ہوگی۔

فیصل کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ ۱۹۸۸ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیلٹ کے ساتھ ٹکراؤ کی سیاست سے گریز کیا تھا لیکن اب وہ جنرل شرف سے ٹکراؤ کرنے کے سوا میں نہیں۔ ۱۹۸۸ء میں محترمہ نے ایک بار پالیٹکس کے نظریے پر چلتے ہوئے اقتدار حاصل کیا تھا۔ وہ آنے والے برسوں میں بھی پاور

پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک کی پارٹی کے اندر سے بہت سے ایسے لوگ
 سامنے آئے ہیں جن کو پارٹی کی برائی آئینہ نگار بننے کی بات کرتے تھے۔ اب سب پارٹی میں
 جیسے کہ وہ ایک شخص کی پارٹی بن گئی تھی۔ انہوں نے محترم سے کہا کہ وہ اپنی اپنی جگہ سے مل کر
 پارٹی کی حکومت بنے اور ان کے کہنے سے وہ وہاں پاکستان واپس آئیں۔ فیصل کا یہ بھی خیال
 تھا کہ سب پارٹی سب سے کوئی بھی یہی پارٹی اس پارٹی میں نہیں تھی کہ وہ حلال شرف کو اپنی شرف نگاہ
 سنبھال کر سنبھال کر رکھیں۔ فیصل نے اس مسئلہ میں یہ بھی کہا کہ محترم نے جتنی بھی عزت حاصل کی تھی
 وہ انہوں نے ان کے خلاف اپنے اندر موجود اس کی مسابقت سے حاصل کی تھی۔ اب انہیں یہ
 سمجھنا پڑا تھا کہ وہ سب مل جانے سے کیوں پارٹی تھیں۔

بینظیر بھٹو نے فیصل مارا حیات کی یہ ساری باتیں چپ ہو کر سنیں اور پھر وہ یوں شروع
 ہوئیں۔ محترم نے کہا کہ فیصل اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔
 ان کے بچوں کا باپ پچھلے سات سال سے جیل میں پڑا ہوا ہے۔ اب اگر وہ بھی جیل چلی گئیں تو ان کے
 بچوں کا خیال کن رکھے گا۔

فیصل نے بی بی کو جواب دیا کہ محترم قوم کے لیڈر ہمیشہ اپنے نہیں اپنی قوم کے بچوں کے لیے
 سوچتے ہیں۔ انہیں نہیں ملتا اور گاندھی کی قائم کی گئی مثالوں پر غور کرنا چاہیے جن کا وہ اکثر اپنی
 تقریریں اور تقریروں میں دہرائیں دیتی رہتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک میں جمہوریت پسند لیڈروں کو
 ہمیشہ کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور ایسے ملکوں کے لیڈروں کو جیل جانے سے خوفزدہ ہونے کے بجائے
 اپنے لوگوں کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ حلال شرف بینظیر بھٹو کو کس طرح کی ذیلی فکر کر رہے تھے۔ وہ
 نے کہ اس قادیان کے وقت میں ہم کو ذرا غم ملایا جاتا تھا۔ کابینہ کے بہت سارے وزراء سب پارٹی
 سے لے جاتے۔ سب کا بیٹھنا سب پارٹی کا ہوتا اور پنجاب میں بھی سب پارٹی کے لیڈروں کو
 کورنگ میں صوبائی اسمبلی کے سلسلے میں حلال شرف پوچھتے تھے کہ بینظیر بھٹو کچھ عرصے کے لیے
 ملک سے باہر ہیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ پھر بینظیر بھٹو نے حلال شرف سے یہ باتیں کیوں نہیں کی تو وہ

اس کے قادیان میں تھے جب سے ان کی حکومت توڑی گئی اس کے بعد وہ کئی بار واپس آئے تھے
 غمزدہ رہے۔ وہ شہر نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں پارٹی میں سے کوئی نیا آدمی
 نہ ملے۔

فیصل نے بتایا کہ انہیں فہیم میں اتنی عزت تھی کہ وہ بینظیر بھٹو کے ساتھ بات کر سکتے
 تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ محترم سے اس انداز میں بات کر رہے تھے۔ فیصل نے بھی بینظیر
 سے یہی کہا کہ وہ وفا کی قیادت سے لڑیں کہ پھر وہاں فہیم کو پوری عزت پہنچے۔
 فیصل کی یہ بات سن کر بینظیر بھٹو نے یہ انداز میں ایک جملہ کہا "You all"

Makhdooms (Faisal and Faheem) feel and think alike

فیصل نے بتایا کہ انہیں فہیم میں اتنی عزت تھی کہ وہ محترم کے ساتھ کھل کر کسی معاملے پر
 بات کر سکتے۔ انہیں فہیم کو اپنی اوقات کا پتہ تھا اور انہوں نے محترم کے ساتھ کبھی بھی اپنی اوقات سے
 باہر نکل کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ بینظیر بھٹو جیل جانے سے کیوں خوفزدہ تھیں تو وہ نے کہا
 سب پارٹی کے اندر ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو یہ نہیں چاہتا تھا کہ محترم پاکستان واپس آئیں کیونکہ وہ ان
 کی عدم موجودگی میں پارٹی کے مامے چاہتے ہوئے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ پارٹی کے اندر کے ہم
 راہوں سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ انہوں نے محترم کے ذہن میں بار بار یہ بات سمجھا کر انہیں خوفزدہ
 کر دیا تھا کہ اگر وہ جیل چلی گئیں تو ان کے پیچھے ان کے بچوں کا خیال کون رکھے گا۔

فیصل نے دہلی میں ہونے والی اس میٹنگ میں بی بی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا ذاتی علاقہ سترال
 انڈیا کی کونسی پر قائم ہے۔

اگرچہ فیصل نے اس وقت نہیں لیا لیکن ان کا واضح اشارہ سترال کی طرف تھا۔

اکتوبر 2002ء کے انتخابات کے بعد سترال پارٹی کی سترال انڈیا کی کونسی پر قائم ہے۔
 انہوں نے اس میں کئی بار یہ بات کہی تھی کہ بینظیر بھٹو کے "ذاتی علاقہ" نے اس میں کئی بار کثرت
 ایسا وقت چندہ کر دیا ہے اس کے لیے تھے۔ یہ عرصہ کہ وہ یہ پارٹی کے انتخابات میں استعمال
 کرنے کے لیے لے گئے تھے لیکن بعد میں یہ سترال قلم بینظیر بھٹو کے "ذاتی علاقہ" نے اپنے حریف

میں نے کہا کہ میں نے یہ نظریہ بھوکا اور بھوکا طور پر یہ بات کی تھی کہ میں آپ کی قیادت کو مستحکم کرنے کو چاہوں گا۔ آپ کے ذاتی سٹاف کی قیادت کو نہیں!

فیصل نے بڑے واضح انداز میں محزون کو بتایا تھا کہ آپ ان لوگوں کو پارٹی لیڈروں پر حاوی نہ ہونے دیں جس کا پارٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن کی پارٹی کے لیے کوئی کھٹ نہیں ہے۔ یہ نظریہ بھوکا کے اس ذاتی سٹاف سے سب لوگ نفرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے پارٹی کو برباد کر دیا تھا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پارٹی کیوں چھوڑی جس کے لیے وہ مٹا دی تھی۔ وہ لوگوں سے سرگرم رہے تھے۔

فیصل نے ایک نئی کہانی سنائی۔

میتھ پارٹی میں ایک وقت دو کام چل رہے تھے۔ ایک طرف پارٹی اصولوں کی بات کر رہی تھی اور دوسری طرف عام کو یہ بتا دیا جا رہا تھا کہ اس پارٹی سے بڑا اور کوئی شخص اصول پسند نہیں تھا جبکہ دوسری طرف امن و امان کو یہ بتا دیا جا رہا تھا کہ وہ جنرل مشرف سے ڈیل کریں۔ مولویوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل کے لیڈروں سے بھی بات چیت جاری تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ پانچ دفعہ ایم این اے کا الیکشن جیت کر آئے تھے اور ان کی وفاداری اور کھٹ کا سب کو علم تھا۔ لیکن جب جو نیوز لوگوں کو ان کا پاس بنایا گیا جنہیں پارٹی آفیسرز کے بارے میں کچھ نہیں تھا تو ان کے دل میں پہلی دفعہ دراڑ پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں بڑی دراڑ اس وقت پڑی جب امن و امان کو یہ نظریہ بھوکا نے یہ پیغام بھیجا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے خلاف ایک سخت لائن لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب پارٹی کے گروپ نے ان سے یہ بات سنوائی کہ جنرل مشرف میتھ پارٹی کے بغیر اسلام آباد میں نئی سیاسی حکومت نہیں قائم کر سکتے تو فیصل صالح حیات نے فوراً یہ بھانپ لیا کہ اب اس ملک کا سیاسی نظام ڈوب رہا ہے۔ وہ فوری طور پر اپنے چند دوستوں سے ملے اور انہوں نے پارٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیصل اور ان کے دوست اس وجہ سے دوبارہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ میتھ پارٹی میں موجود کچھ لوگ انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ فیصل اور ان کے

ساتھ والوں نے لاہور کو بھی کو چھوڑنے کے نام پر ایک کوئی لشکری جمہوریت کو ایک عملی آمریت پر ترجیح دینے کو ایک گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ سیکرٹری جنرل نے میتھ پارٹی کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

فیصل نے بڑی سختی سے میری اس بات کی تردید کی کہ ان پر پریشر ڈال کر ان کی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرانی گئی تھیں۔ ان کے بارے میں سب کو علم تھا کہ وہ ایسے سیاستدان نہیں تھے جن پر ایسا ڈال کر اپنی مرضی کا کوئی کام کرایا جاسکتا تھا۔ وہ ماضی میں کئی دفعہ فوجی آمروں کے خلاف لڑتے ہوئے قتل ہو چکے تھے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے میتھ پارٹی چھوڑی تھی ان کے کردار اور کمینٹ کے بارے میں سب لوگوں کو اچھی طرح علم تھا۔ فیصل تو یہاں تک بھی کہ مجھے کہ جنرل مشرف کے ساتھ میتھ پارٹی کے سارے لیڈر ڈیل کرنے کے لیے پر قول رہے تھے لیکن ہم نے ڈیل اس لیے کی کہ ہم ایک کمزور سیاسی نظام کو چھوڑ دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ ان کی جنرل مشرف سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی تو وہ بولے کہ جب انہوں نے میرٹ ہوئی میں اپنا ایک نیا سیاسی گروپ بنانے کا اعلان کیا تو وہ جنرل مشرف سے ملنے کے لیے گئے اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ ایک باوردی صدر کے حق میں نہیں تھے، لیکن اس وقت ملک کی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ اس وقت ایک باوردی صدر کا ہونا ضروری تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ وہ جنرل مشرف سے ملنے والے میتھ پارٹی کے پہلے لیڈر نہیں تھے جو ہر جنرل مشرف سے اس لیے ملاقاتیں کرتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت کو گرایا جائے۔ میتھ پارٹی کے بی لیڈر جنرل وحید کاکڑ اور جنرل آصف نواز سے بھی ملتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت ختم کرانی جا سکے۔ میتھ پارٹی کے یہ لیڈر ان تو جنرل جہانگیر کرامت سے بھی ملنے کے لیے آر می ہاؤس جاتے تھے۔

فیصل نے بتایا کہ میتھ پارٹی اب منافقوں کی ایک جماعت بن چکی تھی۔ یہ نظریہ بھوکا نے انتخابات سے پہلے جنرل مشرف سے ڈیل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کسی کو ایل ایف او کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اب جب ان کی ڈیل نہیں ہو سکی تو یہ پارلیمنٹ میں جمہوریت کے بہت بڑے مخالف بن کر اب رہے ہیں۔ باقی باتیں چھوڑیں۔ اب متحدہ مجلس عمل کو دیکھ لیں۔ اس کے وزیر اعلیٰ نے ایل ایف او

کے تحت ملک اٹھایا ہوا ہے۔ صوبوں میں تو فی ایم ایل کے ساتھ اقتدار شیئر کیا ہوا ہے اور وہاں انہیں اہمیت اور کوئی احترام نہیں ہے جیسا کہ آئین کی اسٹیبلشمنٹ میں انہیں ملنے آتا ہے۔
فیصل نے کہا کہ اگر محترمہ ایک اصولی ایڈریس تو پھر انہوں نے پی پی پی کے آگے ایک اور پی پی پی لگا دیا اور پی پی پی کو اٹھایا تو اس سے پہلے الیکشن کمیشن میں اس کا نام بدل کر اسے رجسٹر کر دیا۔
فیصل نے جب یہی بات بینظیر بھٹو سے پوچھی تو محترمہ نے انہیں جواب دیا تھا کہ یہ ایک سخت ملی کے تحت کیا گیا ہے۔

فیصل نے محترمہ کو چھوڑ کر آپ مجھے بتائیں کہ اب اسی سخت ملی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا جا رہا تھا۔ اگر پی پی پی 1088 کے انتخابات کا بیانیہ اس وجہ سے کر سکتی تھیں کہ ایک آمر کے تحت ہونے والے انتخابات انہیں قبول نہیں تھے تو 2002ء میں ہونے والے انتخابات میں اسی وجہ سے بائیکاٹ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بینظیر بھٹو اگلی بھی کپڑا مارتا کر رہی تھیں اور آئے والوں دونوں میں بھی دو کپڑا مارتا کر رہی تھیں۔ بالائی انہیں چھوڑ دیں۔ بینظیر بھٹو نے تو اپنی پارٹی کو لوکل باؤی الیکشن لانے کی اجازت ہی دی اور اب وہاں مسلم کے خلاف ہاتھیں لگی کر رہی ہیں۔

فیصل کے بقول ہم لوگوں سے یہ جھوٹ بولتے رہے تھے کہ بینظیر بھٹو 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان واپس آئیں گی۔ ہم سب کو یہ تھا کہ محترمہ نے واپس نہیں آنا تھا۔ ہم پھر بھی تمام لوگوں کے سامنے جھوٹ بولتے رہے اور آخر میں جب وہ واپس آئیں تو ہم عوام اور میڈیا کے سامنے یہ توقف بن کر رہ گئے۔

فیصل نے کہا کہ بینظیر بھٹو کو یہ دیکھنے کی ضرورت تھی کہ اب پارٹی کو ای میل کے ذریعے نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ ان کا پاکستان میں ہونا ضروری تھا۔

میں نے فیصل کو بتایا کہ یہ سب میں آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی بینظیر بھٹو کو پاکستان آنے سے منع کرتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ پاکستان نہیں آ رہی تھیں۔

فیصل مسکراتے اور بولے کہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کے سامنے سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی کیا طاقت تھی۔

میں نے فیصل کو نوکا اور کہا کہ عام لوگوں میں یہ بھی تاثر ہے کہ شاید پیپلز پارٹی کے اندر جو

ذاتیات گروپ بنایا گیا تھا اس میں بینظیر بھٹو کی سرمنشی شامل تھی۔

ذاتیات گروپ بنایا گیا تھا اس میں بینظیر بھٹو کی سرمنشی شامل تھی۔
فیصل نے کہا یہ سب جھوٹ ہے۔ لیکن وہ اس بات پر ابھی بھی قائم تھے کہ یہ گروپ بینظیر بھٹو کی فیصل نے کہا یہ سب جھوٹ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بینظیر بھٹو واپس آنے کو تیار نہیں تھیں۔

وہیں کی رہا ہوا ہوا کہ اس مسئلہ پر اب جب وہ اس ملک کے وزیر داخلہ ہیں۔ اگر بینظیر بھٹو واپس میں نے فیصل سے پوچھا کہ اب جب وہ اس ملک کے وزیر داخلہ ہیں۔ اگر بینظیر بھٹو واپس آئیں تو کیا وہ انہیں جیل میں ڈالیں گے۔

آئیں تو کیا وہ انہیں جیل میں ڈالیں گے۔
فیصل نے اس کا براہ راست جواب دیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو کے خلاف مقدمات ٹیپ نے قائم کیے ہیں اور اس کا ان کی وزارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمام کیسز بینظیر کے خلاف سیف الرحمن نے نوڈل شریف کے دوسرے دور اقتدار میں قائل کیے تھے اور آج تک مسلم لیگ نواز کے کسی بھی لیڈر نے پیپلز پارٹی یا بینظیر بھٹو سے معافی نہیں مانگی تھی۔

میں نے فیصل سے کہا کہ اب جبکہ وہ جنرل شریف کے اقتدار کا حصہ ہیں تو آصف زرداری کو رہا کیوں نہیں کرتے جو ان کے بقول سیف الرحمن کے ہاتھ ہوئے تھے جو نے مقدمات کی وجہ سے جیل میں بند ہوئے تھے۔

ایک ممبر فیصل نے ایک دفعہ پھر مجھے روایتی اور لاپرواہانہ سا جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آصف زرداری کا انصاف پر مبنی لٹرائل کیا جائے۔ ایک وزیر داخلہ ہونے کے ناطے وزیر زرداری صاحب کو جیل میں جتنی سہولتیں فراہم کر سکتے تھے انہوں نے اپنے اس پرانے دوست کو پہلے ہی فراہم کر دی تھیں۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آصف زرداری کا لیٹر لٹرائل ہونا چاہیے۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ انہوں نے کپڑا مارتا کرنے کے بعد ہی پیپلز پارٹی کو چھوڑا تھا۔
او کپڑا مارتا کرنے والے کوئی پہلے اور آخری لیڈر نہیں تھے۔ پوری کی پوری پیپلز پارٹی کپڑا مارتا کرتی رہی تھی۔

فیصل نے کہا کہ اگر ہم ماضی میں ایک سو دفعہ کپڑا مارتا کر چکے ہیں تو ایک اور کپڑا مارتا کرنے میں کیا حرج تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ پارٹی کے لیڈروں کو کپڑا مارتا کرنا بینظیر بھٹو نے سکھایا تھا۔

فیصل کی یہ مایوس کردینے والی بات سن کر میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں

بیایا عقوبات باطل تم ہو کر وہی نہیں۔ فیصل نے بغیر جیل و محنت کے مجھے کہا کہ میں یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں بیایا عقوبات کی موت واقع ہو رہی تھی۔

میں نے کہا کہ یہ بیایا عقوبات کی کیا بات کریں جب ماضی میں ایک دوسرے کے جملے جملہ پڑتی تھیں اور یہ بیایا عقوبات ایک ہی دامن میں اکٹھے بیٹھے تھے۔

میں نے فیصل صالح حیات کے آخر سے مجھے سے پہلے ان سے ایک آخری سوال پوچھا کہ کیا ماضی پڑتی میں کبھی دوبارہ مثال سے پتہ کریں گے جس کے لیے انہوں نے کئی دنوں سے مجھے میں گورے ہوئے تھے۔ ان کے انوکھے حال اس پڑتی کو دینے تو جنرل شرف کے اس خوبصورت اور پرتشدد اور طاقتور نے مجھے جواب دیا کہ اب میں کبھی دوبارہ زندگی میں یہ نظیر بھڑکی پڑتی میں نہیں پڑاں گا اب میری یہ ایک پڑتی ہے اور یہ ایک شہد و بیایا عقوبات۔

○○○

اس شروع کے بعد میرے بعد فیصل احمد گجرات کے چودہویں پوجن الٹی اور چودہویں شہادت کے اور یہاں نہیں گئی۔ چودہویں پوجن الٹی نے سب عادت و عذاب میں ہر اس لینڈ کو تنگ کرنا شروع کر دیا جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی شک تھا کہ وہ جنرل شرف کے قریب تھا یا کل کلاں کو ان کے وزیر اعظم بننے کی کچن کی فراہم کے آگے توڑی سی بھی مزاحمت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پینچلز پڑتی پینچلز کے ارکان سب سے زیادہ پوجن الٹی کے لگانے پر آئے۔ ان کے علاوہ فاروق لغاری، رانا سکندر اقبال، فیصل صالح حیات، انکڑ شیر گل خان لہاری، انیسویں اختر، جہاگیر خان ترین اور دیگر ایسے لینڈ ان تھے جن پر ہر وقت وزیر اعلیٰ پوجن الٹی کی نظر کرم ضرورت سے زیادہ رہتی۔ تاہم، باقی لینڈروں کے، مگر فیصل صالح حیات ڈٹ کر چودہویں کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ وہ دوسروں کی نسبت ان چودہویں کی کوئی غرض آمد نہیں کرتے تھے۔ فیصل کا خیال یہ تھا کہ جب ان سب کو جنرل شرف کے اور ہار سے ہی فیصل ملتا تھا تو پھر وہ میدان میں اپنی قیمت چودہویں پوجن الٹی اور چودہویں شہادت میں پیسے پاور برادر سے کیوں گولی ہائے۔ اگر غور نہ کرنی ہی ہے تو جنرل شرف کی کیوں نہ کی جائے۔ چودہویں کو فیصل کی اس عادت سے بڑی پڑتی تھی۔ فیصل انہیں اس وجہ سے بھی ہاپس نہ تھے کہ

ان کے پاس وزارت داخلہ کا حکم ان تھا جو ان شریف کے چھپنے والا دار میں بیٹھ چودہویں شہادت کے پاس رہتا تھا۔ شاید ہی وزارت کی بدولت چودہویں شہادت میں کوئی ایسا ایسا گجرات اور اس کے انوکھے علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو بچان اور پھپ کے دیگر ملکوں میں پھیل کرنے میں تیار نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چودہویں شہادت کو فیصل کی موجودگی میں وزارت داخلہ کو استہلال کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا جو ماضی میں ہر وقت۔ چودہویں شہادت کو فیصل کو بچا رکھنے کا سب سے سزاوارتہ حق اس وقت کا جب جنرل پوجن شرف نے ہر خطرہ احتیاطی کو ہٹا کر چودہویں شہادت کو پاپا میں ان کے لیے کفر و ہرزہ پر اعظم ٹھکانا تاکہ شوکت عزیز کی پیشی جیت کر ان کی جگہ لے سکیں۔ اچھی قابل ان کا کام بھارت پر مبنی صاحب نے ان سے ایک کام لکھا جس میں انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ سابق وزیر داخلہ شاید انسانی سنگت میں ملوث تھے اور یہ طایف نے حکومت پاکستان کو اس بارے میں ایک باقاعدہ خط لکھا تھا۔ اس کام کا یہ قاعدہ ہوا کہ فیصل صالح حیات کو دوسری دفعہ وزارت داخلہ نہیں ملی۔ جب شوکت عزیز نے نئی کابینہ بنائی تو انہیں وزیر ماحولیات بنا دیا گیا۔ فیصل صالح حیات بھی چودہویں شہادت علی خان کی طرح ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی ایسی چیز چھپ جائے جو انہیں پسند نہ ہو تو یہی وجہ تک اس کا جواب نہ دے دیں آرام سے نہیں بیٹھتے۔

شوکت عزیز کی کینٹ بننے سے ایک دن پہلے فیصل صالح حیات کا مجھے فون آیا۔ وہ اس مسئلے پر اپنا اندر دینا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے اس اندر دینے میں گجرات کے چودہویں پر شدید حملے کیے اور مجھے ان پولیس آفیسروں کے نام دیے جنہیں انہوں نے وزیر داخلہ کے طور پر ایف آئی اے سے انسانی سنگت کے الزامات پر لکھا تھا اور انکے روز ہی مہنگا حکومت نے انہیں صوبے میں بڑے بڑے جہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ فیصل نے اس اندر دینے میں پوری تفسیلات بتائیں کہ کیسے چودہویں صاحبان ماضی میں انسانی سنگت میں ملوث رہے تھے۔

جوئی انکی صبح یہ اندر دینے پہنچا، دوپہر کے وقت مجھے فیصل صالح حیات کا فون آیا۔ وہ بڑے اظہار ہوا میں تھے اور بولے کہ ابھی صدر شرف سے مل کر آ رہا ہوں۔ ان کے موڈ سے لگتا تھا کہ بات بہت بڑی اچھی رہی تھی۔ صدر نے اس بات پر غلطی کا اظہار کیا تھا کہ انہیں دی نیوز کو اندر دینے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ اس سے ان کی حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ایک دوسرے سے اختلافات بڑھ

[illegible][illegible]

ایک بات طے تھی کہ فیصل صالح حیات اور رعبہ پر بیرون اشرف میں اب یہ سیاسی سے زیادہ فلاحی
 کام کر رہے تھے۔

پیشانی بکلی تھکی۔
فیصل صالح حیات کو رعبہ پرویز اشرف پر ایک طاقتور حملہ کرنے کا موقع جون 2010ء میں اس وقت ملا جب کثرت پرست کے دوران فیصل نے ایک دفعہ پھر رعبہ پرویز اشرف کی سبوتاژ کوشش کی کہہ چاہاں وہ فی شریعہ کہیں۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی اس وقت قومی اسمبلی میں موجود تھے۔ فیصل صالح حیات نے اسے بہترین موقع جانا اور کہا کہ رعبہ پرویز اشرف پر کوشش کی منصوبہ پاں دی نیوز کے رائف حیات نے فائل کی تھیں۔ فیصل نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی بات میں مدد مل گیا اگرستے کے لیے انہوں نے یہ کہا کہ رائف کھراسراوہ ہیں جنہوں نے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی کتاب ”چادو یوسف“ سے سراسر کھسکی تھی۔ فیصل کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جس رچرڈ سے گیلانی صاحب نے اپنی کتاب لکھوائی تھی وہ جیسا کہ خبریں کیسے دے سکتا ہے۔

ان پر پست رہا گیا فی صاحب کفر سے ہوئے انہوں نے علی ہوج اشرف ہر کائنات کے
تکبر کے اثرات پتہ کچھ نہیں کہا، تاہم انہی مسائل دیتے ہوئے انہوں نے غور کیا کہ یہ بات درست
ہے کہ کائنات کو سر ان کے ذوق دوست چلے۔ جب وہ جنم میں تھے تو وہ ان سے ملے جاتے تھے ان
انہوں نے اپنی کتاب قلم لکھی ہے۔

گیاں صاحب کی یہ بات درست تھی کہ انہیں نے اپنے آپ جتنی خودکشی ہے۔ ہاں یہ ضرور
 ہے کہ پانچ تھے کہ میں ان کی آپ جتنی کا مخرج ہی تندر کھوں۔

میں بعد فیصل نے قوی اسکی میں بھر دیا یہاں شرف کو اس وقت آئے ہاتھوں نے لایا
جب در سوہن نے ان کی "تمیں میں پہلے کی گئی تحریر کے جوابات دینے کی کوشش کی۔ بعد یہاں
شریف نے فیصل صلیحیات پر بھی کرکشن کے بارے میں اعتراضات لگائے جس پر فیصل نے ایک خط
لکھا یہ سب کی طرح اس پوری کہانی کو پارک دیا اور قوی اسکی میں کھڑے ہو کر کہا کہ "جب
آپ پر کرکشن کی سند پر رواف لکھوانے کا عمل کی ہیں۔ میں نے تو صرف انکی پارلیمنٹ میں کھڑے
ہو کر دیا ہے۔"

آپ پر بھی روج اشرف نے لکھا کہ اور پھر فرحان کا آپ پر ہم لکھ رہے ہیں وہ تو ایک سکر ہے۔

بعد فیصل جیسا بھدار سیاستدان اس موقع کو کیسے ضائع جانے دیتا۔ وہ مسکراتے ہوئے
 کھڑے ہوئے اور بولے کہ جناب ایہ بڑی گریب سی بات ہے کہ جس رچرچر کے بارے میں آپ کہہ
 رہے ہیں کہ وہ بیک بھر ہے اس کے بارے میں وہ دن پہلے ہی آپ کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی
 نے اسی جگہ کھڑے ہو کر فرمایا تھا کہ وہ ان کا ذاتی دوست ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ یوسف رضا
 گیلانی صاحب اپنے وزیروں کے خلاف خود ہی خیریں گوارا ہے جس۔
 اس کے بعد بعد صاحب کی حالت دیکھنے والی جی اور فیصل صالح حیات مسکراتے ہوئے قومی
 اسمبلی کے ہال سے باہر نکل گئے۔

امین فہیم

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد امین فہیم کو پہلی دفعہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ اب کی دفعہ
 وزیر اعظم نہ بنے تو پھر وہ کبھی نہیں بن سکیں گئیں۔ اس سے بہتر موقع ان کی زندگی میں نہیں آ سکتا تھا۔
 پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے انتخابات میں پی ایم ایل کیوں کے بعد زیادہ سنیٹیں لے چکی تھی۔ پی ایم
 ایل کیوں کو ہاؤس میں سادہ اکثریت نہیں مل سکی تھی۔ حکومت بنانے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل پرویز
 مشرف پیپلز پارٹی کے ساتھ ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیں۔ اگر پیپلز پارٹی اس اتحاد میں شریک ہونے
 سے انکار کرتی تو پھر جنرل مشرف کو پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے الیکشن کرانا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ
 جنرل پرویز مشرف ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے پر تیار ہو گئے۔
 اب صرف بینظیر بھٹو کی ایک چھوٹی سی ہاں کی ضرورت تھی۔ بینظیر بھٹو نے امین فہیم کو لندن بلا لیا تھا۔ اس
 ملاقات میں یہ طے ہونا تھا کہ بینظیر بھٹو امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے پر تیار تھیں یا نہیں۔
 لندن جانے سے قبل آئی ایس آئی کے افسران کے ساتھ امین فہیم کی ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔
 ایک مرحلہ تو یہ بھی آیا کہ ان مذاکرات میں آصف علی زرداری بھی شامل ہو گئے اور اس وقت کے ڈی جی
 آئی ایس آئی جنرل احسان الحق اور ڈپٹی ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل احتشام ضمیر کے ساتھ خفیہ
 ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

ایک رات امن فہیم آصف زرداری کو پھر ہسپتال کے کمرے سے اس طرح پندری چپکے آئی ایس آئی کے بریلوں سے ملانے لے گئے کہ سیکرٹری پر تعینات گارڈز کو بھی کان خبر نہ ہوئی۔ یہ ملاقات اتنی خفیہ رکھی گئی تھی کہ اس کا بینکیر بھٹو کو بھی علم نہیں تھا۔ کسی کام سے بینکیر بھٹو نے آصف زرداری کو واشنگٹن سے کال کیا تو ان کا فون بند ملا۔ ایک دو اور لوگوں سے بی بی نے پوچھنے کی کوشش کی تو بھی انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بینکیر بھٹو کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھیں کہ جنرل مشرف نے ان کے خانہ کو ہسپتال سے افوا کر لیا ہے اور زرداری صاحب کی جان خطرے میں ہے۔ زرداری صاحب کو افوا کر کے جنرل مشرف ان پر اپنی مرضی کی ڈیل مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں بینکیر بھٹو نے واشنگٹن میں مشہور صحافیوں شاہین صہبائی، خالد حسن، انور اقبال اور دیگر کو فون کر کے آصف زرداری کے افوا کی خبر دینا شروع کر دی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر آصف زرداری کو کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار جنرل پرویز مشرف ہوں گے۔

پاکستان میں اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں ابھی بھی اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اچانک ایم ایس این سیکٹر پر شاہین صہبائی صاحب، جو واشنگٹن میں تھے، نے مجھے جیلو کیا اور بولے رات تمہارے لیے ایک بہت ہی خبر ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ کل صبح کی تمہاری لینڈ سٹوری بن سکتی ہے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ بینکیر بھٹو اس وقت شدید ہراساں ہیں کیونکہ آصف زرداری پھر ہسپتال کے کمرے سے قلاب ہو چکے ہیں اور کسی کو کوئی علم نہیں کہ انہیں کون وہاں سے افوا کر کے لے گیا ہے۔

میں یہ خبر سن کر واقعی چونک گیا۔ شاہین صاحب سے دو چار اور نہیں لیے۔ کہیں سے آصف زرداری صاحب کے ساتھ رہنے والے ڈاکٹر قیوم سومرو کا موبائل نمبر لیا۔ ڈاکٹر قیوم سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ انہیں یہ تھا کہ زرداری صاحب کو کون کہاں لے گیا ہے۔ دراصل بینکیر بھٹو کو آصف زرداری اور امن فہیم دونوں کے فون بندل رہے تھے لہذا وہ پریشان ہو گئی تھیں اور جلد بازی میں انہوں نے صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بینکیر بھٹو کو یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ زرداری صاحب اس وقت جنرل احسان سے ملاقات کر رہے ہیں اور مستقبل کی حکومت اور وزیراعظم کے نام پر مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اب بینکیر بھٹو پختاری تھیں کہ انہوں نے کیونکر اتنی جلدی صحافیوں کو فون کرنا شروع کیا تھا جس سے بات تھوڑی ہی بگڑ گئی تھی۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں نے فوری طور پر اس کی خبر دہائی جو اگلے دن دی نیوز کی لینڈ سٹوری گئی جس سے عام پبلک اور سیاسی لیڈروں کو احساس ہوا کہ مذاکرات اب بہت پیچیدہ مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی کے لیے آصف زرداری کو آئی ایس آئی کے سیف ہاؤس میں رات کے اندھیرے میں جنرل احسان اور دیگر جنرلوں سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اس ملاقات میں ہی جنرل مشرف کے جرنیلوں نے بینکیر بھٹو کو یہ قائل آفر دی تھی کہ وہ امن فہیم کو پاکستان کا وزیراعظم بننے دیں۔ چوہدری شجاعت حسین کے ساتھ مل کر ایک کا بیج بنائیں جس میں بینکیر بھٹو کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ بھی بینکیر بھٹو کو دی جائے گی۔ پنجاب میں چوہدری سکرائی کریں گے لیکن وہاں بھی بینکیر بھٹو کو کچھ وزارتیں دی جا سکتی ہیں۔ صوبہ سرحد مولویوں کے حوالے کرنا تھا جبکہ بلوچستان میں بی ایم ایل کیے اور مولویوں نے مل کر حکومت چلی تھی۔ یوں جنرل مشرف بڑی بکھاری سے ماسوائے نواز شریف کی پارٹی کے تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار شیر کرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ نواز شریف کی جماعت صرف اپوزیشن میں رہ جاتی اور بھٹو جس کے قریب ایم این اے 342 کے ہاؤس میں جنرل مشرف کے لیے کیا مسائل بنے کر سکتے تھے۔ نواز شریف اور بینکیر بھٹو ملک سے باہر تھے اور یوں جنرل مشرف کے اقتدار کو دور دور تک کہیں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جنرل مشرف نے اپنے ہمیں ایک بڑا افوا بصورت پلان بنایا تھا لیکن اس کا سارا دار و مدار بینکیر بھٹو اور محمد امین فہیم کی لندن میں ہونے والی ملاقات پر تھا۔

لندن جا کر امین فہیم نے بینکیر بھٹو کے سامنے یہ سارا پلان رکھا اور بتایا کہ جنرل صاحب انہیں وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی شرط تھی کہ بینکیر بھٹو تین سال تک پاکستان واپس نہیں آئیں گی۔

بینکیر بھٹو مسکرائیں اور انہوں نے امن فہیم جنہیں وہ سیکرٹ ایکٹائیووں اور جنرل مشرف سے مذاکرات کے لیے استعمال کر رہی تھیں سے پوچھا کہ محمد امین صاحب! مجھے یہ تو بتائیں کہ اس پوری فریل میں میرے لیے کیا ہے؟

پارٹی میں لے کر آئیں۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب سے وعدہ کر لیا۔

امین فہیم بھٹو صاحب کے ذریعہ سے بہت متاثر تھے اور یہ جانتا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کپڑے کہاں سے خریدتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے امین فہیم کو بانگ کا بانگ میں ایک چھٹی شاپ کے بارے میں بتایا کہ جب بھی وہاں جاؤ تو شرٹس وہاں سے خریدنا اور ہاں میرے لیے بھی لانا۔ بھٹو صاحب اپنے جوتے لندن سے خریدتے تھے اور کبھی انہوں نے کسی سنگل شاپ سے ہائی نہیں خریدی تھی۔

جب امین فہیم نے پاکستان واپس آ کر اپنے باپ سے بات کی کہ وہ بھٹو کی پارٹی کو جائز کریں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خود ایک بہت بڑے فیوڈل تھے۔ وہ بھلا کسی اور فیوڈل کی پارٹی میں شامل کیوں ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پیداؤٹی مسلم لیگی تھے اور کسی مسلم لیگی کے لیے اپنی سیاسی وابستگیاں تبدیل کرنا مناسب نہیں تھا۔

امین فہیم اسرار کرتے رہے کیونکہ وہ بھٹو صاحب سے وعدہ کر چکے تھے۔

امین فہیم اپنے باپ کو اس بات پر قائل کرنے میں لگے رہے کہ نئی سیاسی پارٹی جائز کرنے سے انہیں کیا کیا فائدہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ آخر کار انہوں نے اپنے باپ کو قائل کر لیا۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب کو پیغام بھیجا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا ہے۔

بھٹو صاحب نے فوری طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی اور میر غلام رسول جیلانی کو مخدوم آف ہالا بھیجا تاکہ وہ طالب المولا کوئی پارٹی جائز کرنے کی دعوت دے سکیں۔ مخدوم طالب المولا کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر بہت خوشیاں منائی گئیں کیونکہ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ہالا کے مخدوموں کے پارٹی میں شامل ہونے سے انہوں نے سندھ میں تقریباً آدھی سے زیادہ سیاسی جنگ جیت لی ہے۔

ابھی پیپلز پارٹی کو بنے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ملک میں ہونے والے نئے انتخابات میں الیکشن میں حصہ لینے کے مسئلے پر پارٹی میں دو دھڑے بن گئے۔ پارٹی کے اندر ایک ایسا گروپ تھا جو کونڈ سوشلسٹ لیڈروں پر مشتمل تھا جس میں ڈاکٹر بشیر حسن، بے رحیم، معراج محمد خان، شمیم خان اور میر علی احمد تالپر جیسے لوگ شامل تھے۔ وہ روس اور چین کی طرز پر انقلاب لاکر اقتدار میں آنے کے حق میں تھے۔ وہ اس بات کے خلاف تھے کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔

دوسرا گروپ جس کی قیادت مخدوم آف ہالا کر رہے تھے، وہ انتخابات میں حصہ لینے کے حامی

تھے۔ بھٹو صاحب نے مخدوم آف ہالا کی حمایت کر دی اور یوں انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

بھٹو صاحب نے اپنی انتخابی مہم سندھ سے شروع کی اور امین فہیم کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ ہر جگہ بھٹو صاحب کے ساتھ چلے جلوسوں میں شریک ہوتے رہے۔

جب الیکشن کا رزلٹ آیا تو سب لوگ ششدر رہ گئے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے جاپان چلے گئے۔ وہ ابھی دنیا گھومنا پھرنا چاہتے تھے۔

امین فہیم ابھی اپنی نئی منزل پر پہنچے ہی تھے کہ انہیں جام صادق علی کی کال آئی۔ بھٹو صاحب جانتے تھے کہ امین فہیم ان کی ایک خالی کی ہوئی نشست پر ضمنی انتخابات میں حصہ لیں۔ شروع میں امین فہیم نے مزاحمت کی تاہم واپس آ کر الیکشن لڑا اور جیت گئے۔ انہیں سندھ کے گورنر ممتاز بھٹو کا فوڈ اور ایئر ٹکٹ پراویڈ وائزر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد امین فہیم کو اسلام آباد لے آیا گیا جب بھٹو صاحب اس ملک کا نیا آئین بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ آئین بننے کے تمام مراحل میں شریک رہے۔ بھٹو صاحب نے انہیں وزیر مملکت برائے کابینٹ ڈویژن اور پارلیمانی امور بنادیا۔

میں اس دوران خاموشی سے بیٹھا یہ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ جونہی امین فہیم نے پیپلز پارٹی کے ساتھ شروع کیے گئے اپنے سیاسی سفر کی کہانی ختم کی، میں نے ان سے پوچھا کہ سیاست میں اتنا اچھا نارت لینے کے باوجود بھٹو صاحب کا اتنا برا انجام کیوں ہوا؟

امین فہیم شاید اتنی جلدی اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ وہ خاصی دیر خاموش رہے۔ اپنے آپ کو تھوڑا سنبھالا اور پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی طاقتوں نے بھٹو صاحب پر اپنا ہانڈا باندھنا شروع کر دیا تھا۔ نئی معاملات چلانے کے لیے بھٹو صاحب کو چند غلط مشورے بھی دیے گئے۔ دراصل وہ لوگ بھٹو صاحب کے اس انجام کے ذمہ دار تھے جو شاہ سے زیادہ شاد کے وفادار تھے۔

میں نے امین فہیم سے ان لوگوں کے نام پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور کہنے لگے کہ اب وہ اپنے دوستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پہلے ہی

ذات پر پکے تھے۔
 انہیں انجمن کا خیال تھا کہ انچیزیں ہمنو صاحب کے خلاف گئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جس نے بھی ہمنو صاحب کو فوت سے پہلے 1978ء میں سے انتخابات کرانے کا مشورہ دیا تھا اس نے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ ہمنو پارٹی کی حکومت کا ابھی ایک سال باقی تھا۔ ہر چیز بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی۔ ملک میں سے انتخابات کا اعلان کر کے خواہ تو وہ ایک نیا الیکٹورل کیا گیا جس کے بوجھ سے آ کر ہمنو صاحب کی جان بلی گئی۔ دوسرے کہ جن لوگوں نے ہمنو صاحب اور پارٹی کے کچھ اور لوگوں کو بڑا مقابلہ کامیاب کر دیا تھا انہوں نے بھی ہمنو صاحب کے ساتھ کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا بلکہ ایک طرح سے انہوں نے ہمنو صاحب کے زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔

میں نے کہا کہ انجمن ہمنو صاحب! ہمنو صاحب ایک بڑے لیڈر تھے۔ انہوں نے کہاں اس طرح کا مشورہ قبول کر لیا اور اپنے آپ کو بڑا مقابلہ کامیاب کر لیا؟
 انجمن نے فوراً ان کو زور سے جھٹکا کہ بڑے بڑے لوگ تو لکھی بات نہیں تھی۔ ہمنو صاحب نے اس طرح کے کسی منصوبے کی جھڑپی نہیں کی تھی ان کے عقائدوں نے خود ہی پیچھے خٹکے یہ سارا کام کیا تھا ہمنو صاحب تو مسیحی تھے ان سے شادی نہیں ہوئی تھی جب انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ صوبے کے وزیر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے انہیں نے اپنے آپ کو بڑا مقابلہ منتخب کر لیا تھا۔

ان بات میں حیرت سے کہنے کے لیے کہ ہمنو صاحب بڑا مقابلہ منتخب کرانے کے پان کا سر نہیں تھے۔ انجمن نے کہا کہ ان کے اپنے بھروسے والی ہندو پیچھے چلانے کے لیے بڑا مقابلہ منتخب کرنا چاہتے تھے۔ انجمن نے جو مندرجہ صحتی حلقہ کو یوں کیا تو آگے سے انہوں نے بتایا کہ ہمنو صاحب پہلے ہی اس سے اس بات پر مشورہ کر چکے تھے کہ انہوں نے کہاں اپنے آپ کو بڑا مقابلہ چھوڑ دے لیکن بڑا مقابلہ منتخب کر لیا۔

انجمن کا خیال تھا کہ ان کی خدمت کے بعد ہمنو صاحب جس سے بہا ہونے کا وہم نہ ہو کہ بڑا مقابلہ انتخاب کر لیا تو حلال فیض تو وہ ہو گئے۔ حلال فیض کے لیے خود ہی سوچا تھا کہ ان کو چلانے کے لیے ہمنو صاحب کو بڑا مقابلہ منتخب کر لیا۔ یہ فیض ہمنو صاحب سے کسی ایک گھنٹہ کے بعد حلال فیض کے پاس آتا تھا کہ وہ بڑا مقابلہ ہمنو صاحب کی انگوٹھی سے لے کر

دیا گیا۔
 ہمنو صاحب کو چھانسی دی جا چکی تھی۔ اکثریت کا خیال تھا کہ اب ہمنو پارٹی ختم ہو جائے گی۔ ہمنو پارٹی تھر ہتر ہو چکی تھی۔ ہمنو کے وفاداروں کو سندھ میں تشدد اور موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ پارٹی پارٹی لوگوں پر زندہ کیاں لگ کر دی گئی تھیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ہمنو سے محبت کرتے تھے۔ انجمن نے اپنے 10 بھائیوں ہمنو دم ظلیق الزماں اور رفیق الزماں کو قتل میں ڈال دیا گیا۔ حلال فیض کا وہ تاریخ کا بدترین دور تھا۔ تاہم ہمنو دم ظلیق فیض کے آگے نہیں ہٹے۔ ایک مرحلے پر حلال فیض نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حق کا راستہ نکلتے آچکے ہیں اور اب وہ ہمنو دم ظلیق بالاکو اپنے ساتھ لانا چاہتے ہیں۔ اپنے سیاسی اقتدار کو وہ دم ظلیق کے لیے حلال فیض سندھ میں سے سیاسی دوست بنانا چاہتے تھے۔

یہ گینگسٹر اتیار ان دنوں سندھ میں آئی ایس آئی کے انچارج تھے۔ انہوں نے انجمن ہمنو کو فون کیا اور بتایا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمنو دم ظلیق ان سے ملنے سے انکار کیا۔ جب یہ گینگسٹر اتیار کا سر راز یہ حوالہ انجمن ہمنو نے اپنے باپ کو ان سے ملنے کے لیے دیا تھی کہ ان کے ملاقات سے یہ بات سامنے آئی کہ حلال فیض ہمنو دم ظلیق ان کو لانا چاہتے ہیں۔ انجمن ہمنو نے اپنے باپ کو ان سے ملنے کے لیے دیا تھی کہ ان کے ملاقات سے یہ بات سامنے آئی کہ حلال فیض ہمنو دم ظلیق ان کو لانا چاہتے ہیں۔

جب یہ گینگسٹر اتیار نے یہ پیشکش کی تو ہمنو دم ظلیق ان کو لانا چاہتے ہیں۔ انجمن ہمنو نے یہ گینگسٹر اتیار سے کہا کہ ان کے گھر سے نکل جائے۔

انجمن نے مجھے خود یہ بتایا کہ جب یہ گینگسٹر اتیار نے یہ بات سنی تو انہوں نے اس سے ملنے کے لیے اپنے باپ کے قدموں میں جھک گئے اور ان سے بھیک مانگنے لگے کہ وہ حلال فیض کی یہ پیشکش قبول کر لیں۔

ہمنو دم ظلیق نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ حلال فیض کے ساتھ ہمنو دم ظلیق کے لیے ایک گھنٹہ جواب دینے میں انہیں کوئی گنجی نہیں چاہا۔ ان کا دوست سید محمد حسین قریشی نے ان کو جواب دیا کہ وہ

یہ گینگسٹر اتیار نے ہمت نہیں ہاری تھی انہوں نے یہی آخر میں انجمن ہمنو سے ہمہ تن ہمت لے لیا تھا کہ

بریگیڈیئر امتیاز نے بھی کوئیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ وہ امین فہیم کے پیچھے گئے رہے۔ آخر
امین فہیم مان گئے لیکن انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اس صورت میں سندھ
حکومت میں شامل ہوں گے اگر ان کے ساتھ جام صادق علی اور غلام علی اللہ مانی کو بھی وزیر بنایا جائے۔

جام صادق علی ان دنوں لندن میں جلا وطنی کے دن گزار رہے تھے۔
بریگیڈیئر امتیاز نے انہیں وزیر بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔
یہ ٹیگہ بات تھی کہ بعد میں اسی اسٹبلشمنٹ اور سیکرٹ ایجنسیوں نے اسی بھارتی ایجنٹ جام
صادق علی کو 1991-93 میں سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا کر پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔

جب جنرل ضیاء کو محمد عامر طالب المولا کے انکار کا پتہ چلا تو انہوں نے خود ان سے ملنے کی
طواغلی کی لیکن محمد عامر طالب المولا نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ ساری بات چیت آگے پران نہ چڑھ سکی تو امین فہیم امریکہ چلے گئے جہاں 17 اگست
1988 کو انہوں نے جنرل ضیاء کے طیارے کے حادثے کی خبر سنی۔

امین فہیم فوری طور پر پاکستان لوٹ آئے۔ پیپلز پارٹی نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی۔
اسٹبلشمنٹ نے ایک وفد بھرا ہوا کھیل شروع کر دیا۔ وہ بھٹو خاندان میں سے کسی کو بھی

وزیراعظم بنانے پر تیار نہیں تھے۔ اب کی وفد اسٹبلشمنٹ امین فہیم کو توڑ کر ملک کا وزیراعظم بنانا چاہتی
تھی۔ ایک دن امین فہیم کو پتہ چلا کہ فرزند راولپنڈی شیخ رشید احمد جو اس وقت سیاست میں اسنے نہیں

جانے جاتے تھے اور چودھری انور عزیز ان سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس وقت
کے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق خان کا ایک پیغام انہیں دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کو چھوڑ کر

اس ملک کے نئے وزیراعظم بن جائیں۔ امین فہیم کو بتایا گیا کہ انہیں سندھ سے قابل اعتماد بندے کی
ضرورت ہے۔ آرمی چیف اور صدر بینظیر بھٹو کے بھائے انہیں وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں

نے یہ تجویز دی کہ وہ پارٹی کے اندر ایک فارورڈ بلاک بنائیں لیکن امین فہیم نے انکار کر دیا۔
میں نے امین فہیم سے پوچھا کہ جب آپ کے خاندان نے پیپلز پارٹی کے لیے اتنی قربانیاں

دی تھیں اور وہ بھٹو فیملی کے وفادار بھی رہے پھر بھی بینظیر بھٹو نے انہیں اس ملک کا وزیراعظم نہیں بننے
دیا۔

امین فہیم نے جہد لگایا اور بولے کہ جب ان کی بینظیر بھٹو صاحبہ سے 11 اکتوبر 2002 کو لندن
میں ملاقات ہوئی تھی تو محترمہ نے انہیں پیپلز پارٹی حکومت بنانے کا پورا اختیار دے دیا تھا۔ محترمہ نے
امین فہیم سے کہا تھا کہ وہ پی ایم ایل کیو کی لیڈر شپ سے پاؤر شیئرنگ معاہدے کے لیے گفتگو شروع
کریں۔ امین فہیم کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب ان مذاکرات میں ان کے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ

وزیراعظم بننے کے بعد بینظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔
میں نے کہا کہ محمد عامر صاحب اعموماً یہ کہا جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ پیپلز پارٹی

میں سے کوئی سندھی لیڈر وزیراعظم بنے کیونکہ اس کے بعد ان کی اپنی پارکینگ پوزیشن ہمیشہ کے
لیے کمزور ہو جاتی۔

امین فہیم نے بڑی شدت سے اس تاثر کو مسترد کیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو واقعی انہیں وزیراعظم بنانا
چاہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آصف علی زرداری کو 2002ء کے انتخابات کے بعد حکومت بنانے کے لیے

ہونے والے مذاکرات میں شامل کیا گیا تھا۔
میں نے کہا کہ امین فہیم صاحبہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے بیٹے کو بھی سندھ کا وزیراعلیٰ نہ

ہونے میں بینظیر بھٹو کا بڑا ہاتھ تھا حالانکہ جنرل مشرف اور آپ کے ساتھی ان کے بیٹے کو یہ عہدہ دینے
کے لیے تیار تھے۔

امین فہیم نے یہ کہہ کر پھر بینظیر بھٹو کا دفاع کیا کہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ جب انہیں جنرل
مشرف کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے کو سندھ کا چیف منسٹر بنوالیں تو انہوں نے محترمہ سے

رابطہ کر کے یہ ساری بات انہیں بتائی تھی۔ محترمہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کے لوگوں کو اتحاد میں
لے لیں اور سب لوگ تقریباً اس پر راضی بھی ہو گئے تھے۔ جنرل مشرف اور پیپلز پارٹی کے درمیان اُمید

تقریباً قائل ہو چکی تھی۔ جنرل مشرف نے ان کے بیٹے کو وزیراعلیٰ سندھ بنانے کی منظوری دیدی تھی۔
چودھری شجاعت حسین اور وزیراعظم ظفر اللہ بھٹائی نے کراچی پہنچ کر ایک پریس کانفرنس میں ان کے بیٹے

کو چیف منسٹر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔
اس پریس کانفرنس سے چند گھنٹے پہلے امین فہیم کو ایک ٹیلیفون کال آئی۔ انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے

بیٹے کو گھنٹہ گھر اور وزیراعلیٰ بننا چاہتے ہیں تو پہلے پیپلز پارٹی سے اعلان التعلقی کریں۔

امین فہیم سے ہر اتیرا کر 2008ء کے شروع میں ہوا جب فروری کے انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو پاکستان کا وزیراعظم بھگنے لگے تھے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ نوڈیر میں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی وکی پریس کانفرنس میں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے آپ کو بڑا دل بھڑ زرداری کے ساتھ کوٹھڑ پر سن سنبھ کر کرنا کر یہ اعلان کیا تھا کہ امین فہیم ان کے وزارت علی کے امیدوار ہوں گے۔

29 دسمبر 2007ء کو نوڈیر میں ہونے والی اس پریس کانفرنس میں میں بھی موجود تھا۔ میں وہاں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اپنے اخبار دی نیوز کے لیے رپورٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میری وجہ تھی کہ فروری کے انتخابات میں جب بینظیر پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو امین فہیم نے اپنے آپ کو ملک کا وزیراعظم بھگنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے چالیس سال پرانے دوست بینظیر انور بیک نے امین فہیم کو اسلام آباد میں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات شروع کر دیا تھا۔ بہت سارے سفیر تو خود امین فہیم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک کے نئے وزیراعظم کو قریب سے دیکھ کر ان کے بارے میں اپنا ایک تاثر قائم کریں۔ انور بیک کے اہلچلچل میں بہت زیادہ تعلقات تھے جس کا مظاہرہ انہوں نے اس وقت کر کے دکھایا جب بینظیر بھٹو پاکستان واپس آئیں اور انور بیک نے پارلیمنٹ ہاؤس میں سو سے زیادہ غیر ملکی سفیروں کو ایک چھت سے بینظیر بھٹو کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا کر دیا تھا۔ بینظیر بھٹو بھی انور بیک کے ساتھ زیادہ تعلقات سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اب جبکہ بینظیر بھٹو نہیں رہی تھیں تو انور بیک نے اپنے دوست امین فہیم کو اہلچلچل میں حخارف کا ہا شروع کر دیا تھا۔ اس میں انور بیک کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ یہ آصف علی زرداری ہی تھے جنہوں نے نوڈیر میں بیٹھ کر امین فہیم کو پاکستان کا نیا وزیراعظم بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ امین فہیم انور بیک کے ذہن میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ انتخابات کے بعد آصف علی زرداری صاحب کی ترجیحات کدو ہل چکی تھیں۔ امین فہیم کو وزیراعظم بنانے کا اعلان محض پارٹی کے افسانے تھا۔ ہونے والی کسی بھی بدلت ہوئے سے روکنا تھا۔ بینظیر بھٹو کے بعد اگر کوئی پارٹی کا لیڈر ان ملک کا تو وہ امین فہیم تھے۔ اس وقت بینظیر پارٹی پارلیمنٹ کے چیئرمین تھے۔ اگر محض ایک کانگریسی کی وہ بینظیر بھٹو کی وصیت پڑھ کر سنائی گئی اور زرداری صاحب نے پارٹی اپنے قبضے میں لے لی۔ امین فہیم بدلت پر اتر آتے تو شاید آصف زرداری

صاحب کے لیے پارٹی پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہ رہتا۔ یوں بڑی بھگداری سے امین فہیم کو کسی بھی موقع عدالت سے باز رکھنے کے لیے آصف زرداری نے وقتی طور پر انہیں وزیراعظم بنانے کا اعلان کیا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ ان کی ایک سیاسی چال تھی۔ لیکن امین فہیم آخری دن تک جب تک ہنس رہا گیا ان کے نام کا اعلان نہیں کیا گیا، اپنے آپ کو وزیراعظم کا امیدوار بھگتے رہے۔

جب انور بیک امین فہیم کو سفیروں سے ملوا رہے تھے، اس وقت آصف زرداری صاحب ابھی بھی نوڈیر میں موجود تھے۔ جب مجھے ان ملاقاتوں کا علم ہوا تو میں نے دی نیوز میں اس کی ایک سنوری فائل کی۔ اور تو اور امریکی سفیر بھی انور بیک کے گھر پر آ کر خصوصی طور پر امین فہیم سے ملی تھیں اور انہوں نے بھی ایک طرح سے اپنی طرف سے کلیئرٹس چٹ دیدی تھی۔ انور بیک اور امین فہیم نے اپنے میں ہم درک پورا کر لیا تھا۔ جب امریکن سفیر کو ان کے وزیراعظم بننے پر اعتراض نہیں تھا تو باقی پھر پیچھے کیا رہ جاتا تھا۔ یوں امین فہیم کے وزیراعظم بننے میں کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔

جب یہ سنواری چھپی تو مجھے انور بیک نے فون کر کے کہا کہ کلاسز صاحب! آپ نے تو امین فہیم کے وزیراعظم بننے کے امکانات تقریباً ختم کر دیے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا تو وہ بولے کہ آج امین فہیم کی کچھ مغربی سفارتکاروں سے ملاقاتیں تھیں۔ اس خبر کے چھپنے کے فوراً بعد امین فہیم کو بتایا گیا تھا کہ وہ تمام ملاقاتیں چھوڑ کر فروری طور پر نوڈیر پہنچیں۔ آصف زرداری صاحب ان سے کچھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بیک صاحب کا خیال تھا کہ یہ صلاح مشورہ محض بہانہ تھا۔ دراصل زرداری صاحب نہیں چاہتے تھے کہ امین فہیم غیر ملکی سفیروں سے ملیں۔

اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا اور امین فہیم اب اس ملک کے نئے وزیراعظم نہیں ہوں گے۔

دی ہوا جس کا اندیشہ انور بیک نے ظاہر کیا تھا۔ نوڈیر سے واپسی پر امین فہیم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی کہانی ختم ہو گئی ہے، لیکن انہوں نے بھی آخری لمحوں تک آصف زرداری پر اپنا دباؤ رکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انہی دنوں میں امین فہیم کے حق میں خبریں دینا شروع کیں کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ یہ آصف زرداری ہی تھے جنہوں نے انہیں خود وزیراعظم بنانے کی بات کی

تھی اور ان کے پاس سے سے شکر کے تھے۔ ان دنوں میرے علاوہ تمام صحافی وہی دیکھ رہے تھے۔
 آصف زرداری صاحب ہمارے تھے۔ کسی صحافی نے ان کے اسیے دنوں کو سوال کرنا تھا تو کسی نے
 اپنی مرضی کی تفریبات کر لی تھیں اور کوئی شخص ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان سات ان کا چلی
 رہا تھا۔

اسی قیم اور آصف زرداری کے درمیان اشتقاقے بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔
 جھڑپاری کے لوگوں کو اکیسواڑہ کا شروع ہو گیا تھا کہ ہوا کا رنگ بدل گیا ہے۔ ایک دن زرداری
 صاحب نے اسلام آباد کے صحافیوں کو ایف۔ ایف میں واقع زرداری ہاؤس میں شام کے کھانے پر
 بلا دیا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے صحافی تک سب وہاں شریک ہوئے۔ انار اخیال تھا کہ زرداری صاحب
 شام کے صحافیوں کے منہ سے کچھ باتیں سنا رہے تھے۔ یہ طبع و کہانی ہے کہ وہ دو گھنٹے تک ٹوٹی بولنے
 رہے اور انہوں نے کسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کھانے کے بعد صحافی انہیں گھیرے کمرے
 لے گئے۔ اہلک ان کی نظر بھر پر جڑی۔ آصف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی ان کے دائیں بائیں کمرے
 لے گئے۔ زرداری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں انہیں کس کو وزیراعظم بنانا چاہیے؟ میں
 نے ان سے کہا کہ صحافی ہونے کے باطن سے میرا کام نہیں ہے کہ میں انہیں مشورے دوں کہ وہ کس کو
 وزیراعظم بنائیں یا کس کو نہ بنائیں۔ یہ بات انہیں اپنی پارٹی کے لوگوں سے پوچھنی چاہیے۔

زرداری صاحب نے اپنی روایتی منکرانہٹ کے درمیان مجھ سے پھر پوچھا کہ میں آپ مجھے
 بتائیں کہ میں کسے وزیراعظم بنائوں۔ میں نے بھروسہ مٹا دیا۔

اس کی بار زرداری صاحب نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ہمیں مشورہ نہیں دینا چاہیے لیکن
 میں آپ سے خود پوچھ رہا ہوں لہذا آپ مجھے بتائیں۔

میرے لیے یہ پوچھنا مشکل مرحلہ تھا کیونکہ انہی دنوں یہ خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ آصف علی
 زرداری امین قیم کے بعد احمد علی شاہ محمود قریشی اور آصف رضا گیلانی میں سے کسی ایک کو وزیراعظم
 بنانا چاہتے تھے۔ گیلانی صاحب اور قریشی صاحب میرے سامنے کمرے تھے۔ دونوں سے میرا پرانا
 تعلق تھا۔

میں نے زرداری صاحب سے کہا کہ میرے خیال میں انہوں نے خود ہی یہ اعلان کیا تھا کہ وہ

میں قیم کو وزیراعظم بنائیں گے لہذا انہیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ تاہم، میں نے زرداری صاحب کو
 اپنا کیا نہیں انہوں نے اسی طرح ایک وعدہ دیا کہ آصف رضا گیلانی سے بھی کر رکھا ہے۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کونسا وعدہ؟

آصف رضا گیلانی اور ارد گرد کمرے صحافیوں نے مجھے چوک کر دیکھا۔ میں نے زرداری
 صاحب کو یاد دلایا کہ جب اقتساب عدالت کے جج نے آصف رضا گیلانی کو سات سال کی قید سنائی
 تھی تو وہ اس وقت عدالت میں موجود تھے۔ یہ زرداری صاحب ہی تھے جنہوں نے اونچی آواز میں یہ
 کہا تھا کہ جج صاحب آپ آصف رضا گیلانی کو نہیں بلکہ ملک کے مستقبل کے صدر پاکستان کو سزا سناتا
 رہے ہیں۔

میں نے کہا زرداری صاحب امیر اخیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ جج صاحب کو کہے
 ہوں اپنے الفاظ پر عملدرآمد کرا سکتے ہیں۔

زرداری صاحب نے میری بات سنی اور فوراً بولے کہ ہاں مجھے آصف رضا گیلانی سے کیا ہوا
 اپنا وعدہ یاد ہے۔

اس کھانے سے ہم فارغ ہوئے تو سب پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب کسی صورت بھی امین
 قیم اس ملک کے وزیراعظم نہیں بننے والے تھے۔ اب مقابلہ آصف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی اور احمد
 علی شاہ کے درمیان تھا۔

انہی دنوں حسین حقانی بھی امریکہ سے آئے ہوئے تھے اور ہر وقت وہ زرداری صاحب کے
 قریب موجود رہتے۔ انہوں نے کچھ عرصہ صحافت کی ہوئی تھی لہذا انہیں صحافیوں کی پروفیشنل کمزوریوں کا
 بھی علم تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا ٹر بھی جانتے تھے۔ ان کے
 خلاف اخبارات میں خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے ان کا تدارک کیا
 جائے۔ میں بڑا حیران ہوا جب انہوں نے مجھے فون کیا اور بڑے اچھے طریقے سے بات چیت کی اور
 نہایت کل کر کہا کہ وہ مجھے اندر کی بہت ساری سیاسی خبریں دے سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں مجھے
 انہوں کی مدد ان کے مفادات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔

مجھے حیرت کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسی خبر دے رہا ہوں جو کسی کے

پاس نہیں ہے۔ یہ مسین عثمانی تھے جنہوں نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ یوسف رضا گیلانی ہی اس ملک کے وزیراعظم ہوں گے۔

ان دنوں جب یوسف رضا گیلانی کا نام دور دور تک سننے میں نہیں آتا تھا، یہ مسین عثمانی ہی تھے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ یہ ساری بحث فضول تھی کہ کون وزیراعظم بنے گا۔ اگر کسی نے وزیراعظم بننا تھا تو وہ یوسف رضا گیلانی تھے۔

جس طرح سے مسین عثمانی نے مجھ سے خبروں کا سوا کرنے کی کوشش کی تھی وہ شاید میرے لیے قابل قبول نہیں تھا، مگر اس ایک واقعہ کے بعد میرا اور ان کا زیادہ رابطہ نہیں رہا۔ یہ ملحد و بات ہے کہ میں نے یوسف رضا گیلانی کے وزیراعظم بننے کی خبر اخبار میں نہیں دی کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب میں مسین عثمانی کی طرف اشارہ کرانے کے بعد سناوات کا خیال نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر مجھے ان کی وہی ہوئی اس خبر کو ہا ہے، مگر یہی بڑی کین نہیں تھی، استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

امین فہیم جی بخاری سے اپنی پارٹی میں تھا ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے تمام ساتھی جن پر وہ بہت غور کرتے تھے، انہیں ایک ایک کر کے چھوڑتے جا رہے تھے۔ امین فہیم نے بھی آخری دم تک لانے کا فیصلہ کیا، مگر انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ قومی اسمبلی میں وزیراعظم کا انتخاب لڑیں گے اور اس کے لیے انہیں آصف علی زرداری کی ماحول کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹریں کے قیام میں ہیں۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ سندھ سے کچھ ایم این اے ان کا ساتھ دیں گے۔ خصوصاً ان کو نوید قمر، بدایان تھا کہ وہ کہتے تھے کہ وہ خود نوید قمر ان کی وجہ سے اپنے حلقے سے جیتنے تھے۔ اگر وہ نوید قمر کے حلقے میں موجود اپنے مریدوں کو انہیں ووٹ ڈالنے کا نہ کہیں تو نوید قمر کبھی نہیں جیت سکتے تھے۔

امین فہیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا ہنگامہ اس وقت لگا جب نوید قمر نے ان کی ماحولگی کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نوید قمر جیسا شخص بھی انہیں اس مشکل مرحلے میں یوں چھوڑ جائے گا۔

اگر پیپلز پارٹی کے دوستوں کے ہاتھوں دھکا کھانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ راجہ پرویز اشرف نے پوری کر دی۔ یہ وہی راجہ پرویز اشرف تھے جو پیپلز انور بیگ کے گھر پر رات کو دی گئی پارٹی میں اکیلے اس وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے جب امین فہیم ہاتھ روم جانے کی نیت سے صوفے سے

اٹھتے تھے۔ جب امین فہیم ہاتھ روم سے واپس لوٹتے تو بھی راجہ پرویز اشرف ایک دفعہ پھر احتراماً کھڑے ہو جاتے تاکہ امین فہیم کو پتہ چلے کہ وہ ان کی دل سے کتنی عزت کرتے ہیں۔ تاہم، جب امین فہیم کو ان کی ضرورت پڑی تو راجہ پرویز اشرف نے ان کا فون تک سننے سے انکار کر دیا۔

امین فہیم بھول گئے تھے کہ بینظیر بھٹو مرچکی تھیں۔ اب آصف علی زرداری پارٹی کے صدر ہیں اور نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف جیسے لوگ نئے بادشاہ کے درباری بن چکے تھے۔ اگر اس لیے کوئی بھی شخص امین فہیم کے ساتھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا تھا تو یہ انور بیگ تھے۔ ان دونوں کی دوستی کراچی میں 1960ء کی دہائی میں شروع ہوئی تھی۔ اپنی دوستی کو پکا رنگ دینے کے لیے دونوں نے اپنے بڑے بیٹوں کے نام نجیب رکھے تھے۔ آج ان دونوں کے بیٹے ان کی دوستی کی طرح اپنی مہر کی چالیں سے زیادہ وہاں دیکھ چکے ہیں۔

انور بیگ کے اسلام آباد کے میڈیا اور ڈپلومیٹک انکلیو میں بے پناہ تعلقات تھے جس کا سارے کا سارا نکتہ امین فہیم کو ہو رہا تھا۔ انور بیگ کے ان تعلقات کی وجہ سے ہی امین فہیم کو عوام میں محدود پایاں لڑی تھیں اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ زرداری صاحبان نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

آصف علی زرداری کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس وقت امین فہیم کے ساتھ اگر کوئی شخص اپنی دوستی بھاریا ہے تو وہ بینظیر انور بیگ ہیں۔ زرداری صاحب نے اپنے قریبی دوست فیصل بٹ کو ایک رات انور بیگ کے گھر بھیجا اور انہیں بڑا دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ امین فہیم کی حمایت سے باز آ جائیں اس کے بدلے میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔

انور بیگ اپنی پارٹی کے لیڈروں، نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف کی طرح سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ سیاستدان دوستیوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے فیصل بٹ کو یہ کہا کہ وہ امین فہیم کے چالیس سال پرانے دوست ہیں اور اس مرحلے پر محض سیاسی مفادات کے لیے ان سے تعلقات ختم کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

یوں زرداری صاحب کا یہ پیغام ٹھکرا کر انور بیگ نے دوستی کے نام پر اپنا سیاسی کیریئر تباہ کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک ان کی دوستی ان کے سیاسی کیریئر سے زیادہ اہم تھی۔

وقت آگے نکل گیا تھا۔ یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بن چکے تھے۔ آصف علی زرداری ابھی

ایک انور بیک سے ملکر بار اٹھی تھیں۔ انہوں نے انور بیک کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ کھیلنے کی سیٹ سے
استغاثی لپٹ کر۔ تاہم انہوں نے انور بیک کو سنبھال لیا۔ انہوں نے صدر صاحب کو بتایا کہ کچھ ماہ بعد
انور بیک صاحب ایسے ہی کھیلنے سے ہارتھ ۱۹۹۹ میں ریٹائرڈ ہو رہے ہیں۔ اگر ان سے اس وقت
استغاثی لپٹ کر تو یہی کچھ باتیں گاہ کہ انہیں انہیں انہیں کے ساتھ دوستی کی سزا دی جا رہی ہے۔ غیر از رداری
صاحب کو یہ بات کچھ میں آگئی اور انہوں نے انور بیک کے استغاثی پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

جب ہارتھ کے سینے میں بے سبب کے لیے اٹھایا ہوا ہونے لگے تو انور بیک ٹکٹ اٹھائی کرنے
کے لیے چار نہیں تھے۔ ان کا دل اس وقت بے طرح ٹوٹ گیا جب انہیں یہ پتہ چلا کہ محمد امین فہیم نے
ان کی بھانجی سندھ سے دو تین اور لوگوں کا نام ٹکٹ کے لیے دیا تھا۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا
کہ ان کا چالیس سال پرانا دوست ان کے ساتھ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں نے
انور بیک کو بھائی کی انہیں پارٹی ٹکٹ کے لیے ضرور اٹھائی کرنا چاہیے۔ یہ ضرور تھا کہ انہیں ٹکٹ نہیں ملے
گا لیکن کم از کم یہ ہو جو چھڑ پارٹی کے کدھوں پر رہے گا کہ انہوں نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا تھا۔
دی ہوا آصف علی زرداری صاحب نے انور بیک کو ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔

کچھ عرصے بعد کسی دوست نے آصف علی زرداری سے انور بیک کو ٹکٹ نہ دینے اور ان کے
ساتھ اچھا سلوک نہ رکھنے کی شکایت کی تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ آپ اس بات پر شکر کریں کہ
انور بیک ابھی تک زندہ ہے۔

انور بیک کے بعد یوسف تالپور بھی ان لیڈروں میں سے تھے جو امین فہیم کے حامی تھے اور وہ
اپنی اس حمایت کو مکمل کر بیان بھی کرتے۔

اسی اٹکار میں یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ امین فہیم کے لیے اقتدار سے باہر رہنا مشکل ہو رہا
تھا۔ ان کے گھر سے ان پر بڑا شر پڑنا شروع ہوا کہ وہ کس پیکر میں پڑ گئے ہیں۔ بارہ سال بعد چیمپلز پارٹی
اقتدار میں آئی ہے۔ وہ دن باتیں بننے لگیں کہ لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے اور آج جب پھل
کھانے کا وقت آیا تو وہ اقتدار سے باہر ہیں۔ گھر کے خرچ چھٹا بھی ذرا مشکل لگ رہا تھا۔ اب انہیں کچھ
نہیں آ رہی تھی کہ آصف علی زرداری کو کیسے سامنے کیا جائے۔ آخر محمد امین صاحب کی کراچی والی بیگم کو ایک
طریقہ کچھ مل گیا۔ انہیں نے سندھی روایات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی سے جہاز پکڑا اور

بہیم علی ان صدر ہو گئیں۔ اپنے بھائی آصف علی زرداری سے ملیں۔ اپنے خاوند کی لٹلیوں پر ایک بہن
نے بھائی سے معذرت کی۔ اب ایک سندھی بلوچ کے لیے یہ مشکل ہو گیا تھا کہ وہ محمد امین فہیم کی بڑی
بہن سے نہ ملنے کو نظر انداز کرتا۔

یوں ایک بلوچ سردار نے طالب المولا کے اس بیٹے کو معاف کر کے وزیر بنادیا جس نے بھی
اپنے آپ کو بھٹی کی پارٹی جاننے کرنے کے لیے پتہ نہیں کتنے ترے ڈال کر راضی کیا تھا اور بھٹی صاحب
نے ایک بڑا تار بجی جملہ کہا تھا کہ محمد امین آف ہالا کا ان کی پارٹی میں آنے سے وہ سندھ میں اپنا آدمی
سے زیادہ انکیشن جیت گئے ہیں۔ آج اسی محمد امین طالب المولا کی بہن ذوالفقار علی بھٹو کے داماد سے اپنے
خاوند کی جان بخشی اور اسے کسی مال بنانے والی وزارت کا وزیر بنانے کی درخواست کر رہی تھی۔

آصف زرداری کی طبیعت یا کے تو ان کے ساتھ ایک عجیب سی Love and Hate relation ہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے ہیں تو مجھ جیسے جتنے لوگ اپنے ان دنوں صرف اس بات پر خرقہ کھدیتے ہیں کہ وہ کسی طریقے سے انہیں دہلیا کاسب سے نہ اکر پھٹ گھس جات کر کے جیل جاتا ہے۔ جب زرداری صاحب جیل جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد دہلیا کو یہ پتا ہے کہ وہ اسل نہیں تو طاقتور اعلیٰ عہدے نے محض استعمال کیا تھا کیونکہ اب وہ انہیں جیل میں رکھ کر بینظیر بھٹو کو اپنی مرضی کی شرائط پر ڈیل کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ احساس بڑھتا شروع ہو جاتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری صاحب تو مرد خیر تھے۔ وہ نہ تو نواز شریف کے ڈرہانے احتساب جیل کے انچارج سینئر سیف الرحمن کی طرح عدالتوں میں بھاس بھاس کر کے روتے تھے اور نہ ہی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح جنرل مشرف کو تحریری معافی دے دے کر ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب دس سال کے لیے فرار ہوتے تھے۔

آصف علی زرداری

مجھے سیاستدانوں کے انکشافات پر مبنی سیاسی پروفاٹل کرتے ہوئے کچھ ماہ گزر گئے تھے۔ یہ سلسلہ بڑی تیزی سے دی نیوز کے قارئین میں پاپولر ہو رہا تھا۔ اردو اخبارات بھی ان پروفاٹلز میں سے سبھی خیر خبریں نکال کر اور ان کا ترجمہ کر کے چھاپ رہے تھے۔ کالم نگار دوستوں نے بھی دھیرے دھیرے کالموں میں ذکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے لیے یہ نئی چیز تھی کہ ماضی کے سیاستدانوں کے سینوں میں اسنے راز چھپے ہوئے تھے جواب دھیرے دھیرے باہر نکل رہے ہیں۔

آصف زرداری ان دنوں جنرل مشرف کے زیرِ عتاب تھے۔ غلام اسحاق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری اور اب جنرل مشرف نے آصف زرداری کو سیدھا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں آصف زرداری پر کیسز بنائے۔ انہیں جیلوں میں رکھا اور انہیں اپنے تئیں سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ سرکاری وکیلوں اور ان مقدمات پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے۔ ایک دفعہ تو ہا قاعدہ آڈیٹر جنرل پاکستان نے اپنی ایک رپورٹ میں آصف زرداری پر بنائے گئے ان مقدمات پر خرچ ہونے والے کروڑوں روپوں کو قوی خزانے پر ایک بوجھ اور غیر قانونی قرار دیدیا تھا۔ جب میں نے وہ رپورٹ چھاپی تھی تو سینئر رشتہ دار ہانی نے پڑھ کر اس کی کاپی مجھ سے مانگی تھی۔ اب یہ نہیں پتا کہ انہوں نے اس سرکاری دستاویز کا کیا استعمال کیا تھا۔

آصف زرداری کی طبیعت یا کے تو ان کے ساتھ ایک عجیب سی Love and Hate relation ہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے ہیں تو مجھ جیسے جتنے لوگ اپنے ان دنوں صرف اس بات پر خرقہ کھدیتے ہیں کہ وہ کسی طریقے سے انہیں دہلیا کاسب سے نہ اکر پھٹ گھس جات کر کے جیل جاتا ہے۔ جب زرداری صاحب جیل جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد دہلیا کو یہ پتا ہے کہ وہ اسل نہیں تو طاقتور اعلیٰ عہدے نے محض استعمال کیا تھا کیونکہ اب وہ انہیں جیل میں رکھ کر بینظیر بھٹو کو اپنی مرضی کی شرائط پر ڈیل کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ احساس بڑھتا شروع ہو جاتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری صاحب تو مرد خیر تھے۔ وہ نہ تو نواز شریف کے ڈرہانے احتساب جیل کے انچارج سینئر سیف الرحمن کی طرح عدالتوں میں بھاس بھاس کر کے روتے تھے اور نہ ہی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح جنرل مشرف کو تحریری معافی دے دے کر ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب دس سال کے لیے فرار ہوتے تھے۔

آصف زرداری کی شکل میں ہمارے میڈیا کے پاس ایک ایسا دیو ملائی کردار آ گیا تھا جو عدالتوں میں پیشیوں کے وقت نواز شریف یا سیف الرحمن کی طرح رونے دھونے کے بجائے چہرے پر ایک لمبی مسکراہٹ طاری کیے ہر ایک سے ملتا تھا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے ڈیل کر کے ملک سے چلے جانے کے بعد لوگوں کی آنکھوں میں آصف زرداری کی قدردانیت اور بڑھ گئی تھی۔ بینظیر بھٹو اپریل 1999ء میں نواز شریف کی احتساب عدالتوں کے خوف سے پہلے ہی ملک چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ بچے کچھ دہائیوں میں سیاستدان چوہدری شجاعت کی قیادت میں جنرل مشرف کے دربار میں پی ایم ایل کیو کی بنیادیں رکھ کر ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پر بیعت کرنا شروع ہو گئے تھے۔ یوں لوگوں اور میڈیا کو یہ محسوس ہوا کہ آصف زرداری کرپٹ کسی لیکن بزدل ہرگز نہیں ہے، جس نے ایک بہادر بلوچ کی طرح کوئی ڈیل کر کے ملک سے فرار ہونے کی بجائے اپنے ملک کی جیل میں رہنا پسند کیا تھا۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ کچھ عرصے بعد آصف زرداری صاحب اس وقت کے ڈی جی ایم آئی ندیم تاج کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کر کے ایک ڈیل کے ذریعے رہا ہو کر نیویارک پہنچ گئے اور پھر وہ تین سال بعد دسمبر 2007ء میں پاکستان واپس لوٹے جب بینظیر بھٹو قتل ہوئیں اور اب وہ اس ملک کے صدر ہیں۔

میرے صحافی دوست محسن رضا نے دو تین دفعہ مجھے کہا کہ تم آصف زرداری کا ایک پروفاٹل

اعزواج اپنے اہلدار کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ فرحت اللہ ہار نے بھی ایک دو موقعوں پر کچھ ایسی ہی بات کی۔ میں نے دونوں سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ میری زرداری صاحب سے ملاقات کرادیں اور میں یقیناً یہ اعزواج کروں گا۔ یوں جون 2003ء کی ایک تھقی دوپہر میں میں راہ لینڈی کی احتساب عدالت کے امانے میں پہنچ گیا جہاں آصف زرداری ایک درخت کے نیچے سٹائلوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ سٹیل پارٹی کے پرانے ہانڈا کارکن قاضی سلطان محمود بھی وہاں موجود تھے۔ محسن رضا اور شعیب بھٹے نے میرا آصف زرداری سے تعارف کروایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ اتنی دیر میں حامد میر وہاں آ گئے۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ایک فاصلے پر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے اور میں صحافی دوستوں کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ حامد میر سے گفتگو کر کے واپس لوٹے تو اپنی محسوس کری پر بیٹھ گئے۔ میرا ایک دفعہ پھر ان سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے ماسوشی سے مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ میں نے سمجھا وہ شاید کسی کو نیلی فون کرتا چاہ رہے ہیں۔ چند لمحوں تک وہ فون کو تھمتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ ابھی مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میری جیب سے چین نکال لیا۔ وہ اس چین کو موبائل فون کی طرح کچھ دیر چیک کرتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ نہ آئی کہ آخر زرداری صاحب میرا فون کھد کھد کیوں چیک کر رہے ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں فلیش ہوا۔ دراصل زرداری صاحب میری صفائی لے رہے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ میں موبائل فون پر ان کی گفتگو ٹیپ تو نہیں کر رہا تھا یا ہی طرح چین میں کوئی ایسی آواز نہیں آ رہی تھی جس سے ساری بات چیت محفوظ ہو رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بڑی شدید کوفت ہوئی۔ کوشش کے باوجود مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے زرداری صاحب کو کہہ دیا کہ سراسر اہلک بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا اعزواج نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے اہلکائی قرعے 11 دستوں نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ مجھے آپ سے مل کر آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی کہانی قلمبند کر کے اپنے اہلدار میں چھپانی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک صحافی ہونے کے امانے پر میرا حق بنتا ہے کہ میں اپنی جیب سے کوئی بھی ٹیپ ریکارڈ نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ جو بھی گفتگو ہو رہی ہو ریکارڈ ہو۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں موبائل فون میں چپکے سے ریکارڈنگ آن کر کے اس ساری گفتگو کو محفوظ کر لوں۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے کہ سائیکس انکاراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پہلی دفعہ مجھ سے مل رہے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتا آپ مجھے نہیں جانتے۔ میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہے۔ کسی پر اعتماد کرنے یا اس کا اعتماد چیتنے کے لیے وقت لگنا ہے۔ آپ آتے جاتے رہیں گے تو ہمیں آپ پر بھی بھروسہ ہو جائے گا۔

مجھے خیال آیا کہ اس میں آصف زرداری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب آپ سات سال ہر وقت اپنے ارد گرد پالیس کی وردیاں پہنے اجنبی لوگوں میں سوتے جاگتے ہیں اور آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون جاسوس ہے اور کون محض اپنی ذہنی دے رہا ہے تو پھر انسان کا اس طرح کا رویہ ہو ہی جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں میں نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے انگلیش لٹریچر میں ماسٹر کیا ہوا ہے تو وہ تھوڑے سے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ پھر تم جرنلزم میں کیا کر رہے ہو۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ خود ہی بول پڑے کہ ہاں ٹھیک ہے کہ جب آپ زندہ گی میں کسی بھی شعبے میں جانا چاہتے ہیں تو پھر پریکٹیکل لائف آپ کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آصف زرداری بڑی اچھی سرائیکی بول لیتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ان کا اعتماد چیتنے کے لیے سرائیکی میں گفتگو شروع کی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا رویہ میری طرف کچھ بدل گیا ہے۔ انہوں نے تھوڑی سی لیکن مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بات واضح تھی کہ آصف زرداری کی شخصیت میں جیل جانے کے بعد بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولے کہ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک Gladiator ہوں جو اپنے لوگوں کو ایک ظالم بادشاہ کے غنیمتوں سے آزاد کرانے کے لیے ایک لمبی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ سٹیل پارٹی کے ایک ایسے جنگجو تھے جنہیں جب بھی پارٹی چاہے کسی بھی کام کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ ہاں وہ جیل کے اندر رہوں یا باہر۔

آصف زرداری سے جوں جوں باتیں ہونا شروع ہوئیں تو محسوس ہوا کہ وہ سٹیل پارٹی کے لیے ایک طرح کا محارمت کا نشان بن کر ابھرے تھے۔ ابھی بھی ان کے ارد گرد مسند و اور پنجاب کے بہت سے عوام اسے دیکھنے کی چیزیں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف زرداری ان مضامینوں کے قاری

میں سے مشائی تھا کہ ایک ایک در کو ٹوٹا کھلا رہے تھے۔ ان کی بات سن رہے تھے اور یوں تاثر دے رہے تھے جیسے وہ ہر ایک کے خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دوران وہ ٹیلی فون پر بھی مسلسل لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے۔

آصف زرداری کو اپنے دور کروں اور دوستوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ ٹیل کے آٹھ سالوں نے ان سے ہر چیز چھین لی ہو، لیکن انہوں نے اپنی مسکراہٹ کسی کو نہیں چھپے دی تھی۔ اس مسکراہٹ سے پارٹی کے لیڈروں اور وکروں کو ایک ہی پیغام ملتا تھا کہ ابھی آصف زرداری نے اکتھار نہیں ڈالے ہیں۔

جب میں نے آصف زرداری سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں ان سے ان کی ابتدائی زندگی اور بعد کے سالوں کے ان پہلوؤں پر بات کرنا چاہ رہا تھا جو ابھی تک لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے اور بولے کہ سائیکس ایہ ساری باتیں دہرانے کا کیا فائدہ۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ میں نے پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی لیکن وہ ہر سوال کا بڑا مختصر جواب دیکر بات کو ناٹ جاتے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں ابھی کچھ Reservations باقی تھیں اور وہ اتنی آسانی سے ایک ایسے صحافی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان سے زندگی میں مکمل وصال رہا ہو۔

باتوں باتوں میں میں نے محسوس کیا کہ وہ چند صحافیوں سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے خلاف تیار ہونے والی سازش کا حصہ تھے اور ان کے خلاف جھوٹی کہانیاں چھاپتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک پاکستانی ایڈیٹر کا بھی نام لیا جس نے اپنے اردو اخبار میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ آصف زرداری کے ایجنڈے کو خراب کرنے والی مہم میں شریک تھا۔

آصف زرداری کے بقول جیل میں رہنے کا انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں بہت زیادہ مہر آ گیا تھا جو ان میں 1996ء سے پہلے نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت بول گئی ہے۔ جیل میں ابھر کر گزارنے کے بعد ان کی شخصیت پر کچھ ہم اور مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب وہ مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی بات کو فیسے میں آئے بغیر

اس کی تخریب کر سکتے ہیں اور کسی سے غصہ یا بغض بھی نہیں رکھتے ہیں۔

آصف زرداری بولے کہ تمہیں پتا ہے کہ جیل کی زندگی قیدی کا روزانہ امتحان لیتی ہے۔ آپ کو روزانہ ان طاقتور لوگوں سے لڑ کر زندہ رہنا پڑتا ہے جنہوں نے آپ کو جیل میں ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم، خدا نے ان کے اندر ایک ایسی طاقت بھر دی تھی جس کی وجہ سے وہ جیل کی زندگی کو بڑے صبر اور بہادری کے ساتھ جیل رہے تھے۔ انہوں نے جیل میں آنے سے پہلے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے اندر اتنی بہادری آجائے گی۔

میرے لیے خیرانی کی بات یہ تھی کہ آصف زرداری کے دل میں ان لوگوں کے خلاف کوئی فکارت یا بغض نہیں تھا جنہوں نے ان پر مقدمات، ہتھکڑیاں ڈالیں اور جیل میں ڈالا تھا۔ جب میں نے ان سے سید الرحمن کے بارے میں بات کرنا چاہی جن کی وجہ سے آج وہ جیل میں بیٹھے تھے تو آصف زرداری صرف اتنا بولے کہ چھوڑو یا رسیف الرحمن محض ایک ایسا ایجنڈا تھا۔ اس طرح کے پولیس ایس ایجنڈا اور روزانہ ہر سے پاکستان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کون ان کے بارے میں بیٹھ کر سوچتا رہے۔

میں نے بہت نہیں باری اور دوسرا سوال دیا کہ کیا اس ایس ایجنڈا اسیف الرحمن نے ان کے خلاف جھوٹے کیسز بنانے پر ان سے معافی مانگی تھی تو آصف زرداری بولے کہ نہ صرف اس ایس ایجنڈا نے بلکہ اس کے ماسٹر نواز شریف نے بھی بھول ان کے یہ گناہ کرنے پر معافی مانگی تھی۔ چوہدری نوید نواز شریف کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس کراچی جیل آئے تھے اور ان سے معافی مانگی تھی۔ نواز شریف نے چوہدری نوید کو کہا تھا کہ وہ آصف زرداری سے جا کر درخواست کریں کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا پھر انہوں نے نواز شریف کی اس درخواست پر کیا کیا تھا۔ آصف زرداری نے روایتی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور بولے کہ میں نے اسی لمحے یہ سوچے بغیر کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا انہیں معاف کر دیا۔

میں نے آصف زرداری کے مختصر جوابات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور ان سے بات چیت مکمل کر لیا کہ ان کے ماضی کی کہانی اپنے قارئین کے سامنے لاسکوں۔

زور داری صاحب نے جواب دیا کہ جیل جیل ہوتی ہے چاہے اس میں آپ کو دنیا بھر کی تمام سہولتیں ہی کیوں نہ فراہم کر دی جائیں۔ ان تمام فکر انوں نے انہیں جیل میں توڑنے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اپنے جیلوں پر کھڑے رہے۔

میں نے غصوں کیا کیا اپنے بچوں کی باتیں کرتے ہوئے آصف زرداری جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مسلسل سگریٹ پیتے تھے وہ صرف خمیہ ہانک بڑبڑاتی ہو گئے تھے بلکہ ان کے اندر کا باپ یکدم اپنے لڑکے بننے سمائیوں اور سیاہی و کرکوں کے درمیان سیاہ ستاروں پر حاوی ہو گیا تھا۔ زرداری صاحب جیسے کہ ان کے بچوں کو اب تمام باتوں کی کھڑک شروع ہو گئی تھی۔ اب وہ جانتے تھے کہ ان کے باپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ آصف زرداری کے ذہن کے اس سے بڑی قربانی کوئی بھی نہیں لگے۔ وہ سمجھا کہ جب اس کے بچے اپنے چہرے پر غم سے بھرے ہوں اور ان کا باپ ان سے ہنسنے لگے۔

اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے بات کا رخ بدلا اور مجھے بتانے لگے کہ قصہ میں علم ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے لوگوں نے بڑے بڑے قائدے اٹھائے تھے۔ چاہے وہ پولیس والے ہوں، جیلر یا پھر ججز، ان سبوں نے ان طاقتور لوگوں سے بڑے قائدے اٹھائے تھے جو اسے جیل میں رکھنے کے خواہاں تھے۔ ان سب کو مجھے جیل میں رکھنے کے عوض اور مجھ پر تشدد کرنے کے لیے پروموشنز اور انعامات مل رہے تھے۔ بہت سارے لوگوں کی کمائیاں صرف اس لیے ہو رہی تھیں اور ان کے گھروں میں چولہا جل رہا تھا۔

وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے خاندانوں کا روٹی پانی چل رہا تھا وگرنہ پانچ ارب کی اس آبادی میں ایک شخص کی کیا اہمیت ہے۔
میں نے زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا انہوں نے کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر یہ جیس سوچا کہ بہت ہو گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ جیل سے باہر آنے کے لیے ایک ذیل کر لیں۔
ان کا بے ساختہ جواب تھا تو۔

ہو گئے۔ آج کے جو کچھ میرے دل میں ہے اس کے بارے میں میں نے اپنے دل سے لکھ دیا ہے۔
اس کے بعد میں نے اپنے دل سے لکھ دیا ہے کہ میں نے اپنے دل سے لکھ دیا ہے۔

پہلے اس صاحب کے چاہنے والی تھی مگر میں نے ہوا تو اسے خیر نہیں ہو سکتا تھا۔ گو کہ ان سے ملنے کا امکان
اب جہیز ہو تو ملک واپس آنے کی امیدات تھیں وہی چاہی رہے اور ان کے خلاف بہت سارے
جہیز لے کر بھیج دیے گئے ہیں۔ سرداری صاحب کے قول پر مبنی ہے کہ پاکستان میں سیاست کرنے
اور حکومت چلانے کے خلاف افواہات کرنے کی بہت بڑی قیمت ادا کی جاتی تھی لیکن پھر بھی بہت سارے سیاست
اور پاکستان کے لوگوں کے لیے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں۔

اس منظر کے درمیان میں نے زرداری صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ بیکرٹ انجینئر کے طرہان کے ساتھ اپنی ہونے والی ملازمتوں کی تفصیلات بتانا پسند کریں گے یا انہیں جو آفرز حکمرانوں نے ان کے چھپے دس سالوں میں کی تھیں۔ زرداری صاحب مسکرائے اور بولے کہ سٹو میں نفل ناظم سیاستدان ہوں۔ میں چاہوں تو سیاسی رازدوں سے پردہ اٹھا کر اس ملک کی سیاست میں بہت بڑے طوفان لاسکتا ہوں۔ لیکن میں یہ سیاسی راز افشا کر کے صرف ایک دن کی سیاست نہیں کرنا چاہتا۔

وہ مجھے بتانے لگے کہ ان کے سینے میں بہت سارے راز دفن ہیں۔ 1990ء سے لے کر اب تک تقریباً ہر 100 میں ہر مکران نے انہیں بہت ساری پیشکشیں کیں لیکن وہ ہرگز ان کی تقصیلات نہیں بتائیں گے۔

میں نے بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں ملک میں بہتر سیاستدان کون ہیں تو وہ بولے کہ بینظیر بھٹو کے بعد نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا فضل الرحمن حقیقی طور پر سیاستدان ہیں۔

پتہ نہیں آصف زرداری کے ذہن میں کیا آیا کہ وہ مجھے کہنے لگے کہ عمومی طور پر جو سال میں نے جیل میں گزارے ہیں ان کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ وہ اب تک دس سال جیل کی سزاؤں کے پیچھے گزار چکے ہیں۔ پہلی دفعہ نواز شریف کے دور میں 83-1990ء میں وہ جیل میں رہے۔ پھر راقی تھاری نے 1996ء میں انہیں جیل میں ڈالا تھا اور اب یہ 2003ء ہے۔

انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں ایک بات بتاؤں کہ وہ 2004ء میں جیل سے رہا ہو جائیں گے اور اگلے سال ہی اس ملک میں سٹیشن ہوں گے اور اس کی پارٹی اقتدار میں آجائے گی۔

آصف زرداری کی یہ بات تو بگڑی ثابت ہوئی کہ 2004ء میں انھیں رہا کر دیا گیا جس کے بعد

198

وہیں سے ملنے پہلے گھر انہوں نے ملک میں سے احتجاجات کرنے کے لیے بھیجا تھا کہ وہاں سے
پاکستان کی فوجیں ہٹا کر کام ہونے پہ متوجہ کر دیا جائے۔ چھ گھنٹے اور بعد 2007ء میں دہلی کے ملک میں سے
پاکستان کو ہٹا دیا گیا۔ 2003ء میں جس میں جب آصف ذرداری حکومت پر دہلی کی فوجیں گزرتے تھے اور انہیں
پیشین گوئیاں سنارہے تھے تو وہ جنرل محمد رفیع سے خیر خواہانہ گفتگو کر رہے تھے اور انہیں یہ یقین
دلائی کہ ان کی جاری قومی کارروائیوں میں ہٹا دیا جائے گا تو اگلے سال انہیں دہلی کے ملک میں سے احتجاجات
کرنے سے روک دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ فوجی قیادت ان سے جنرل مشرف کے لیے آہٹیں بھارت
کی خاطر بٹل سے دبا کر کے محض جان چھڑانا چاہ رہی تھی لیکن آصف ذرداری کو ہٹا دینی کے لیے وہ
ملک میں سے احتجاجات کرنے کا بلف دے رہی تھی۔ فوجی قیادت ہرگز ملک میں سے احتجاجات نہیں
چاہتی تھی۔ وہ محض آصف ذرداری کو جو اس وقت اسمبلی صوبہ کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھا رہے تھے انہیں
بٹل سے نکال کر ملک سے باہر بھیجنا چاہ رہی تھی۔ آصف ذرداری بھی اسی پکر میں آگئے تھے کہ بٹل جان
کی رہائی کے فورا بعد ملک میں احتجاجات ہو جائیں گے۔ مینظیر بھٹو ملک واپس لوٹ آئیں گی اور ان کی
پاسی اقتدار میں آجائے گی لیکن انہیں نہیں پتہ تھا کہ وروی حالے ان سے زیادہ اچھے یا ستمدان تھے اور
وہ بھرپور سی پالیسی چاہتے تھے۔ انہوں نے 2004ء میں آصف ذرداری کو رہا کیا اور ساتھ ہی یہ افواہیں
انتہا رات میں چھپانا شروع کر دیں کہ انہیں ایک ڈیل کے تحت دہلی کیا گیا ہے جس کے تحت وہ ملک سے
باہر چلے جائیں گے اور واپس نہیں آئیں گے۔ بعد میں حالات نے یہ ثابت کیا کہ یہ افواہیں درحقیقت
کلی پھٹی تھیں اور آصف ذرداری 2004ء میں اپنی رہائی کے بعد ملک سے باہر گئے تو 27 دسمبر 2007ء کو
ان وقت پاکستان واپس لوٹے جب مینظیر بھٹو قتل ہو چکی تھیں۔

جب آصف زرداری نے اپنی رہائی اور اپنی پارٹی کے اقتدار میں آنے کی باتیں گوئی تھیں تو میں نے ان سے سیدھا سوال پوچھ لیا کہ کیا ان کی کرپشن کے بارے میں جواب تک کہہ سکتا ہوں جتنی رعیت تو وہ ملے تھیں۔ زرداری صاحب نے میرے سوال کا برا انکس مانا اور بولے کہ یہ سانس کی بات ہے کہ کوئی بھی حکومت اپنے سیاسی مخالفین کی طاقت کو برواشت نہیں کرتی اور انہیں جھکانے کے لیے اس طرح کے حربے استعمال کرتی رہتی ہے۔ ان کی پارٹی کے بہت سارے لیڈروں اور وزیروں نے قومی عہدوں کے دور میں ان سے بدعنوانی کی بہت بڑی قیمت چکانی تھی۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ پاکستانی

سوائی ایک ایسے مرحلے سے گزر رہے ہیں جس میں لوگ اب ڈیکٹر شپ سے سویٹین رول کی طرف سڑ کر رہے ہیں۔ اس طرح کی یہ سیاسی تبدیلی پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں ہو رہی بلکہ اگر دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اس طرح کی لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو چھائیاں دی گئیں جنہوں نے اپنے دور کے ڈیکٹرز اور طاقتور لوگوں کے خلاف بغاوتیں کی تھیں۔ بہت سارے ممالک میں تو ایسے لوگوں کو آگ میں جھلایا بھی گیا۔ سو اگر آج ان کے ساتھ یہ سب سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ان کے بقول آزادی حاصل کرنے کے لیے بیٹھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور وہ بھی اپنے حصے کی قربانی دے رہے ہیں اور اس قربانی کے ذریعے وہ لوگوں کو ڈیکٹر شپ سے آزادی دلوانا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری خود اس آگے بڑھے اور مجھے دیکھ کر بولے کہ ڈیکٹرز سیاست دانوں کی تو ہیں کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے انہی سیاست دانوں کو استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ ان کے لیے ایک نیا طریقہ کار ہے کہ وہ اس میں مقبول لیڈروں پر کرپشن کے چار بڑا لگا کر انہیں بدنام کر کے ان کے ساتھ ہاتھ ملانے لگے۔ دیکھو ان کی تمام برائیاں سیاست دانوں کے کھاتے میں داخل کر دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ کام کر رہے ہیں۔ پانی باغیچہ چھوڑی۔ آپ ہر ایک کیس کی دیکھ لیں کہ ہر سے عوام اس سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے کرنے کے لیے ہر وہ کچھ کی دعوتی دے دی تھی۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے ان کی دعوتی قبول کی تھی۔

میں نے ہر بات کا سرا سہرا ان سے لے لیا کہ زرداری صاحب! آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ ایک ایسی خاتون کے طور پر ہیں جو اس ملک کی اودھ دوزیر اعظم رہی ہیں تو وہ بولے کہ یہ ان کی دعوتی کا سب سے بڑا اور اہم تر پہلو ہے۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ دنیا بھر میں وزیر اعظم کے خاوند یا ان کی بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شروع میں تو انہیں وزیر اعظم کا شوہر ہونے کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سیاسی لیڈرز اور کرز اور حتیٰ کہ دوزر بھی انہیں وزیر اعظم کا خاوند تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک وزیر اعظم کے شوہر ہونے کی جاب بہت مشکل تھی تاہم انہوں نے بہت جلد ان تمام ہی ڈیوٹیز کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔

میں نے زرداری صاحب سے نسبتاً زیادہ مشکل سوال پوچھ لیا کہ بہت سارے لوگوں کا یہ خیال

ہے کہ انہوں نے بینظیر بھٹو کے لیے بے پناہ مسائل کھڑے کیے تھے اور دراصل اس خاتون نے ان کی وجہ سے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ زرداری صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر وہ چپ رہے اور پھر بولے کہ یہ سارا بھٹو فیملی کے مخالفین کا پردہ پیگنڈا ہے۔ ان کے بقول جنرل ضیاء کے سیکرٹری انفارمیشن جنرل مجیب الرحمن کا یہ کارنامہ تھا جنہوں نے بھٹو خاندان کے خلاف انتہائی غلیظ مہم شروع کی تھی۔ جنرل مجیب کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعے بھٹو فیملی کو بدنام کیا جائے اور پہلے دس سالوں میں یہ کام بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھایا گیا تھا لیکن وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ بھٹو ازم لوگوں کی روحوں میں آج بھی باقی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ پھر آج فیصل صالح حیات جیسے پارٹی کے پرانے لیڈر یہ کہہ کر کیوں پیٹ پارٹی چھوڑ رہے ہیں کہ بھٹو ازم اس دن دن ہو گیا تھا جس دن بینظیر بھٹو نے 1988ء میں اس وقت کی حکومت سے قتل کر کے اقتدار لے لیا تھا۔

آصف زرداری بولے کہ دراصل فیصل صالح حیات جیسے لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کو جوہر لازم کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ پیٹ پارٹی کے اس سے گروپ نے جنرل مشرف کے ہاتھ پر بیعت اس لیے کی تھی کہ انہیں اقتدار چاہیے تھا اور وہ غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب انہیں بھٹو ازم اور پارٹی لیڈر شپ میں ہر طرح کی غلطیاں نظر آئیں گی۔ یہ تو کوئی انہونی بات تھی اور نہ ہی پہلی دفعہ کسی لیڈر نے بھٹو کی پارٹی سے غداری کر کے اس طرح کا جوہر لازم کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے زرداری صاحب نے مجھے ایک واقعہ بتایا کہ جب وہ صدر علی بھٹو کی حکومت کے خلاف فوج نے بغاوت کی تو مولانا کوثر نیازی نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے بھٹو سے غداری کر کے جنرل ضیاء کو جائن کر لیا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس وقت بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھٹو کی جان بچانے کے لیے جنرل ضیاء کا ساتھ دے رہے تھے۔ کوثر نیازی اکثر کہتے تھے کہ پیٹ پارٹی کے لیڈر بھٹو کو قتل کرنا چاہتے تھے اور وہ بھٹو کی جان بچائیں گے۔

"تو کیا کوثر نیازی نے بھٹو کی جان بچالی تھی" آصف زرداری نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا تو وہ بولے کہ پیٹ پارٹی کے یہ اٹھارہ ایم این ایز جنہوں نے 2002ء کے الیکشن کے بعد اپنی پارٹی چھوڑ کر جنرل مشرف کو جائن کیا، انہوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کو

۱۱۔ بولے کہ آپ کو یہ بگھنے کی ضرورت ہے کہ ایکٹرز تہذیبی ہوتے رہتے ہیں اور پارٹی کے لیڈرز مختلف لوگوں سے مختلف الٹوز پر بات چیت اور ڈائیلاگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب ایک سیاسی ٹیم ہوتی ہے۔ اس کا ہر گز مطلب کپرو دھارنہ نہیں ہوتا۔ ۱۲۔ کہنے لگے کہ ہمیں یہ بگھنے کی ضرورت ہے کہ جمہوری طاقتیں کبھی بھی بات چیت یا مذاکرات کی آفر نہ کوئس ٹھکراتیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! چلیں مان لیجے ہیں کہ غلامِ خلق خاں، نواز شریف اور جنرل

سیف الرحمن کے ساتھ ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو کو ٹیپ کر کے لندن کے ایک اخبار میں چھاپا گیا تو ملک
 قوم سے اشتعال لایا گیا تھا۔ یہ ٹیپڈ کہانی ہے کہ جب 2008ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسرِ اقتدار
 آئی تو یہی ملک قوم پیپلز پارٹی کے دور میں کی ماہنامہ جرنل کے مہرے پر فائدہ ہے۔ اس وقت
 آصف زرداری صاحب کو ملک قوم کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ انہی کے ذریعے ہی پیپلز پارٹی
 سوشل لینن میں جی 14 ملک کے الزامات پر جانے لگے مقدمات کو ختم کرانا تھا۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب
 ایسے کہ وہ ملک قوم جنہوں نے پیپلز پارٹی کو صرف زرداری کو ایک کرپشن کیس میں سزا سنائی تھی
 انہوں نے ہی انہی جرنل کے الزامات استعمال کرتے ہوئے سوشل لینن میں ان دونوں یہاں یہی
 کے خلاف مقدمات ایک جگہ کر کے کر لے گئے۔ یہ تھے انہی میں گل کے دشمن آج کے دوست
 کے تھے۔

آصف زرداری بھی جی 14 میں رہے تھے کہ آپ پاکستان کی اس عدلیہ سے منصف اور
 ان قانون کی طاقت کی کیا توقع رکھتے ہیں جب ملک کے اس قانون کی طاقت نہیں کر سکی جس کے
 اقتدار پر حکومت کا نظام قائم ہے تو خود پاکستانی عدلیہ نے قانون کی عمرانی کے نام پر بہت
 سارے کیسے ہار دیے ہیں۔ ان لوگوں نے اس قانون کی طاقت کو لے کر صرف لیا تھا جس پر ملک بھر
 کہ انہوں نے ایک نئی دیکھ کر ملک کو لایا آپ کی بات کہتے ہیں۔ باقی باتیں بہت بھونپی ہو کر
 ہوتی ہیں۔

میں نے آصف زرداری کی آواز میں سنا ہے کہ ایک نئی جی 14 کی۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! کیا وہ جرنل شرف کی عدلیہ میں اس موجودہ حکومت سے
 کوئی لڑ کر لے کے لیے چار تھے تو وہاں کس کیس میں اس سے لڑ کر لے کے لیے چار
 ہیں اگر جرنل شرف سے اچھڑا دیں۔ جرنل شرف سے اچھڑ کر گر پڑے جائیں۔ وہ انہیں ایک
 حکومت راستہ اپنے کو چار ہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! آپ جوں کی اس تھیں وہ میں ایک مدت کی چھالوں میں
 بیٹھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ جرنل شرف کو سزا کر کے گر جانے کے لیے ایک حکومت راستہ اپنے پر
 تیار ہیں لیکن ان کی پارٹی نے تو سمیٹ آف پاکستان میں ایک ملوث کر لیا ہوا تھا جس کے تحت قانون

دور لے جانے کا نام جرنلیوں کو تو قانونی طور پر سزا نہیں دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا بلکہ وہ یہاں بیٹھے ان تمام
 جرنلیوں کو حکومت راستہ اپنے کے لیے تیار ہیں جنہوں نے ملک کے قوانین کو زکرائی ملک میں حال نہیں۔
 زرداری صاحب! لے کر اپنی پارٹی کے بھٹ میں مل سو کر لے کے ہار جو وہ ابھی بھی
 جرنل شرف کو حکومت راستہ اپنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جرنل شرف آرام سے اقتدار
 رہیں گے جانے کر کے گر پڑے جائیں تو ان پر مقدمات چلانے کے بجائے انہیں گر جانے دیا
 جائے گا۔ وہ پارٹی کے اس فیصلے کے حق میں نہیں ہیں کہ ان جرنلیوں پر عدلیہ کے مقدمات ہونے
 پائیں جنہوں نے ماضی میں قانون توڑا تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کو سیاسی طور پر کھڑا ہونا
 چاہیے۔ وہ ابھی بھی سیاستدانوں کو سنے کو تیار ہیں اور انہیں اس ملک پر حکومت کرنے کا حق ملنا
 چاہیے۔ ہمیں ذرا پتا ہے اس دن سے جب لوگ اپنے سیاسی لیڈروں کی بات سنا بھی پھڑکیں گے
 اور اگر کوئی ایسا دن آتا تو یہ اس ملک کی بہت بڑی بے فہمی ہوگی۔ اس حکومت کو چاہیے کہ وہ سیاسی قوتوں
 کو تسلیم کرے اور انہیں اپنا سیاسی کردار ادا کرنے دے۔ لیکن یہ بڑی بے فہمی ہے کہ یہ طاقتور جو سراسر ابھی
 بھی اس بات کے لیے تیار نہیں؟

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! آپ کی اپنی ڈی ڈی کی آئی ایس آئی جرنل حکومت سے کی
 ڈی ڈی میں تھی ہیں تاکہ آپ کے ساتھ کوئی کی ڈی ڈی کی جائے۔ زرداری صاحب نے کبھی کبھار
 ہونے کہ ہاں میں اسکا کر، ہاں میں کہ جرنل حکومت مٹھ سے ملے کب آتے ہیں۔

میں نے کہا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ پیپلز پارٹی نے تمام انہیں فہم کی عمل میں ایک ہی جگہ کو
 پیپلز پارٹی کا لینڈ رٹا کر شاہ ایک اور جگہ اکپروہا کر لیا ہے۔

وہ لے نہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ یہ پیپلز پارٹی میں جڑے عرصے سے ہوا تھا کہ جب کوئی بھی
 ہونے جاتا تو کسی دوسرے کو پارٹی کے معاملات چلانے ہوتے تھے۔ جب انہیں عدلیہ میں جیل گئے تو
 انہیں چھوڑنے پارٹی چلائی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ پیپلز پارٹی ایک ایسی پارٹی ہے جس میں طرف
 کو تو یہاں جمہوریت کا حصہ ہیں۔ اس پر تنقید کرنے کے بجائے اس کی تعریف ہونی چاہیے۔

میں نے زرداری صاحب کو وہ ہار ماضی کی طرف لے جانے کی کوشش جاری رکھی اور کہا کہ ان
 کی اپنی پارٹی پر یہ الزام لگتا ہے کہ جب سیاسی پارٹیاں اور ان کے لیڈروں کو طاقتور اسٹیبلشمنٹ کے

تھے جس پر آپ کو مختار بنانے کا وقت آیا تو انہیں نے اپنے سیاسی ارادوں کے ساتھ کوہ
 ہونے کے بجائے انجمن خدمت کے ساتھ مل کر سولے کونریج دی۔ میں نے انہیں دیکھا کہ 1983ء
 میں جب علامہ اعلیٰ خان کو لاہور شریف کے درمیان کراچی شروع ہوئی تو وزیر بننے کے لئے ان شریف کے
 بجائے علامہ اعلیٰ خان کا ساتھ دیا تاکہ یہی علامہ اعلیٰ خان تھے جنہوں نے 16 اگست 1983ء کو لاہور
 کے وزارت کا کمرہ کی حکومت کو لاہور جی کے صوبہ زرداری کی بھی نہیں نے ملے تھے۔

زرداری صاحب نے میری اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ ان کی پارٹی علامہ اعلیٰ خان کے
 ہاتھوں میں کھلی تھی بلکہ ان کے جمل انہیں نے ان علامہ اعلیٰ خان کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے
 استعمال کیا تو جنہوں نے عمل میں سال پہلے ان کی حکومت میں اس کی تھی۔ زرداری صاحب مجھے کہنے
 لگے کہ تم لوگ یہ بات نہیں بول جاتے ہو کہ وہی علامہ اعلیٰ خان جنہوں نے تین سال پہلے انہیں جیل
 میں ڈال دیا تھا انہیں نے ہی اس سے ملک نے کراہے مگر ان حکومت میں وزیر بنایا۔ آصف زرداری سے
 وزارت کا ملک نے کہ علامہ اعلیٰ خان نے یہ اعتراف کیا تھا کہ آصف زرداری پر لگائے گئے تمام
 الزامات غلط تھے۔ ان کے لئے یہ ایک نیا گمان تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کراچی کے تمام الزامات
 ہوئے تھے۔ لاہور شریف اور علامہ اعلیٰ خان کے درمیان اختلافات بھی ابھی تھے اور دونوں وزیر بننے کی
 بجائے ان کی سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ ان دونوں کی گفتگو کا تہہ آصف زرداری
 کو ہوا کہ سب سے پہلے انہیں ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس دوران وزیر بننے ملک سے باہر چلی گئیں۔
 وہی ملک وزیر بننے کو لاہور شریف اور علامہ اعلیٰ خان کے بیانات ملے۔ دونوں وزیر بننے کے ساتھ
 آئی کہ ہاتھ تھے۔ لاہور شریف اور علامہ اعلیٰ خان اپنی اپنی سیاسی پارٹیاں چل رہے تھے تو وزیر بننے
 نے اپنے لئے دو سو پچاسی ملے تھے۔

آصف زرداری میرے سر سے ملے تھے اور میں چپ چاپ بیٹھ رہا تھا۔
 وزیر بننے نے اپنے تمام ساتھیوں کی سرکاری سماعتی کو لاہور شریف اور اعلیٰ خان کے
 ساتھ جاکر آنے کا حوالہ دیا تھا۔ وزیر بننے کا کہنا تھا کہ لاہور شریف کے اندر اس کی کہانی
 انہیں ملے گی کہ یہ وزیر بننے اور اس کی پارٹی کے اپنے ساتھ ہیں کہ اگر ان کو ملک کا صدر
 بن جائے گا تو انہیں اس کی بھی حوالہ دیا جائے گا کہ یہ ہے۔

زرداری صاحب کے جمل جملہ پارٹی نے اس میں ہر جملہ کی اس میں ہر جملہ

میں نے کہا کہ زرداری صاحب اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ 1983ء میں
 انتخابات ہوئے تھے وہ اختلاف تھے۔
 زرداری صاحب نے کہا میں نے ہوا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اختلاف تھے اس ملک میں
 کبھی بھی اختلاف انتخابات نہیں ہوئے۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب اس میں آتا ہے کہ جب آپ لوگ علامہ اعلیٰ خان سے
 مذاکرات کر رہے تھے اس وقت وزیر بننے نے انہیں یہ بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ انہیں دوبارہ
 صدر بنانے کے لیے اپنی پارٹی کے ووٹ ڈالیں گی، لیکن جب یہ موقع آیا تو پتلا پارٹی اور اس کی
 قیادت اپنے وعدے سے منکر تھی اور ان دنوں علامہ اعلیٰ خان کو صبر کے آخری لمحے میں پتہ چلا کہ میں واقع اپنے
 گمراہ ہوا ہوں۔

آصف زرداری بولے کہ اگر علامہ اعلیٰ خان اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے تو یہ اور بات تھی
 مگر پتلا پارٹی نے ان کے ساتھ اس طرح کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! پلیز ڈراما آگے بڑھتے ہیں۔ 1983ء میں آپ کی حکومت میں
 گئی۔ باغی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آپ لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف اور دوسرے دوسروں سے لڑا
 شروع کر دیا۔

زرداری صاحب بولے ہرگز نہیں! یہ وہ اصل انجمن خدمت تھی جو علامہ اعلیٰ خان کی تھی۔ وہ
 بولے میں صرف جنس سماجی تھا۔ علامہ اعلیٰ خان لاہور شریف اور اعلیٰ خان کو یہ گناہ نہیں دیا
 کہ وہ علامہ اعلیٰ خان سے تھے۔ وہ بھارت تو وہ بے گناہ سیاسی کردار تھے جنہیں علامہ اعلیٰ خان
 انجمن خدمت علامہ اعلیٰ خان استعمال کر رہی تھی۔ یہی انجمن خدمت تھی جس نے 1983ء میں پتلا پارٹی کی
 نمائندگی کا ایک وفد لاہور پتلا پارٹی کو لاہور شریف کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس وفد میں ان کی راجی تھی
 اور یہ بات کہ انہیں تھی کہ ان کے خلاف جو عمل خود ہی اس وقت ہو رہا تھا کہ اس کے لیے وزیر بننے
 کے لئے اسے اس لئے کہ اس کے لیے وہ سیاسی ارادوں کے تحت ہوا کرتے تھے۔

میرے ایک بچہ کو لکھا ہے
 یہ میری آواز ہے یہ میری طرف سے ہے
 یہ میری طرف سے ہے یہ میری طرف سے ہے

میں نے کہا کہ ہمدانی صاحب! محمدیہ کی ابتدا ہے کہ یہاں تک انہوں نے اپنے بھروسے
تک کے ہائی سولہ میں فوج کا کمانڈر عظیم کر لیں تو وہ نے اس میں کوئی شک نہیں کرتی ہیں
تک کہ وہ وہاں رہے اور یہاں سے میں اپنا کمانڈر مقرر کرتی رہے گی۔ انہیں ضرورت اس بات کی
ہے کہ محمدیہ کے ہائی کمانڈر کی تقریر کریں اور یہ تقریر صرف سو بیس ہی کر سکتے ہیں کہ فوج کا
ہاں سے میں اپنا کمانڈر رہا ہے۔

لکھ رہی تھیں چار سو سوائے گزہ کیا تھا۔ نہ داری صاحب کے کہہ سکی تھی اسی طرح تو
 لکھا تھا۔ میں نے ہی سے اسی سال پوچھا کہ داری صاحب جانتے جانتے یہ تو تھیں کہ میں سے
 کس میں داری کہنے کے لیے کہیں سے گئے کا شوق۔ مگر وہاں داری صاحب نے جو نقل دانت کے اندر
 میں نے لکھا ہے۔

تمہاری صاحب سکرانے سوچا کہ پرائیویٹ ایک قیدی ہوں۔ یہاں سزا خوں کے پیچھے ہمارے ایک قیدی کے لئے جانوروں کو مارنے سے انکار کر رکھا ہے۔

میں مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ آصف زور داری نے میرے سوال کا ایک دفعہ میرا جواب نہیں دیا تھا۔ بات بڑی واضح تھی، دیکھا تو لہجہ میرا سن نہیں کر رہے تھے کیونکہ میں ابھی ان کے اس دائرے میں شامل نہیں ہوا تھا جس میں میرے دیگر ساتھی دوست اور اہل ان لوگوں تھے یا میرا ایک نیچر سائنسدان کی طرح اور اپنے کاروبار میں نہ آنے کے لیے چار نہیں تھے کیونکہ میرا شک تھا کہ وہ ان دونوں فوجیوں سے علیحدہ اکرات کر رہے تھے اور ان کے اہمیت کو وہ اپنی اپنی کو راب نہیں کرنا چاہ رہے تھے کیونکہ وہ اپنے اسی اعزاز میں دیکھنے پہلے گئے یہ غیر انسانی طور پر انہوں نے کیا تھے کہ ان کے سال وہ صرف رہا ہوں کے بلکہ ملک میں سے انکسارات بھی ان کے اور ہتھیار پارٹی اقتدار میں آنے کی۔

[illegible]

وقت کو رہا ہوا ایک دن یہ خبر ہو چکی تھی کہ آئی کی طرف سے کوئی کشتی آئی ہے۔ یہ سارا
چھوڑ کر میں فوراً ان کی مشین کو آئی کر میں آگے بڑھا۔ پھر وہاں گیا کہ میں نے
تجارت میں ہے۔ جب میں نے آئی کوئی نہ ملنے کے بعد وہاں سے لوٹ گیا کہ یہ کشتی آئی
نہ تھی کہ میں وہاں سے لوٹ گیا۔ یہ سارا کو بھول جانے کی بات کر رہا ہے۔ اب وہ کوئی خبر
میں نہیں ملے گی کہ اس کی طرف پاکستان میں ہی شروعات ہوا ہے۔

ایک دن پھر میرے نئی فون کی ٹھکنی گئی۔ لاکھوں دوسری طرف پھر وہ کوئی قوم نہیں تھی۔
انہوں نے صرف اتنا کہا کہ صاحب آپ سے بات کریں گے۔ افسانہ دوسری صاحب نے دیکھا ہے
تو وہ اپنے سے غرے کی حرکت کرنی شروع کر دی کہ کس طرح اس ملک کو ان شرمہ مات کی ضرورت
ہے یہاں کے لیے انہیں ہر خطہ فکر کے لوگوں کا تعاون درکار ہے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ سلام آجائے
مگر جو میت سب مسافروں سے ملیں گے۔

بیمہ یونین بعد ڈاکٹر قیوم سومرو کا فون آیا۔ پتہ چلا کہ آصف زرداری صاحب جو اسی دور میں
میں چلے گئے تھے، 14 اپریل 2004ء کو لاہور کے ہوائی اڈے پر پاکستانی سماعتوں کے ہمراہ آلا چلا
ہے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے ہمارے ملک سے بیٹھنا پارٹی کے کارکن اکٹھے ہوں گے۔ مجھے بھی
نہیں نے وطن آنے کی دعوت دی۔

بات نہ کہ وہ شیخ کو دیکھ کر ہی تھی۔ بینظیر بھٹو کو آصف زرداری اور ان کے حامیوں نے اس بات پر
دکھائی کر لیا تھا کہ وہ بچپنے سے ہی سوانح میں پارٹی کے لیے کوئی ایسا ماحول پیدا نہیں کر سکی تھیں جس سے نہ
صرف وہ انہیں آتیں بلکہ پارٹی بھی اقتدار میں آتی۔ زرداری صاحب کی فوجیوں سے جیل کے دنوں
میں جوتے والی خیریت کا انہیں رنگ لاری تھیں۔ فوجیوں سے بات چیت کر کے آصف زرداری کو یوں لگا
کہ فوج ان کا قواحق دار ہے تو احمد دہلوی کو چار ہے لیکن بینظیر بھٹو پر نہیں۔ یوں بی بی اور زرداری صاحب نے یہ

لہذا کہا کہ ہمیں ایک ہی حال میں کر دیکھتے ہیں اور اس واقعہ فوجی سے اہل زرداری صاحب کر رہے ہیں کہ جینگیر بھٹو آصف زرداری سے ٹیلی فون کر کے والوں نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ اگر وہ لاہور میں اپنی سیاسی فوج کا مظاہرہ کر کے دیکھا جائے تو شاید جنرل مشرف کو راضی کر کے اس ملک میں سے انتخابات کرائے جاسکتے ہیں۔ آصف زرداری نے یہی کہانی جینگیر بھٹو کو بڑی اچھی طرح پہنچادی تھی۔ مرنے کیلئے کرتے کی صورت میں جینگیر بھٹو آصف زرداری کے پیچھے بیٹھ کر اپنی پارٹی کی قیادت سونپنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آصف زرداری کے دعویٰ سے لاہور آنے سے پہلے اکثر شاہد مسعود نے جب دونوں میاں بیوی کو ساتھ لے کر اسے آروائی فی دی کے لیے انٹرویو کیا تو اس میں انہوں نے ایک بڑا اہم صورت سوال پوچھا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستانی فوج ان پر (جینگیر بھٹو) اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے، جبکہ ان کے شوہر آصف زرداری پر وہ بھروسہ کرنے کو تیار ہے۔ جینگیر بھٹو نے طرز یہ منکرانہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ پاکستانی فوجی آصف زرداری پر شاید اس لیے اعتماد کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ ایک مٹری کانٹا ہمارے ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں جبکہ وہ (جینگیر بھٹو) ایک سولین ہیں۔ پاکستانی فوجی ابھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ذیل کرنے اور اعتبار کرنے پر تیار ہیں جو فوجی نہ سکی لیکن ان کے فوجی سکول میں پڑھا ہوا تھا۔

جینگیر بھٹو کا یہ جواب قلمندوں کے لیے بطور اشارہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ یہ سارا میلہ آصف زرداری پاکستانی فوج کے ان جرنیلوں سے ملاقاتوں کے بعد چارہ ہے تھے جو محمد امین فہیم کے ساتھ رات کے اندر صبح سے صبح ان سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

جب میں دعویٰ ایئر پورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ میں دیگر لیڈروں کی طرح جینگیر بھٹو سے بھی مل کر ان کی اسی طرح کی ایک سیاسی پروفاٹل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے ان کے ترجمان فرحت اللہ بابر سے مدد چاہی جو اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جینگیر بھٹو سے بات کر کے وقت ملے کر لیں گے۔ جب میں نے دو تین دفعہ فرحت اللہ بابر کو یاد دہانی کرائی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے محض ہال رہے ہیں۔ میں نے بعد میں ادھر ادھر سے سن گئی لی تو پتہ چلا کہ آصف زرداری نے جینگیر بھٹو پر یہ پابندی لگائی ہوئی تھی کہ وہ کسی بھی پاکستانی صحافی سے نہیں ملے گی اور نہ ہی کوئی اعتراف دے گی تاکہ میڈیا کی تمام تر توجہ ان پر اور ان کے مقصد پر فوکس رہے۔ یہی وجہ تھی کہ

انہوں نے آنے سے پہلے کھلے پہلے جب آصف زرداری نے اس ہول میں آ کر یہ لیس کاغذ اس کی جہاں پاکستانی صحافی ٹھہرے ہوئے تھے تو جینگیر ان کے ساتھ نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ صرف جہاں زرداری تھے۔ جب ہم سب لوگ دعویٰ ایئر پورٹ پر پہنچے تو جینگیر پارٹی کے کچھ جیالوں نے انہیں پورٹ پر زرداری صاحب کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔ وہ وقت بعد دعویٰ پورٹ کے ایک سپاہی نے آ کر صرف انکا کہا کہ اگر اس کے بعد کسی نے نعرہ مارا تو ان سب کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی کو نہ سے کوئی آواز نہیں آئی۔

جہاز کی روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمیں کئی کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ چہ میگوئیاں بڑھتی تھیں۔ ادھر پاکستان سے یہ خبریں آرہی تھیں کہ وہاں پاکستان جینگیر پارٹی کے ورکرز چاروں سویوں سے اکٹھے ہو کر لاہور ایئر پورٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الہی پنجاب کی روایتی خالمانہ پولیس فورس کے ساتھ جینگیر پارٹی کے ورکروں کی ہڈیاں توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آصف زرداری نے ایک عجیب سی بات کی۔ انہوں نے اپنے پارٹی ورکروں سے کہا کہ وہ ایئر پورٹ کی طرف نہ آئیں۔ جو جہاں ہے وہ وہیں رک کر بیٹھ کر دھرم دے دے۔ جہاز کی روانگی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس نے صبح سویرے ہی لاہور ایئر پورٹ پر اترا تھا۔ ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اتنی جلدی لاہور ایئر پورٹ پر اترنے کی کیا وجہ تھی کیونکہ اس وقت تو پارٹی ورکرز کے لیے انہیں ایئر پورٹ آ کر ریسیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی کنفیوژن میں ہم صحافی جہاز پر سوار ہوئے اور ہم نے اپنے بورڈنگ کارڈز پر لکھے ہوئے نمبروں کے مطابق سٹیشن ڈسکونٹ نے کی کوشش کی تو ہمیں کہا گیا کہ کسی بھی جگہ بیٹھ جاؤ کیونکہ یہ چارٹرڈ جہاز تھا۔ زرداری صاحب تمام راستہ نہیں سوئے۔ وہ ہر ایک صحافی کے ساتھ اپنے روایتی انداز میں گپ شپ کرتے رہے۔ جب جہاز صبح سویرے لاہور کی فضاؤں میں پہنچا تو یکدم ماحول میں گرمی آ گئی۔ ڈاکٹر شاہد مسعود سب سے زیادہ پھرتیاں دکھا رہے تھے۔ وہ کبھی بھاگ کر پائلٹ کے کیمین میں جاتے تو کبھی آصف زرداری کے کان میں سرگوشیاں کرتے پائے جاتے۔ آہستہ آہستہ یہ جھنجھٹا ہٹ شروع ہو گئی کہ شاید جہاز کو لاہور ایئر پورٹ پر نہ اترنے دیا جائے۔ آخر یہ جنگ نیوز ڈاکٹر شاہد مسعود نے ہی سرگوشی کی شکل میں ایک دو صحافیوں کو دی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب جہاز ایئر

پورٹ پر اتار دیا ہوا جو کچھ ہمیں دیکھنے کو ملا اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر شاہد مسعود کی بات ٹھیک تھی کہ جہاز اترنے سے پہلے ہی زرداری صاحب کا فوجی جرنیلوں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ہوا جس کی نوبت پہنچا تھا۔ اس معاہدے کے واسطے گواہ تھے ہم اس میں قہیم آصف زرداری صاحب کی بغل میں تھے۔ جہاز کے اندر کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایئر پورٹ پر چاروں طرف پھیلے ہوئے پنجاب پولیس کے کمانڈرز کیا کرنے والے تھے۔ ایئر پورٹ کے چند جیالوں نے آصف زرداری کا مہرال بلندہ کرنے کے لیے غرے بازی شروع کر دی۔ خاصی دیر تک جہاز کے دروازے بند رہے۔ یہ غرے کو بجھ رہے۔ آخر جہاز کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی یہ غرے یکدم بند ہو گئے۔ ایک نو جوان ایس پی نہیں اپنے کمانڈرز کے ساتھ اندر آیا۔ زرداری صاحب نے اسے دور سے آواز دے کر اپنے پاس بلا دیا اور کہا کہ تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ وہ کمانڈر مجھے لے جاؤ۔ ایس پی نہیں نے آتے ہی آصف زرداری کے گھٹس پر ہاتھ لگایا۔ عمارت میں تھا کہ شاید آصف زرداری اور ان کے جیالے اس گرفتاری پر حیرت کریں گے اور ایئر پورٹ سے باہر نکل کر اپنی پارٹی کے جیالوں کی قیادت کریں گے۔ ایک ہی لمحے میں ساری بازی پلٹ گئی تھی۔ آصف زرداری اپنے راتروں کے اس میں قہیم کا ہاتھ پکڑ کر دوسرا ہاتھ ایس پی نہیں کے ہاتھ میں ڈال کر تیزی سے ہوائی جہاز سے اترے اور بیڑیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی سرسبز بڑ میں بیٹھ کر وہاں سے سیدھے لاہور میں واقع اپنے زرداری ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم صحافی بکوا کا ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور اس کے کچھ نہیں آری تھی کہ اب کیا ہو گا۔ ہم تو یہ کچھ کہہ رہے تھے کہ شاید ہم پاکستانی جرنیل کے ایک اہم واقعے اور تبدیلی کے معنی شاہد بننے والے تھے کہ آصف زرداری کے لاہور ایئر پورٹ پر اترتے ہی ملک میں نئے احتجاجات کا اعلان ہو جائے گا اور بقول ان کے ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔

ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس ملک میں انقلاب آئے یا نہ آئے، تھوڑی دیر بعد ہم صحافیوں کے سروں پر چوہدری پرویز الہی کے کمانڈرز کی شکل میں ایک قیامت ضرور آنے والی تھی۔ جو بھی ہم صحافی جہاز سے باہر نکلے چوہدری پرویز الہی کے علم پر ہمیں ایک لائن میں کھڑا کر کے ان کمانڈرز نے ہماری انجینیئرنگ کے ساتھ حاشیہ لے کر شروع کر دی۔ سب صحافیوں کو کہا گیا کہ اپنے موہاگل اور کیمرے ہاتھ میں لے کر کے چپ چاپ بیٹھ جا کر بیٹھ جائیں۔ وہ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے جب

ہم ان کی کیمرس نہ ہو۔ یہ سارے صحافی جن میں انتہائی سیکرٹریل احترام دوست بھی شامل تھے چہرے جمعے جاتے اور جہاز کے سر کی وجہ سے پہلے ہی چڑھنے سے ہوئے اور بے تھکے۔ اوپر سے آصف زرداری صاحب ان کی نظروں کے سامنے ہی اپنا کھیل کھیل کر نکل گئے تھے۔ وہ صحافی جو اس امید پر پچھلے دو برس گھٹس میں پاکستان سے دغی اور دغی سے اب لاہور کا سفر کر کے اس امید پر آئے تھے کہ شاید وہ جرنیل کو اپنی آنکھوں کے سامنے بننے دیکھیں گے وہ اب پرویز الہی کی پولیس کے ہاتھوں ڈھیلے ہونے والے تھے۔ میں لاہور کے صحافیوں کو یہ دو دروں کا خصوصاً عامر میر کو جنہوں نے پنجاب پولیس کے ان کمانڈرز کو اپنے لیپ ٹاپ، موہاگل فونز اور کیمروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ ان سب نے وہیں دھرم دیا اور کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو یہ چیزیں چھیننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سوائی بھی بجز کے ہوئے تھے تو کمانڈرز کو بھی چوہدری پرویز الہی نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ ان تمام صحافیوں کی تواضع کرنی ہے جو جرأت کر کے آصف زرداری کے ساتھ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے آ رہے تھے۔ کافی دیر تک صحافیوں اور پولیس والوں میں سخت جھڑپوں کا چاول ہوتا رہا آخر پولیس والوں نے صحافیوں کو کھدکا کھدکا بنا کر شروع کیا۔ پولیس کمانڈرز کے کھدکا کھدکا سے زیادہ خطرہ عمارت دوست مظہر قسطل ہوئے جنہیں بڑے بڑے طریقے سے ان کمانڈرز نے مارا۔ کچھ اور صحافیوں کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں بڑا عجیب سا منظر تھا۔ صحافی بکھڑے تھے کہ آصف زرداری نہیں جان بوجھ کر پنجاب پولیس کے کمانڈرز کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نکل اپنی جان بچا کر نکل گئے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پہلے ان صحافیوں کو باحفاظت ایئر پورٹ سے نکلواتے اور اس کے بعد ہی وہ ایس پی نہیں کا ہاتھ پکڑ کر جہاز سے باہر نکلتے لیکن وہ تو بہت جلدی میں تھے۔ یوں پنجاب پولیس کے کمانڈرز نے صحافیوں پر کھدکا کرنے کے بعد ان کے موہاگل فونز اور کیمرے قبضے میں لے لیے۔ اس وقت کے ایس پی الہی اپنی آپریشنز آفتاب چیمبر کی زیر قیادت پنجاب پولیس کے کمانڈرز ایک طرف صحافیوں کو مار رہے تھے تو دوسری طرف چیمبر صاحب پانی کی بوتلیں صحافیوں میں پھینک رہے تھے۔

نیکرٹ ایجنسیوں نے بڑی چالاکی سے آصف زرداری کے گھارے سے ہوا کال دی تھی۔ ان کے آٹھ سالہ جہد اور کرپشن خفاک میں مل گئی تھی۔ ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ای بی ایم آئی ہزل مدیم تاج کے ساتھ ہونے والی ذیل ناکام ہو گئی یا کر دی گئی تھی دوسرے سے اس کا جوہری

نہیں تھا۔ آصف زرداری کو یہی ہی جزل مشرف نے جیل سے باہر نکالنا تھا کیونکہ اب تو ہر اخبار کا علم
نظر اور صحافی انہیں مرد و عورت کا درجہ دیکھ کر انہیں ناپس منظر ملانے پر قتل کیا تھا۔ وہ جزل مشرف کے لیے
قیدی کی صورت میں ایک پرائیوٹ بننے جا رہے تھے۔ یوں انہیں نئے انتخابات اور اقتدار کی راہ مل گئی تھی
کر پہلے دینی اور پھر دینی سے لاہور بلوا کر چوہدری پرویز الہی کے ہاتھوں ذلیل کر کے ایک سپر ڈکریا
کیا۔ بینظیر بھٹو کو شاید ان تمام باتوں کا احساس تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ آصف زرداری خود ان کو یہی
ہر نیوں کے ہاتھوں کچھ سبق سیکھیں۔

چند دنوں بعد جب ہنگامہ تھا تو ہی آصف زرداری جو چوہدری پرویز الہی کی حکومت کا تھوڑے
ات کر لاہور پر قبضہ کر کے ملک میں نئے انتخابات اور اپنی پارٹی کو اقتدار دلانے کے لیے دینی سے آئے
تھے وہ انہیں دینی کچھ اس انداز سے گئے کہ میڈیا کو بھی کئی دنوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر سننے میں
آیا کہ وہ دینی سے جا کر نیو یارک کے ایک ہسپتال میں دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر داخل ہو گئے۔ پھر
سننے میں آیا کہ وہ اب نیو یارک میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو کے امریکیوں سے مذاکرات کرانے کے لیے
لاہنگ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ پاکستانی میڈیا اور عوام انہیں بھول گئے کہ ایک دن پتہ چلا کہ بینظیر بھٹو
کو قتل کر دیا گیا ہے اور آصف زرداری دینی سے چکالہ ایئر میں پہنچ کر ان کا جسد خاکی گڑھی خدا بخش
لے جانے کے لیے تین سال بعد اس ملک کا صدر بننے کے لیے واپس آ رہے تھے۔

آفتاب احمد خان شیر پاؤ

آفتاب احمد شیر پاؤ کا سیاست دان بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ ان کے بھائی
ذات خان شیر پاؤ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لمحے انہوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ فوج میں رہیں یا خاندان کی
سیاسی گدی سنبھالیں۔ انہوں نے آرمی چھوڑی اور سیاست دان بننے کا فیصلہ کیا۔
جب وہ سیاست میں آئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں تو تقریریں بھی کرنی ہیں لیکن انہیں صحیح اردو
بولی نہیں آتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ سیاست اور اردو سیکھتے اتنی دیر میں جزل ضیاء ذوالفقار علی بھٹو کو چھانسی
دے چکے تھے۔ آفتاب احمد شیر پاؤ بھٹو صاحب کی بیٹی کے پاس آئے، اسے اپنے ساتھ لیا اور صوبہ
سرحد کے مختلف علاقوں میں جلسوں سے خطاب کرانے لے گئے۔ سرحد کے گورنر جزل فضل حق تک یہ
بات پہنچی تو انہوں نے شیر پاؤ کو جزل ضیاء کے ساتھ ملانے کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ شیر پاؤ نے اپنے
مردم بھائی کی پارٹی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

بینظیر بھٹو صاحبہ نے بھی شیر پاؤ کی پارٹی کی خدمات کو سراہنا شروع کر دیا تھا۔ جزل ضیاء کی
عمارے کے کریش میں موت واقع ہو چکی تھی اور پیپلز پارٹی کی پہلی دفعہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں بھٹو
صاحب کی عوامی شخصیت کے بغیر انتخابات لڑنے جا رہی تھی۔ سرحد میں شیر پاؤ صاحب نے کوشش کی
کہ صوبے کی دیگر مضبوط سیاسی پارٹیاں اسے این پی اور جے پی آئی کے ساتھ مل کر ایک سیاسی اتحاد بنا کر

ایکشن ٹراہا ہے۔ دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح ان کے اپنے ٹیبلٹ پارٹی خلاف ووٹرز انہیں ووٹ نہیں دالیں گے۔ یہ ٹیبلٹ بات ہے کہ جب انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ پیپلز پارٹی اسمبلی میں اتنی نشستیں لے چکی ہے کہ وہ شیر پاؤ کو صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا سکتی ہے۔ میں نے شیر پاؤ سے وہی روایتی سوال پوچھا کہ کیا پارٹی کو 1988ء میں اسمبلی نشست کے ساتھ ڈیل کر کے اقتدار میں آنا چاہیے تھا۔ شیر پاؤ صاحب بولے کہ بالکل! پارٹی کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا۔ یہ ٹیبلٹ بات تھی کہ بینظیر بھٹو نے اپنی حکومت کو کیسے چھوڑ دیا۔ شیر پاؤ صاحب کا خیال تھا کہ واصل کیا وہ سال بعد پیپلز پارٹی کو پہلی نمبر اقتدار ملا تھا۔ پارٹی کے لوگوں نے بہت قربانیاں دی ہوئی تھیں۔ اگر یہ موقع بھی ضائع کر دیا جاتا تو پارٹی کو کمر بہت بچا ہوتا۔ یہ ایک ٹیبلٹ کہانی ہے کہ کیسے پارٹی کے لیڈر اپنے پارٹی کے لوگوں کی امیدوں پر چڑھے اور ان کے کام سے اور بینظیر بھٹو کی حکومت توڑ دی گئی۔ تاہم لوگوں نے بینظیر بھٹو کے خلاف لگائے گئے الزامات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔

جب 1990ء میں بینظیر بھٹو کو ہٹانے کے لیے تحریک عدم सहकारی کی گئی تو پنجاب میں موجود نواز شریف کپ سے ایک پیغام بھیجا گیا تھا کہ یہ تحریک عدم सहکار کا میاب نہیں ہوگی کیونکہ نواز شریف غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو بینظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے بعد اس جگہ کے لیے امیدوار تھے۔

بینظیر بھٹو اور شیر پاؤ 1990ء میں پیپلز پارٹی کی ختم ہونے والی حکومت میں نواز شریف کے کردار کو نہیں بھولے تھے۔ یہی وجہ تھی جب 1993ء میں نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے تو شیر پاؤ نے غلام اسحاق خان اور بینظیر بھٹو کے درمیان ایک خفیہ ڈیل کرائی تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو پتہ چل گیا تھا کہ نواز شریف غلام اسحاق خان کے اس آئینی اختیار کو ختم کرنا چاہتے تھے جس کے تحت وہ ان کی حکومت اور پارلیمنٹ کو ڈس مس کر سکتے تھے۔ نواز شریف کو غلام اسحاق خان کے ہاتھ کاٹنے کے لیے پیپلز پارٹی کی سپورٹ کی ضرورت تھی کیونکہ ان کے پاس ہاؤس میں اتنے ووٹ نہیں تھے کہ وہ اکیلے یہ ترمیم لاسکتے۔ نواز شریف اپنی بھرپور کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ایک آزاد اور خود مختار وزیر اعظم کے طور پر پارلیمنٹ، عوام اور میڈیا کے سامنے پیش کریں۔ تاہم نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب ایک

جس وقت کے چیل آف آرمی خلاف نواز اسحاق خان نے مدد کی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے ہی کہ نواز آرمی چیل کون ہوگا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ غلام اسحاق خان اور نواز شریف نے ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پیپلز پارٹی کی قیادت نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان پارٹی اس جنگ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وجہ کا ذکر تو آرمی چیل ہیڈ لائن میں کے ساتھ ہی ساتوں رات سارا نقشہ بول گیا۔ جنت گزرنے کے ساتھ ساتھ نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں اختلافات بڑھتے گئے۔ نواز شریف کی اسلام آباد حکومت کو اس جنت سب سے زیادہ بچاؤ جب ملے گا تو انہیں اور انور سید اللہ نے نواز شریف کی کاہل سے اتفاق کر لیا۔

سیاسی مہل جنگ بگ بگ چکا تھا اور اس مہل کے سارے پتے اب بینظیر بھٹو کے ہاتھ میں آچکے تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحاق خان دونوں نے بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا۔ وہ اب اس پوزیشن میں آ گئی تھیں کہ جس کے سر پر چاہیں اقتدار کا تاج رکھیں۔ یہ پیپلز پارٹی کی قیادت کا بہت بڑا چیلن تھا کہ کیسے وہ اس تمام سے سیاسی مہر نامے سے بڑی کھداری کے ساتھ ہوا کی طرف سے پیسے لگے اس مہر نامے سے فائدہ اٹھائے۔ پیپلز پارٹی نے پاور پارٹیکس کی اور آلے والے دنوں میں وہ سارے فائدے حاصل کیے جو ان موقعوں پر سیاستدان اپنی مختلف چالیں چل کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نواز شریف کیمپ میں فرسٹریشن بہت زیادہ تھی کیونکہ بینظیر بھٹو کی سپورٹ کے بغیر غلام اسحاق خان نواز شریف حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جب بینظیر بھٹو کو نواز شریف نے قومی اسمبلی کی قائد کیمپلی برائے وزارت خارجہ کا حق زمین بننے کی پیشکش کی تو پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے محترمہ کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ یہ آفر قبول کر لیں۔ تاہم سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے کچھ اراکان بینظیر کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بے کار کی کوشش تھی۔ نواز شریف کیمپ بینظیر بھٹو کے اس دوستانہ سائل پر بہت خوش ہوا۔ وہ سمجھے کہ بات بن گئی تھی۔ نواز شریف نے بینظیر بھٹو کو پیغام بھجوایا کہ وہ انہیں اپنی حکومت میں ڈپٹی پرائمر فسر بنانے پر تیار تھے اگر وہ غلام اسحاق خان کا ساتھ نہ دیں۔ وہ پاکستان میں ایک اور سیاسی حکومت کو ڈس مس کرنے کے لیے پرتول رہے تھے۔ نواز شریف بینظیر بھٹو کے ساتھ پارلیمنٹ میں ایک طاقتور سیاسی اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ نواز شریف نے یہاں تک پیشکش کی کہ وہ پیپلز پارٹی کے کسی بھی لیڈر کو غلام اسحاق خان کے جانے

کے بعد ملک کا صدر بنانے کے لیے حمایت کریں گے۔

بینظیر بھٹو ایک بہت بڑے جلسے کا خطاب کریں گے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ نواز شریف سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقع تھا جنہوں نے 89-90 میں ان کی پہلی حکومت کو انجمنی غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر ڈس مس کر دیا تھا اور خود وزیراعظم بن گئے تھے۔ آج وہی غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرا گلہ گلے پر تھے ہوئے تھے۔

دوسرے، بینظیر بھٹو کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ یہ غلام اسحاق خان سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقع تھا جنہوں نے کرپشن کے الزامات لگا کر ان کی حکومت ختم کی تھی، ان کے خاندان آصف علی زرداری کو آٹھ سال جیل میں رکھا اور ان کے خلاف مقدمات بنائے۔ آج موقع تھا کہ وہ نواز شریف کے ہاتھوں غلام اسحاق خان کو سیاسی طور پر ذلیل کر کر ان سے بدلہ لے لیں۔

پارٹی کے اندر سے بھی بینظیر بھٹو پر یہ دباؤ تھا کہ وہ ایک ڈیموکریٹ ہونے کے ناطے نواز شریف کا ساتھ دیں کیونکہ وہ پاکستانی عوام، میڈیا اور ورکرز کے سامنے غلام اسحاق خان کی سپورٹ کا جواز پیش نہیں کر سکیں گے۔ ساری عمر کے لیے پیپلز پارٹی کی قیادت پر یہی وحید نگار رہے گا کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے منتخب شدہ ایک وزیراعظم کے بجائے اسٹبلشمنٹ کے نمائندے جس نے ان پر کرپشن کا الزام لگا کر ان کی حکومت توڑی، ان کی حمایت کی تھی۔

آفتاب شیرپاؤ سے پوچھا گیا تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ نواز شریف کے بجائے غلام اسحاق خان کی حمایت کریں کیونکہ ایک ایسے صدر سے انہیں زیادہ سیاسی فائدہ ملنے کی توقع ہے جس کے پاس پارلیمنٹ اور حکومت کو توڑنے کے اختیارات ہیں۔

بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کے درمیان جو لوگ خفیہ مذاکرات کر رہے تھے انہیں بتایا گیا کہ وہ صدر کے کپ ٹک یہ پیغام پہنچائیں کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو ہر طرف کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کریں۔ غلام اسحاق خان کی طرف سے خفیہ مذاکرات کرنے والے لوگ ان بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی اور غلام اسحاق خان کے درمیان یہ خفیہ مذاکراتیں شیرپاؤ کے اسلام آباد میں واقع گھر پر جاری رہیں۔

مخاطب کے علاوہ باقی تین صوبوں کے وزراء اعلیٰ غلام اسحاق خان کے وہاں رہتے تھے اور یہ بات

نواز شریف کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

جب بھی پارٹی کی میٹنگز ہوتیں تو بینظیر بھٹو اس بات کی مخالفت کرتیں کہ ان کی غلام اسحاق خان کے ساتھ ملاقات ہونی چاہیے۔ تاہم، فاروق لغاری اور شیرپاؤ کو یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ بینظیر بھٹو غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر جانا چاہتی تھیں جنہوں نے ان کی پہلی حکومت کو کرپشن جارجز پر ڈس مس کیا تھا۔ آخر فاروق لغاری اور شیرپاؤ بینظیر بھٹو کو غلام اسحاق خان سے ملانے لے گئے اور ان دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ جب بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے مذاکرات کر رہے تھے تو بینظیر بھٹو نے شیرپاؤ سے کہا کہ وہ بھی ان مذاکرات میں شامل ہو جائیں۔ بینظیر اور غلام اسحاق کے درمیان بہت بھیدہ بحث و مباحثہ جاری تھا۔ غلام اسحاق خان اس بات پر ہند تھے کہ صرف قومی اسمبلی توڑی جائے گی اور صوبائی اسمبلیاں اپنا کام کرتی رہیں گی۔

بینظیر بھٹو شیرپاؤ سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ جو لوگ پارٹی کی طرف سے مذاکرات کر رہے تھے ان کے غلام اسحاق خان کمپ سے کس طرح کے مذاکرات ہوئے تھے۔ شیرپاؤ نے بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کو بتایا کہ مذاکرات میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑی جائیں گی۔ اس پر غلام اسحاق خان نے کہا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے وہ قومی اسمبلی کو برخاست کریں گے۔ غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے ساتھ ملک کے نئے نگران وزیراعظم کا نام بھی ڈسکس کیا۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ شیخ مزاری اس ملک کے نئے وزیراعظم ہوں گے تو بینظیر بھٹو نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

غلام اسحاق خان نے بھی کئی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ذہن میں بھی ایک گیم پلان موجود تھا۔ وہ بینظیر بھٹو کی مدد سے پہلے نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور پھر اپنے وزیراعظم صوبائی وزراء اعلیٰ کی مدد سے قومی اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرنا اپنی مرضی کی پارلیمنٹ وجود میں لانا چاہتے تھے۔ غلام اسحاق خان کا پلان تھا کہ پیپلز پارٹی کو چالیس سے پچاس سینیٹیں ملیں گی۔ ایک ایک پارلیمنٹ کو اپنی مرضی سے چلانا آسان ہو گا جس میں کسی پارٹی کی اکثریت نہیں ہوگی اور یوں غلام اسحاق خان اپنی مرضی سے اسلام آباد میں ایک کھپتی حکومت تشکیل دیکر اپنا صدر سے پورے ملک کی حکومت کریں گے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کھیلنا جارا تھا

اور ایک دن تمہارا چا کر لیا گیا تھا اس میں بنظیر بھٹو اور شریف کی بہنوں نے بھی شرکت کی تھی۔
 بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو زبردستی ہٹا دیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو زبردستی ہٹا دیا تھا۔
 بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو زبردستی ہٹا دیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو زبردستی ہٹا دیا تھا۔

جب یہ حکومت نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی
 حکومت میں حصہ لیا گیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی
 حکومت میں حصہ لیا گیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی

یہ حکومت میں عام انتخابات دینے کے بعد شریف ایک نئی حکومت
 بنوائی۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی
 حکومت میں حصہ لیا گیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اس ملک میں سے انتخابات کون کرانے کا۔ سربراہ مزبور
 سے ہمیں قرینگی کا کام لے کر آئے اور انہیں نگران وزیراعظم بنادیا گیا۔

میں نے شیرپاؤ سے پوچھا کہ مولانا بکھا جاتا ہے کہ بنظیر بھٹو نے غلام اسحاق خان سے وعدہ
 کیا تھا کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو اس میں کرنے کے جواب میں انہیں دوسری دفعہ ملک کا صدر بنائیں
 گی۔ لیکن وہ وقت آیا تو انہوں نے فاروق لغاری کو صدر بنوا کر ان سے وعدہ کر لیا۔

شیرپاؤ نے اس بات سے انکار کیا کہ بنظیر بھٹو نے کبھی اس طرح کا وعدہ غلام اسحاق خان
 سے کیا تھا۔

میں نے کہا کہ شیرپاؤ صاحب اپنی چھوڑیں یہ بتائیں کہ بنظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے

درمیان اختلافات کیسے اور کیسے ہوئے۔
 شیرپاؤ نے مجھے ایک نئی کہانی سنائی۔

ان کے خیال میں بنظیر بھٹو کا فاروق لغاری کو صدر بنانے کا فیصلہ ہی اختلافات کی وجہ سے
 بنظیر بھٹو کی حکومت میں ان کے خلاف ہو گیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی
 حکومت میں حصہ لیا گیا تھا۔ بنظیر بھٹو نے شریف کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو بنظیر بھٹو کی بھی

فاروق لغاری پہلے ان سے ہی اس ملک کے خواتین کو صدر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔
 حکومت کو بھی پتا ہے تھا کہ وہ فاروق صاحب کو اس ملک کا صدر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔
 ایک صدر کو بھی پتا ہے تھا۔ فاروق صاحب کو بھی پتا ہے تھا کہ ایک ایسے رابرٹ کے طور پر وقت نہیں گزرتا
 پتا ہے تھا۔

بنظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان کئی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ حالات وہ بدل گئے تھے
 سے نکلتے جا رہے تھے۔ دونوں کے درمیان سب سے پہلے صحیحہ و اختلافات چیف جسٹس سجاد علی شاہ
 اور ایبڑ چیف کی تقرری پر ابھرے۔ بنظیر بھٹو کو اس خشک گوتیا ایبڑ چیف لگانا چاہوری تھیں۔ حالات
 گونے کے باوجود بنظیر بھٹو کو آخری لمحے تک یہ یقین تھا کہ فاروق لغاری ان کی حکومت کو اس میں نہیں
 کریں گے۔ تاہم، بنظیر بھٹو کے ساتھ ایک پراہم تھا کہ وہ اپنا ملک ایک بڑا سخت موقف اختیار کر لیتی
 تھیں جس سے شیرپاؤ جیسے لوگوں کے لیے پراہم پیدا ہو جاتے تھے کہ وہ دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ
 کن رول ادا کر سکیں۔ سجاد علی شاہ کا اس لڑائی میں رول بہت اہمیت اختیار کر چکا تھا خصوصاً جب بنظیر
 بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ان صدر کے مکیٹوں پر قاتل ہونے کا الزام لگایا تھا۔ بنظیر بھٹو کے
 اہل ان صدر کے مکیٹوں پر مرتضیٰ کے قاتل ہونے کے پیچھے بھی کہانی تھی کہ جس رات مرتضیٰ کو قتل

دوسری طرف جنرل جہاگیر کرامت بھی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح سے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک مرحلے پر تو جنرل جہاگیر کرامت نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی آفری کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر فاروق لغاری کے پاس جائیں گے تاکہ دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی لڑائیوں کو دور کیا جاسکے۔

بینظیر بھٹو نے جہاگیر کرامت کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے ان کی پیشکش شائقگی سے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرنے کے لیے آری چیف کو اس میں ملوث نہیں کریں گی۔ بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ کو بتایا کہ وہ چیف آف آرمی سٹاف کی اس معاملے میں مدد نہیں لیں گی۔

شیر پاؤ نے بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ پیدا ہونے والے اختلافات کو ایک ایک کر کے حل کریں لیکن بینظیر بھٹو ان سارے اختلافات کو ایک ہی میٹنگ میں بیٹھ کر ختم کرنا چاہتی تھیں۔ شیر پاؤ نے یاد کیا کہ معاملات بہت پہلے ہی بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ بینظیر بھٹو اس بات پر بہت پریشان تھیں کہ کیا فاروق لغاری آصف زرداری سے وفاقی وزیر کا حلف لینے سے انکار تو نہیں کریں گے۔ جب شیر پاؤ نے یہی بات فاروق لغاری سے کی تو انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کی طرف سے بھیجی گئی دو چیزوں پر کبھی اعتراض نہیں کریں گے۔ ایک یہ کہ اگر وہ کسی شخص کا نام انہیں بھیجتی ہیں کہ ان سے وزیر کا حلف لیا جائے تو وہ ضرور حلف لیں گے۔ دوسرے وہ اگر انہیں یہ سفارش بھیجتی ہیں کہ قومی اسمبلی توڑ دی جائے تو وہ فوراً توڑ دیں گے۔

بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان تعلقات اب پوائنٹ آف نور یٹرن تک پہنچ چکے تھے۔ حالات کسی ایک وجہ سے اس نہج پر نہیں پہنچے تھے۔ ایک دن ایوان صدر میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ججوں کی تقرری کے مسئلے پر صدر اور وزیراعظم کے نمائندوں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ صدر کی طرف سے نوید طارق رحیم، امجد سعید اعوان اور شاہد حامد نے شرکت کی۔ بینظیر بھٹو کی طرف سے وزیر قانون رضاربانی، اس وقت کے لاء سیکرٹری اور آفتاب شیر پاؤ اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ اسی وقت ہی ختم ہو گئی جب دونوں اطراف کے لوگوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر طعنہ کرنا شروع کر دیے۔

بینظیر بھٹو کو پتا چل چکا تھا کہ معاملات بہت بگڑ گئے تھے۔ وہ پھر بھی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں سر شاہ گلوتی بات کہیں بن جائے۔ بینظیر بھٹو نے ایک رات شیر پاؤ کو پٹا دے دیا اور انہیں کہا کہ فوری طور پر اسلام آباد پہنچیں۔ وہ شیر پاؤ کے ساتھ فاروق لغاری سے ملنا چاہ رہی تھیں۔ آفتاب شیر پاؤ ابھی اسلام آباد کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ بینظیر بھٹو نے بارہ بجے کے قریب 5 نومبر 1998ء کو فون کر کے شیر پاؤ کو بتایا کہ اب انہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فاروق لغاری ان کی حکومت توڑ چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ اب وہ آرام سے کل اسلام آباد آ جائیں۔

فاروق لغاری نے بینظیر حکومت توڑتے ہی پرائم منسٹر ہاؤس آنے جانے والے راستے بند کر دیے۔ کسی کو بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ آفتاب شیر پاؤ وہ واحد لیڈر تھے جنہیں بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت دی گئی۔

اپنی حکومت کے توڑے جانے کے اگلے روز بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ ان کی حکومت کیوں توڑی گئی تھی۔ فاروق لغاری نے آگے سے جواب دیا کہ ہاں، وہ ان کی حکومت کو ڈس مس کر چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے ان سے پوچھا کہ صوبائی اسمبلیوں کا کیا بنے گا۔ فاروق لغاری نے جواب دیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو بھی ڈس مس کریں گے۔

نئی فون پر ہونے والی اس گفتگو کے درمیان میں فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی پیشکش کی کہ وہ انہیں نگران سیٹ اپ میں شامل لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی دکھا دیں گے۔

جب آفتاب شیر پاؤ ایک برطرف وزیراعظم سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملے تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ رابطے میں رہیں کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ رضاربانی کو ساتھ لے کر فاروق لغاری سے ملنے جائیں تاہم رضاربانی مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچے اور یوں شیر پاؤ کو فاروق لغاری سے ملنے کے لیے اکیلے جانا پڑا۔

لغاری نے شیر پاؤ کو بتایا کہ انہوں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا تھا اور پھر وہ انہیں ان لوگوں کے نام بتانے لگے جو نگران حکومت کو چلائیں گے۔

ہاتوں ہاتوں میں فاروق لغاری نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ صوبے کے چیف منسٹر کے طور پر کام

کرتے ہیں لیکن شیر ہونے کا لنگی سے انکار کر دیا۔ فاروق لغاری نے اسی رات کھڑے ہو کر
 کانٹوں پر جاتی مقرر کر دیا۔ سرحد کے گورنر جنرل نور محمد نے اسی رات اسماعیلی اور قادیانیوں
 فاروق لغاری نے جلیغیر کی حکومت کو توڑا تھا۔ فاروق لغاری کو ہوا گورنر محمد نے جس کی قیادت میں
 رہی تھی شیر ہوا کی حکومت کی طرف سے اس کے خلاف کیا گیا۔

میں نے شیر ہوا صاحب سے پوچھا کہ وہ پٹنہ پارٹی کے ساتھ قریب تھے۔ پھر آ کر ان کو
 قیس کے ناموں سے پٹنہ پارٹی کا ہونا کراہی پارٹی والی اور آئی ایک نوئی انکلیئر کے زیر سایہ چھپا
 حکومت میں واقعی درجہ پارٹی والی ہیں۔ وہ ساری معروفی انکلیئر ہونا شہادت کے خلاف کرتے رہے
 اور ان کی ایک دہائی سے بعد کو جگہ کر دیا کرتے ہیں۔

شیر ہوا کے پورے ہر ہر لے کا اثرات دیکھ کر مجھے ہونا یا اندازہ ہو گیا کہ جس طرح سے انہیں
 پٹنہ پارٹی چھوڑنی چاہی تھی اس پر انہیں بھی تعجب ہے۔ پارٹی انہوں نے انہیں چھوڑی تھی جلیغیر
 انہوں نے ان کی وفاداری ہر لے کرتے ہوئے انہیں پارٹی سے اس میں کیا تھا۔
 شیر ہوا نے ایک اور کہانی سنا۔

اب فاروق لغاری نے جلیغیر ہونو کی حکومت توڑی تو شیر ہوا کو اچانک محسوس ہوا کہ پارٹی کے
 لیڈروں کا سارا قصداں ہر لے رہا ہے۔ ان تمام لوگوں نے اپنی قویوں کا رخ ان کی طرف کر لیا ہے۔
 انہوں نے انہوں اور سرگرمیوں میں یہ نظر بھری نگاہ ہونے لگی کہ وہ فاروق لغاری کے رشتہ دار ہیں۔ انہیں یہ
 اندازہ ہونے لگا کہ جلیغیر ہونو کی حکومت توڑنے کے فیصلے میں ان کی بھی فاروق لغاری کے لیے
 اثر پڑا تھا۔

شیر ہوا نے سنا ہے کہ انہیں ان کی مرضی کے بغیر پٹنہ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ان کے بیٹے نے لایا
 تھا۔ جلیغیر ہونو چاہتی تھی کہ وہ شیر ہوا پارٹی چلائیں اور وہ پارٹی کے اکثر ایک معاملات کو دیکھیں
 کی۔ وہ شیر ہوا نے ان کے ساتھ ہی ہونو کی رہی پر یہ بات سب پر واضح کر دی کہ وہ اس
 طرف سے جلیغیر ہونو کی۔ شیر ہوا نے بھی پوچھا ہے کہ پٹنہ پارٹی کی ۱۹۸۷ء کے انتخابات میں بہت سی
 شکست پارٹی سے دیکھ کر اسے ہار گیا۔ شیر ہوا پوچھا ہے کہ پارٹی کے اندر ایک ایسی کہ وہ
 ان کے ساتھ ہی رہے اور ان کے لیے ان کے لیے ان کے لیے ان کے لیے ان کے لیے ان کے لیے ان کے لیے ان کے لیے

پارٹی قادیانیوں نے شیر ہوا کو ہار دیا ہے۔

میں نے شیر ہوا سے پوچھا کہ کیا پارٹی کے خلاف اس کے لیے انہوں نے کچھ کیا ہے؟
 انہوں نے کہا کہ پارٹی قادیانیوں نے ان کے خلاف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پارٹی کے لیے انہوں
 ان میں سے کچھ ہیں جنہوں نے ان کے خلاف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پارٹی کے لیے انہوں
 ایک ایسی ہی طرح ہے کہ ان کے خلاف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پارٹی کے لیے انہوں
 انہیں نہیں کہیں گے۔

آقا قادیانیوں نے شیر ہوا کے خلاف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پارٹی کے لیے انہوں
 ایک ایسی ہی نہیں کہیں گے کہ ان کے خلاف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پارٹی کے لیے انہوں
 نے ان کے خلاف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پارٹی کے لیے انہوں نے ان کے خلاف کیا ہے؟
 ہیں وہ سب مل کر پٹنہ پارٹی میں کام کرتے تھے۔ وہ اس طرح سے ان کے خلاف کیا ہے؟
 لیے جلیغیر کو گایاں نہیں دیں گے اور نہ ہی اپنی زندگی کے اس پارٹی میں گزرتے ہیں انہوں کو
 لوگوں کی خاطر غائب کریں گے۔

شیر ہوا نے کہا کہ اگر چاہا تو وہ پٹنہ پارٹی کا حصہ نہیں رہے تھے لیکن وہ بھی اس پارٹی کے
 ان جمہوری اداروں پر اپنا دعویٰ رکھتے ہیں جو پارٹی کو ہونو صاحب اور ان سے ملے تھے۔ ایک ایسی وراثت
 جس کے خلاف کے لیے ان سمیت پٹنہ پارٹی کے سب لیڈروں نے جلیغیر ہونو کی تھی۔ اب کوئی بھی
 ان سے وہ سیاسی ادارہ نہیں چھین سکتا ہے آج وہ پٹنہ پارٹی میں ہیں انہیں۔

شیر ہوا نے کہا کہ یہ وہ پٹنہ پارٹی تھی جس کو کبھی اس کے نظریات کی وجہ سے وہ ملے تھے۔
 اب اس پارٹی کو محسوس ہوا کہ اس کی ایک دوسرے سے جلیغیر ہونو کی وجہ سے وہ ملے تھے۔ وہ پٹنہ
 پارٹی کے امیدوار کو اس لیے وہ ملے تھے ہیں کیونکہ گاؤں میں ان کا خلاف کر رہا ہے پاکستان مسلم لیگ
 کے امیدوار کو بھارت کر رہا ہے۔ پٹنہ پارٹی محسوس گاؤں میں چلنے والی سیاسی اور دینی تنظیموں
 کو محسوس ہے کہ اس کا یہ نظریاتی ادارہ جسے چھاننے کے لیے ہونو صاحب چاہی گئے اور پٹنہ پارٹی
 کے خلاف انہوں نے ان کے خلاف کیا ہے؟ ان کے خلاف کیا ہے؟ ان کے خلاف کیا ہے؟



سلطان محمود قاضی، ڈاکٹر علی بھٹو کے ہمراہ

یہ بڑے بڑے قد آدروں سے بڑا شخص ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے اور میں جیل کے کمرے میں واپس جا کر نئے سرے سے گفتیاں سمجھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ مجھے زرداری صاحب کی یہ بات سن کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا چھوٹا سا آدمی بھلا زرداری صاحب کے لیے کیسے ایک رول ماڈل ہو سکتا ہے۔

میں سمجھا کہ شاید زرداری صاحب نے حسب عادت مجھ سے کوئی مذاق کیا ہے۔ جو کئی زرداری صاحب کا اندر دیکھتا ہوں تو میں نے فوراً ہی بے چینی سے اپنے ایک صحافی دوست سے پوچھا کہ یار یہ کون آدمی ہے؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا کہ آپ اس کو

سلطان محمود قاضی

ایک سیاسی ورکر جو آصف زرداری کے لیے رول ماڈل بنا

جب میں آصف علی زرداری صاحب سے ملنے کے لیے راولپنڈی کی احتساب عدالت میں گریس کی ایک تہی دوپہر میں گیا تھا تو میں نے ایک بات فوراً محسوس کی تھی کہ وہاں ان کے ارد گرد جمعے میں سوچو جو دوست اور پارٹی ورکر بیٹھے تھے ان میں سے اگر وہ کسی کو سب سے زیادہ عزت اور احترام دے رہے تھے وہ بالکل یقیناً ان کا انسان تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر چھوٹے سے قد والے اس انسان میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی کہ زرداری صاحب جیسا شخص بھی نہ صرف ان کی بات فوراً سن رہا تھا بلکہ اس طرح سر ہل رہا تھا جیسے ان کا کہا ہوا ہر لفظ حرف آخر ہو۔ میں زرداری صاحب سے بڑی دیر تک کپ کپ کر ہار ہا لیکن ہار ہار میری نظر اس شخص کی طرف اٹھ جاتی۔ مجھے یہ بہت برا لگ رہا تھا کہ میں زرداری صاحب سے اندر دیکھو تو ان سے یہ پوچھوں کہ یہ شخص کون ہے۔

میں نے اپنے اندر دیکھ کے دوران زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ انہوں نے ساری عمر میاٹی بھری زندگی گزاری تھی، پھر ان کے اندر اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی کہ انہوں نے آٹھ سال جیل میں گزار دیئے۔ زرداری صاحب نے اپنی اگلی اگلی اور اپنے سامنے جمعے میں بیٹھے ہوئے اسی چھوٹے قد والے شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا کہ ہو سکتا ہے یہ شخص تمہیں قد میں بہت چھوٹا لگ رہا ہو لیکن

میں ہائے۔ میں نے براہ راست دیکھا اور کہا کہ حضور اگر میں جاننا چاہتا ہوں آپ سے اس کا کیا حال ہے تو
دو گنا سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

میرے دوست نے کہا کہ اس کا نام سلطان محمود قاضی ہے۔ یہ شخص اپنی سال تک شادی نہ
میں اس وجہ سے گزار کر آ رہا ہے کہ اس پر اصرار تھا کہ اس نے جلال شہید کو بھانپ کر پھانسی دینے کے بعد
کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ وہاں لڑی قتل پارٹی کے جہانوں میں سب سے قند آور پیدا ہوا تھا ہے
جس سے کسی دور میں جلال شہید جیسا اندر بھی مرعوب رہتا تھا۔

مجھے ایک شہید جھٹکا اور میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس تین لٹ کے انسان کو دیکھا۔ مجھے
بہن نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے ارد گرد چلتے پھرتے کچھ ایسے کردار بھی ہیں جن کا ہوسکتا ہے قند تو بہت پہلا
ہو لیکن ان کے اندر چھپا انسان ہم جیسے لوگوں سے شاید قند کا ٹھہ میں کئی گنا بڑا لگتا ہے۔

مجھے آصف زرداری صاحب کے دل میں قاضی سلطان کے لیے موجود عزت اور احترام کی کچھ
ایک لمحے میں آگئی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا، احترام کے ساتھ جھکا اور اپنا ہاتھ قاضی صاحب کی
طرف بڑھایا۔ وہ مجھے پہلے ہی زرداری صاحب کا اندر دیکھ کر تے دیکھ کر کچھ چپکے تھے کہ میں کون ہوں۔ وہ
بڑے احترام سے ملے۔ میں نے ان سے ان کا نمبر لیا اور چپکے سے عدالت کے احاطے سے باہر نکل
آیا۔

قاضی سلطان سے جب ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر 55 برس تھی۔ اب سات برس بعد
جب یہ کتاب لکھی جا رہی ہے تو وہ 62 برس کے ہو چکے ہیں۔ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس سے بڑا
فرائض حسین کیا ہو سکتا ہے کہ میرے گھنے میں آصف زرداری جیسا بندہ اس بات کا اعتراف کرے کہ
قاضی سلطان کو دیکھ کر ان کے اندر قتل کی تمنایں جھیلنے کی بہت پیدا ہوئی تھی۔

قاضی 1949ء میں جب پیدا ہوا تو چھری پھیل کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا۔ سب لوگوں کے لیے
اس کے وجود کے ساتھ گزارہ کرنا ایک مشکل کام لگا۔ لیکن اس کی ماں کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں لگا
کہ اس کے گھر ایک ایسا رشتہ پیدا ہوا ہے جس کا قند ہارل نہیں ہے۔ جب وہ قلموز ایڑا ہوا تو اس کے اپنے
رشتہ دار ہونگی محض کے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ لوگ اس کو دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ ایک دیکھائی
ماں سے گھر میں اٹھائے ہوئے حراموں پر پھرتی، ختمیں مانتی، جی ہوں فقیروں سے تمہارے لپٹا کہ شاید اس

کے بچے کا قند بڑھ جائے۔ قاضی نے بھی سوچا ہوا تھا کہ وہ اپنے گھر کے قند کو اپنی کھن چا منالی میں
دھوپت نہیں دے گا۔ ماں نے سکول بھیجا شروع کیا۔ اب اس نے ملکہ اس کر لیا تو اس نے
پہلے لپٹا کتاب ماں کو سونپ کر کام نہیں کرنے دے گا اور دو تو کری کرے گا۔ سب سے پہلے وہ ایک ہتھیل
کیا۔ میڈیکل سپرینٹنڈنٹ نے اسے دیکھتے ہی ایک خطرہ قہقہہ لگاؤ۔ اب قاضی صاحب نے نوکری کی
درواست کی تو اس نے بڑی نظرت کے ساتھ اسے باہر نکال دیا۔ اس پندرہ سالہ لڑکے پر ایچ این کا
ایک شہید دور و چرا۔ وہ وہاں سے لگا اور ایک اٹالین ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس کا اپنا ایک اونٹ تھا۔
جب وہ اونٹ میں بیٹھا اس غیر ملکی اونٹ کے مالک سے ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو وہاں کا جو پاکستانی ملاف
تھا انہوں نے اس پر پہلے کتنا شروع کر دیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سب کی باتیں سنتا رہا۔ آخر جب
اسے اس اٹالین کے کمرے میں لے جایا گیا تو اس غیر ملکی نے اٹھ کر اس کا احتفال کیا اور آٹے کی وہ
پاچھی۔ اس نے کوئی دوسری بات کیے بغیر قاضی صاحب کو بتایا کہ آج سے وہ اپنے گھر واپس آ رہا ہے
اس اونٹ میں نوکری کرے گا۔

وہ خوش خوش گھر واپس لوٹا لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ اگلی زندگی نے اس کے ساتھ کچھ نہ اچا اور
کرنے تھے۔ ابھی اس کی نوکری کی خوشی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کچھ عرصے بعد وہ اونٹ کی ڈی اسے کے
کنڈول میں آ گیا۔ اس کے پاکستانی بھائیوں نے اس پر ایک سے سرے سے اچھائی گھانا نے مذاق
کرنے شروع کر دیے۔ اس اٹالین نے بڑی سختی سے سب کو منع کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ کوئی
بھونڈا مذاق بھی نہیں کرے گا۔ اس کے جاتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے ہی
پاکستانوں کی باتیں سمجھتا رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ اونٹ کھینچا کی ایک فرم لے لیا اور قاضی
صاحب کو وہاں دو ہی عزت اور مقام مل گیا جو اس اونٹ کے اٹالین مالک کے اور میں ملا تھا۔

ایک دن قاضی صاحب نے چھا کر داد القاضی بھونڈا م کا کوئی شخص ایک نئی سیاسی جماعت بنا
دیا ہے۔ اخبار میں بھونڈا صاحب کی پارٹی کا منشور چھپتے ہوئے ایک جگہ قاضی صاحب کی نظریں رک
گئیں۔ اس میں لکھا تھا کہ بھونڈا صاحب کی نئی جماعت اس معاشرے کے تمام طبقات کو بغیر کسی امتیاز کے
لات دے گی۔ قاضی صاحب کے لیے یہ نئی بات تھی۔ اب تک انہوں نے ہر جگہ اپنا قند چھونڈنے کی
جہ سے امتیازی سلوک کا ہی سامنا کیا تھا۔ اب کوئی ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا ہے جو یہ وعدہ کر رہا ہے کہ وہ

سب کے ساتھ یکساں ملوک کرے گا اور انکی عزت دے گا۔

سب کے ساتھ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ سب کو سچی کر قاضی صاحب نے پہنچا پارٹی کو جہاں کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہ سکیں۔ انہی دنوں بھنو صاحب کے بگھڑ دوست امریکہ سے ملے گئے۔ بھنو صاحب نے اپنے پاکستان آئے اور وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے۔ بھنو صاحب نے خواجہ رشید منیر سے کہا کہ وہ امریکہ سے آنے والے مہمانوں کا خاص خیال رکھیں۔ قاضی صاحب نے ہوٹل کے ملازم ہونے کے ناطے بھنو صاحب کے ان مہمانوں کی بڑی خدمت کی اور وہ پہنچا پارٹی کے لیڈروں کے قریب آ گئے۔ قاضی صاحب بھنو صاحب سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ کسی کو بتائے بغیر وہ ان کی شان میں ایک نظم بھی لکھ چکے تھے۔ کسی نے وہ نظم چاکر بھنو صاحب کو سنائی تو وہ متاثر ہوئے بغیر اندر دے گئے۔ بھنو صاحب نے خواجہ رشید منیر اور نصر اللہ ٹنگ سے کہا کہ وہ اس شخص سے ان کی ملاقات کروائیں جس نے ان پر یہ نظم لکھی ہے۔ بھنو صاحب کے علم میں نہیں تھا کہ جس شخص نے یہ نظم لکھی ہے اس کا قد بالکل تین فٹ تھا۔ ان دنوں نے بھنو صاحب کو مذاقاً کہا کہ اب ان کی پارٹی واقعی "Deep rooted" ہے کیونکہ اب ان کی پارٹی میں ایک ایسا ورکر بھی شامل ہو چکا ہے جس کا قد بالکل تین فٹ ہے!

حضرت علیؓ نے قاضی صاحب کو بتایا کہ بھنو صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ اسی کام کے لیے اسلام آباد آ رہے ہیں۔ باب ہوٹل کے محلے میں یہ خبر پھیلی کہ بھنو صاحب ہوٹل کے ملازم قاضی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو وہ سب ششدر رہ گئے۔ دوسری طرف قاضی صاحب جو ساری عمر لوگوں کے انتہائی گمراہانے مذاق اور ہنسی سے آئے تھے وہ اندر سے خوفزدہ تھے کہ پتہ نہیں بھنو صاحب انہیں دیکھ کر کیا رد عمل ظاہر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ بھنو صاحب انہیں دیکھ کر شدید مایوس ہوں اور اپنے سامنے تین فٹ قد کے نو جوان کو دیکھ کر ان کے سر سے بے ساختہ ہنسی نکل جائے۔ قاضی صاحب سوچتے رہے کہ ان کے لیے وہاں کھانا اور دیرداشت کرنا ممکن ہو جائے گا اگر بھنو صاحب جیسے خوبصورت شخصیت کے مالک نے ان کا دوسروں کے سامنے صرف اس وجہ سے مذاق اڑایا کہ ان کا قد چھوٹا ہے۔ قاضی صاحب انہی دوسروں اور اندامیوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ بھنو صاحب ہوٹل پہنچ چکے ہیں اور اپنے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ہانگوں کے ساتھ قاضی صاحب

بہنو صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے جن کے ساتھ مصطفیٰ کمر اور غور شید من میر بھی بیٹھے تھے۔
 بہنو صاحب قاضی صاحب کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ مصطفیٰ کمر اور غور شید من میر بھی بہنو صاحب
 کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ بہنو صاحب پانچ قدم آگے بڑھے، قاضی صاحب سے جھک کر ہاتھ ملا لیا اور
 بتایا کہ وہ ان سے اپنی طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ جب وہ کمرے میں سویرہ و سونوں پر پہنچ گئے اور ماحول
 دیر سے دیر سے بھر ہوا تو قاضی صاحب نے بہنو صاحب کو یہ بات بتائی کہ وہ ان سے ملنے سے
 کیوں غور فرماتے تھے۔ بہنو صاحب کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا اور قصور سے قصے کے ساتھ
 بولے کہ آپ نے بھلا یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ میں آپ پر اس وجہ سے غمگین ہوں کہ شروع کر دوں گا
 کہ آپ کا قہر چھوٹا ہے۔ بہنو صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ آج کے بعد کبھی بھی یہ نہیں سوچنا کہ
 میرے پیارے بندہ صرف اس وجہ سے لوگوں پر جھلے کہے گا کہ ان کے قہر چھوٹے پائے ہیں۔

جب سلطان محمود قاضی صاحب میرے سامنے بیٹھے آج سے پچیس سال پہلے کے اس واقعے کو یاد کر رہے تھے کہ کس طرح بھٹو صاحب نے انہیں بے جا عزت اور احترام دیا تو میں محسوس کر سکتا تھا کہ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس کی زندگی میں اس سے بڑا لمحہ کبھی نہیں آ سکتا تھا اور ورکر بھی خصوصاً ایسا جس نے ساری عمر اس معاشرے میں پھیلے اپنے جیسے انسانوں کی جگہوں اور غلطی جملوں کا سامنا کیا ہو انہیں اس وجہ سے کہ قدرت نے اسے صرف تین فٹ کا پیدا کیا تھا۔

باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے بھنو صاحب کو بتایا کہ چونکہ وہ اس ہوٹل میں ان کے مہمان ہے لہذا ان کے سارے اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ بھنو صاحب قاضی صاحب کی یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور بڑی شائستگی سے ان کا شکریہ ادا کر کے انھیں مل رہنے سے منع کیا۔

بھنو صاحب ان سے ملنے کے بعد کراچی چلے گئے۔ چند نہیں اس ملاقات کا ان پر کیا اثر ہوا تھا کہ بھنو صاحب نے کراچی سے قاضی صاحب کو شکریے کا ایک خط بھیجا۔

ایں اثناء میں وہ وہیں جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے وہ ایک پاکستانی چوہدری نواز احمد کو
بلا کر دیا گیا جنہیں کچھ عرصہ قبل جزیل کیجی خان نے کرناٹن چارجر پراسس کر دیا تھا۔ قاضی صاحب
نے انہیں ایک سیڑی پر کرہاگ چکا تھا۔ انہوں نے اظہار میں ایک بیان دے کر وہیں میں جینے جانے کا
فیصلہ کیا۔ تب یہ خبر چوہدری نواز احمد نے جج می تو و آگ کو دے دی تھی اور انہوں نے فوری طور پر قاضی

صاحب کو سروس سے اس میں کر دیا۔ جب یہ خبر کسی طرح بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے غور شدہ میر اور مصطفیٰ کھر سے کہا کہ وہ طوری طور پر چوہدری نیاز سے بات کر کے قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرانے۔

چوہدری نیاز احمد تک بھٹو صاحب کا یہ پیغام پہنچا یا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد بھٹو صاحب اسلام آباد آئے اور انہوں نے مصطفیٰ کھر اور غور شدہ میر کی موجودگی میں چوہدری نیاز احمد سے فون پر درخواست کی کہ وہ قاضی صاحب کی نوکری بحال کر دیں کیونکہ وہ انہیں بہت عزیز ہیں۔ جب چوہدری نیاز احمد نے بھٹو صاحب کی درخواست سنی تو وہ بولے کہ قاضی صاحب نے ان کے خلاف ایک انتہائی جان جہاز کیا ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے چوہدری نیاز احمد سے یہ کہا کہ وہ قاضی صاحب کے بیان کی وجہ سے انہیں پکچھے والی رحمت پر معذرت خواہ ہیں۔

تاہم پچھتائیں چوہدری نیاز کے ذہن میں کیا بات سمائی ہوئی تھی کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی درخواست اور معذرت کو مسترد کر دیا اور قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے سے انکار کر دیا۔

چوہدری نیاز احمد کا انکار سن کر بھٹو صاحب بڑے غصے سے بولے:

"ٹھیک ہے مگر نیاز صاحب میں نے آپ سے کوئی اتنی بڑی چیز نہیں مانگ لی تھی کہ

میرے سوری کرنے کے باوجود بھی آپ قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے پر تیار

نہیں ہوئے۔ میں وہ صیغہ انکار کر لیتا ہوں مگر آپ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

فون بند کر کے بھٹو صاحب قاضی صاحب کی طرف مڑے اور بولے کہ آپ صرف وہ صیغہ

انکار کریں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

قاضی صاحب نے مسکرا کر بھٹو صاحب سے کہا کہ سراسر اس ملک میں نئے انقلاب کے لیے

سب کچھ جتنی کوشاں ہوں۔

ٹھیک وہ صیغہ بعد بھٹو صاحب اس ملک کے صدر بن گئے۔ صدر بننے ہی بھٹو صاحب نے اپنی

فون اٹھایا اور پہلا غم گئی جہاز کیا کہ قاضی صاحب کو نوکری دی جائے۔

پچھتائیں بھٹو صاحب کے ذہن میں کیا آیا کہ اس باوجود اس ملک ایک دن بھٹو صاحب نے کسی

سے کہا کہ چوہدری نیاز احمد ابھی بھی اس میں کھلا رہا ہے جہاں سے قاضی صاحب کو بحال کر دیا گیا

ن۔ بھٹو صاحب نے فوراً رد کر کے کہ چوہدری نیاز کو نوکری کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے۔

قاضی صاحب کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسے لیڈر نے ان کی نوکری کی خاطر

ہوئی کے مالک سے سوری کیا، صدر بننے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انہیں نوکری دی اور جس شخص نے انہیں

نوکری سے نکالا تھا اسے ہوئی کی انتظامیہ سے نکال دیا۔ قاضی صاحب اب اس جھگڑا پارٹی میں شامل ہو

چکے تھے جو بھٹو صاحب کی پارٹی تھی۔ جب تک بھٹو صاحب اقتدار میں رہے قاضی محمود سیدھا ست جہاز

دار اور اپنی پارٹی کے پارٹی صدر رہے۔ جب بھی پارٹی کی میٹنگ ہوتی بھٹو صاحب انہیں بے پناہ عزت

دیتے جس سے ان کا اپنی پارٹی میں مقام بہت بلند ہو گیا۔ بھٹو صاحب اس وجہ سے بھی قاضی صاحب

کے لیے احترام کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ پارٹی کا کوئی دوسرا لیڈر یا اور کراں کی کبھی تو جین نہ کرے اور نہ

ان پر کوئی حملہ کرے۔

اسی اثناء میں وہ ہوئی مستقل طور پر بند ہو گیا اور قاضی صاحب ایک مرتبہ پھر سوک پر آ گئے۔ کسی

نے یہ بات بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچائی کہ ان کا پسندیدہ پارٹی ورکر پھر جہاز دار ہو گیا ہے۔ بھٹو

صاحب نے فون اٹھایا اور انہیں PTDC ہونٹل کا اپنی خبر مقرر کرنے کے آرڈر کر دیے۔

سلطان محمود قاضی ایک صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ وہ لیڈر جس نے انہیں عزت اور نوکری دی تھی اس

کی حکومت پر ایک فوجی جنرل نے قبضہ کر لیا ہے اور وہ اس وقت گرفتار ہیں۔ قاضی صاحب کے لیے

وقت آ گیا تھا کہ وہ اس شخص کے لیے اپنی وقاداری کا ثبوت دے جس نے اس کی نوکری کی خاطر ہوئی

کے مالک سے سوری تک کر لیا تھا۔ قاضی صاحب نے سارے کام چھوڑ دیے اور پارٹی کے ورکروں کو

منظم کرنا شروع ہو گئے۔ گرفتاریوں سے بچانے کے لیے قاضی صاحب نے جھگڑا پارٹی کے ورکروں کو

اپنے گھروں میں چھپانا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے انہوں نے مظاہرے کرائے کا

انتظام کیا۔ اپنے گھر کا روٹی پانی پھانے کے لیے وہ نوکری کے ساتھ ساتھ ان سیاسی ورکروں کو بھی اکٹھا

کرنے میں لگے ہوئے تھے جو ان دنوں ملک میں مارشل لا لگنے کی وجہ سے بدمذہب ہو گئے تھے۔

ایک دن قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ جھگڑا پارٹی کے رہا لیڈر کے صدر نے ہاتھ کھڑے کر

لیے ہیں اور وہ جنرل لطیف کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پارٹی ورکروں نے اسے

گھنہ پارٹی اور انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ پارٹی کے رہا لیڈر کے جھگڑا پارٹی کے جنرل

کی گری پر اصرار تھا جس نے انہیں نو ماہ کی قید یا شقت ملادی۔ قید کے علاوہ انہیں تین ہزار روپے جرمانہ بھی لگا گیا۔

بھرنے سزا سن کر مگر یہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے تین فٹ کے سپاہی وہ کرکھیا۔ اس کے اندر کاروائی جگت باز تھوڑی دیر کے لیے ہار لگا اور بولا کہ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے کہ تم جیل کیسے کاٹو گے۔

قاضی صاحب نے آگے سے مسکرا کر جواب دیا کہ بھیر صاحب آپ پریشان نہ ہوں۔ میں انفرادی اور دیگر کی طرح جیل میں آٹھ گھنٹے بہاؤں گا۔ میں بڑی عزت اور شان سے اپنے جیل کے دن گزار کر جیل بھاری سے دوبارہ ملنے کے لیے واپس راولپنڈی کی سڑکوں پر آؤں گا۔

قاضی صاحب کا دل ابھی غصہ نہیں ہوا تھا۔ بھیر کے کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ مڑے اور بولے۔

”بھیر صاحب آپ لوگوں کا کام اس ملک کی سرحدوں اور اس کی عوام کی حفاظت کرنا ہے۔ آپ کیسے لوگ ہیں۔ آپ نے ایک ایسے شخص کو پھانسی لگا دی جو آپ کے بڑے رفیقی بھارتی جیلوں سے واپس لے آیا تھا۔“

بھیر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا اس نے حکم دیا کہ اس تین فٹ کے جرم کو بیاٹوولی جیل بھیج دیا جائے۔

قاضی صاحب جیل میں روئے اور وہی وہاں باقی کیا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ جب وہ بڑی بہادری سے نو ماہ بعد جیل کاٹ کر رہا ہوئے تو پارٹی کے ورکروں نے انہیں کدھوں پر اٹھا لیا۔ وہ اب ان کے لیے حراست کا نیا انتظام بن کر ابھرے تھے۔ پارٹی کے ورکر یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک تین فٹ کا انسان اتنی بہادری اور صبر کا مظاہرہ کرے گا۔

قاضی صاحب مارشل لا حکومت کے لیے ایک مستقل دوسرے بن چکے تھے۔ ہائی پائمنٹ تو گوارا نہیں۔ مارشل لا دہائی کے طرز پر جیل کے اندر مارشل لا کے نی ٹی ای سی کی انتظامیہ پیدا کر دی۔ کدو قاضی صاحب ان محمود کوڈ گری سے نکال دیے۔ (یہ وہی جیل ہیں جنہوں نے کتاب Working

with Zia لکھی ہے۔)

قاضی صاحب اب ان ہاتھوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اب ان کے لیے زندگی کا مقصد سرکاری نوکری کرنا نہیں بلکہ اس بہنو کی پارٹی کے لیے کام کرنا تھا جس نے نہ صرف انہیں زندگی میں پہلی دفعہ عزت دی تھی بلکہ انہیں نوکری پر بحال کرانے کے لیے ہونٹ کے خیر سے سواری تک کیا تھا۔

قاضی صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ ابھی بہنو صاحب کے عشق میں انہوں نے کچھ مزے امتحان بھی پاس کر لئے تھے۔ 3 مارچ 1981ء کو جو جی پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کی خبر پھیلی تو سب سے پہلے قاضی صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی جیل سے انہیں گوجرانوالہ جیل بھیج دیا گیا۔ 8 اپریل کو انہیں آخر شاہی قلعے لاہور بھیج دیا گیا۔ جب قاضی سلطان شاہی قلعہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہاں لیٹل مارلج حیات، جہاں گھیر بدو، شفقت محمود اور دیگر پارٹی لیڈر ان پہلے سے ہی وہاں قید تھے۔ ان دنوں شاہی قلعہ میٹروپولیٹن پارٹی کے ورکروں کے لیے ایک خوف اور وحشت کی علامت بن چکا تھا لیکن قاضی صاحب پھر بھی تین ماہ تک وہاں رہے۔

جب قاضی صاحب جیل سے واپس آئے تو انہیں ایک دفعہ پھر 27 دسمبر 1981ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب کی دفعہ ان پر ایک پولیس کانسٹیبل کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ شاید کسی کو کوئی تھوڑی سی شرم آگئی تھی کہ پہلا تین فٹ کا ایک انسان چھ فٹ کے کانسٹیبل کو کیسے قتل کر سکتا تھا لہذا اسے ایک ہفتے بعد رہا کر دیا گیا۔

قاضی صاحب جیل سے آئے تو انہوں نے دوبارہ سپاہی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ 28 مارچ 1982ء کو انہیں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ راولپنڈی سے انہیں لاہور لے جایا گیا۔ کچھ دن انہیں ہی آئی اے کے چھ ماہ کی منفر میں رکھا گیا۔ وہاں سے انہیں ایک دفعہ پھر شاہی قلعے بھیج دیا گیا۔ مارشل لا حکومت کا دل اس سے بھی نہیں بھرا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو لال قلعہ بھیج دیا جہاں بھارتی مارشل لا سے گنتیل کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کو وہاں ایک 4x7 فٹ کے ایک کمرے میں لٹکایا گیا۔ دو چار دن تک اس کمرے میں قید اور حالات بدداشت کرتے رہے۔ لال قلعہ سے نکال کر انہیں دوبارہ شاہی قلعے لایا گیا اور آخر میں انہیں کوٹ گھٹ جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں سب سے آخر تک قید ہونے کی خبر سوت میں ڈال دیا گیا۔ وہاں جہاں انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں

عقبت ابدیہ ہوا کہ اس کی مثال نہ تو آج بھی۔

ایک کی انیس تیار کیا گئی تھیں انہیں خیل کے اندر ہی ایک نئی عمارت میں رکھ دی گئی تھی۔
 ہر ایک ایک ہونٹ پر ایک بھر صاحب کر رہے تھے۔ ان میں صاحب کے خلاف چار ہی تھے جو
 علی گڑھ چھ چار ایک کی دفعہ ہی ہر روز ملے ہوتے تھے انہیں کے ساتھ ہی ایک اور شخص بھی
 ملا تھا جو کہ ان کے ساتھ تھا۔

ایک جاس ہاند کا قرضی صاحب نے عدالت سے پوچھا کہ تمہیں نے جنرل غنیہ کو قتل کر کے
پوشاک کی قرضی ۴۱ لاکھ دیا کیا کہ وہ یہ کام ۱۹۶۸ء میں کرتا پایا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی طرف سے سجر صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جناب ابو حزر ضیاء
کو 1968ء میں کیے قتل کرنے کا ہوا گرام ہا سکتے تھے جب حزر ضیاء کو جانا بھی کوئی نہیں تو ہر
سے جدا کر اس وقت حزر ضیاء کو قتل کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

مبھڑ صاحب نے شرمندہ ہونے کے بجائے انا قاضی صاحب کو یہ کہہ کر لا جواب کر دیا کہ شاید
فحش ہے مجھ سے چڑھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو اور یہ سال 1968ء نہیں بلکہ 1978ء ہو گا۔ اپنی سخت
مٹانے کے لیے مبھڑ صاحب بولے کہ ہائی وائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر تم نے جہزلیا کو قتل
کرنے کی سازش 1968ء میں کی تھی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم نے جہزلیا کو قتل کرنے کی سازش چار
کی قبیح قبیح کی تھیں۔ مولا احمد علی ہے۔

یہ کہہ کر بھگوان نے انہیں تین سال کی سزا کا حکم سنایا۔ وہیں سے انہیں سیدھا مکان چل
گیا دیا گیا۔ تین سال بعد 1985ء کو انہیں کل سزا کے پانچ سال چل سکتے کے بعد انہیں چل
سے رہا کر دیا گیا۔ (اس سزا کی ازدانی سال کا وہی یہ بھی مثال ہے جو وہ اس تین سال کی سزا سے
پہلے انہیں پانچ سال میں رہا کر دیا تھا۔)

فوجی صاحب پانی سال بھل گئے کے جواب ایک فتوہ اور یہی وہ کہہ چکے تھے جو
اب کی حالت میں کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فتوہ کہہ کر ان لوگوں میں سے
جو کہیں سے آئے تھے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے "This is a larger man than I"۔

فہم حکم ہے ہمارا ہے کہ اولیٰ خدا اور معرفت اللہ پر ایمان سے پہلے ہم کو

Handwritten text in Urdu script, likely a continuation of the letter or a separate note.

[illegible]

قاضی صاحب پر لاہور کے چلے میں پھول چھینک کر بھی مینڈیکر ہٹو کی علی نہیں ہوئی۔ جب آٹھ دن بعد 18 اپریل کو راولپنڈی میں پارٹی کا جلسہ ہوا تو پارٹی کے 77 سے لے لیکڑوں کی حالت کے بارے میں مینڈیکر ہٹو نے کہا کہ قاضی صاحب ہی اس جلسے کے سچے بیکر ٹری ہوں گے۔ مینڈیکر ہٹو نے خود ذاتی طور پر قاضی صاحب سے کہا کہ آج انہوں نے جس جلسے سے خطاب کرنا ہے وہ اس کے سچے بیکر ٹری کے فرائض سرانجام دیں گے۔

قاضی صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ نظیر جٹو نے اٹھ کر قاضی صاحب میرے
پہلے آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ آپ سے بہت دُور کرتے تھے اور آپ میرے گئے ہائیڈرو کی
طرز تھیں۔

دانش مراد سے کچھ نہ آیا اور وہ جس طرف اشارہ کیا آپ نے کیا کیا آپ نے کیا کیا
چونکہ غرض اس کی کھڑکی کی جیسے پرستش کریں کہ اس کے لئے قتل ہے۔

جب تک کہ میں نے یہ لکھا ہے تو وہاں پہ جہاں کہ کروں گا کہ میں یہ لکھا ہے کہ میں نے
 لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے
 لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے
 لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے

جستہ رہا تھا۔ اس وقت یہ قذافی اور لیڈر اپنے گھروں کے درانگہ روم میں بیٹھے چٹک مٹا رہے تھے۔
 ہذا بات سے بھری ہانپتیر بھنوبھتی رہی کہ کوئی بھی شادی بکھے نہیں کیا جیکہ قاضی صاحب وہاں
 چہ ماہنگہ نکلیں جھکتے رہے۔ پارٹی کے لیے اس سے بڑی اور گولی قربانی نہیں ہو سکتی۔
 میں نے محسوس کیا کہ قاضی صاحب مجھے یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے خود بھی ان لمحوں میں بہم
 گئے تھے وہب ہانپتیر بھنوبھنے اس عین وقت کے سیاسی ورکر کو اپنی پارٹی کے قذافی اور لیڈروں سے ہمیں وہاں
 لپکا کر اور سب کا قاضی صاحب نے تاؤک ہانپتیر بھنوبھنے کیوں عزت اور احترام دیتے تھے اور پارٹی
 کے معاملات میں ان کی بات نہ لے کر سے نکلتے۔ یہی وجہ تھی وہب 2003ء کے انتخابات میں انہوں
 میں ہونے والی ایک پارٹی مینالک میں پارٹی کے امیدواروں کو انگلیوں دینے کا فیصلہ ہوا تھا تو ہانپتیر ہاں
 نے ہر اس وقت وہی نہیں تھے اور اعلیٰ فہم ہر اس مینالک میں شریک تھیں اس وقت تک آخری لپکا کر
 سے انکار کیا وہب تک انہیں نہیں لگا دیا گیا کہ قاضی سلطان صاحب بھی اس مینالک میں شریک ہیں۔
 ہانپتیر بھنوبھنے قاضی صاحب سے چہ چھا کہ وہ انہیں پارٹی کے نام پر امیدواروں کی سیاسی فہم کے بارے
 میں اپنی رائے دینا۔ وہب قاضی صاحب نے اپنی رائے دی تو ہانپتیر بھنوبھنے اس رائے کا احترام کیا۔
 اس سے قبل وہب 1988ء میں ہانپتیر بھنوبھنے کی دلدہ برسر اقتدار آئیں تو پارٹی نے اپنے ورکروں
 کو سب سے زیادہ دی اور پارٹی کے معاملات پر بھی ان کی بات کو اہمیت دی جاتی۔ یہی وجہ تھی وہب
 1988ء میں ہانپتیر بھنوبھنے کے خلاف قومی اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی تو پارٹی کے ورکروں نے
 اپنی حکومت کے حق میں ایک بہت بڑا اجلاس لکھا۔ وہب 1990ء میں علامہ اعلیٰ خان نے ہانپتیر بھنوبھنے
 حکومت کو برطرف کیا تو پارٹی کے ورکر سڑکوں پر نکل آئے۔ قاضی صاحب کو اس بات کا گذر تھا کہ وہب
 دوسری دلدہ ہانپتیر بھنوبھنے اقتدار میں آئیں تو پارٹی لیڈر بہت بدل چکے تھے۔ سیاسی ورکروں کو کوئی
 اہمیت نہیں دی گئی۔ لیڈروں اور ورکروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ قاضی صاحب کو محسوس ہوا کہ
 اس پارٹی کے ورکر اور لیڈروں کو نہیں سمجھ گئے تھے۔ پارٹی قیادت نے اپنی لائن بدل لی تھی۔ ان لوگوں
 کو زیادہ اہمیت ملنے لگی جنہیں بھنوبھنے صاحب کے کار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مجلس اپنی جھٹکیں بھر رہے
 تھے۔ قذافی قذافی سکول آف قضاات پارٹی میں امیر لوگوں کو شامل کرنے پر کام کر رہا تھا۔ یہ وہی مجلس
 تھی جنہوں نے پارٹی کے ورکروں کی حوصلہ شکنی کی اور وہ یہ بھول گئے کہ پارٹی کے ورکر ہی اس کی اصل

حالت تھی۔ یہی وجہ تھی وہب 5 نومبر 1996ء کو قذافی قذافی نے ہانپتیر حکومت کو اس میں کیا تو پارٹی
 سے قضاات خورہ اور مایوس کارکن دی سڑکوں پر احتجاج کرنے آئے اور دی دلدہ آئے کے لیے
 پارٹی جھٹکیں بھر گئے۔
 وہب پارٹی کے دوسرے مایوس کارکنوں کے ہمسایہ قاضی صاحب اپنی پارٹی کے باوجود صاحب
 اور چہ منزل ضابطہ کار کے کرکٹ میں سرچھے تھے لیکن قاضی صاحب کے لیے قضاات بھنوبھنے قذافی
 دلدہ اور شریف کی حکومت کے خلاف کارروائی کرنے پر قاضی صاحب کا ایک اہم فیصلہ نکلا گیا۔
 وہب قاضی صاحب نے مجھے لگا دیا کہ انہوں نے قذافی قذافی کی حکومت میں شامل ہوا کہ وہی
 نہیں کر رہے تھے اور سیاسی قضااتوں کی قضاات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سیاسی قضاات میں ایک سیاسی ورکر کو
 کی طرح تربیت کرتی ہیں جبکہ سیاسی ورکر کو قضااتوں میں ایک قضاات کی طرح تربیت کرتے ہیں۔
 میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ ہانپتیر بھنوبھنے کے دوسرے دور حکومت میں ان سے انکی کیا
 تعلیم ہو گئی تھی اس سے وہ ایک دلدہ بھنوبھنے کے ہاتھوں اس میں ہوا کہ نہیں ملے گی۔
 قاضی صاحب نے اسے کہہ دیا اصل ہانپتیر بھنوبھنے دوسری دلدہ پارٹی کے ورکروں سے دو تعلق
 رکھنے میں کامیاب ہیں ہر انہوں نے ماضی میں ان کے ساتھ رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہب قضاات قضاات
 کیا گیا تو ہانپتیر بھنوبھنے کی جدت کے لیے سڑکوں پر کوئی نہیں آیا کیونکہ لیڈروں اور پارٹی ورکروں کے
 درمیان دور رابطہ قائم ہو چکا تھا ہر ایک مایوس ہوا ہے تھا۔ وہ قاضی تھی کہ اس وقت تک کسی کو اس بات کا
 احساس نہیں تھا۔
 وہب نواز شریف دوسری دلدہ اقتدار میں آئے تو ان پر دو قبائلی اکثریت کا اثر چڑھا ہوا تھا۔
 قاضی سلطان محمود پر نواز شریف حکومت میں بہت سارے مقدمے درج کر کے انہیں قلیل بھیج دیا گیا۔
 وہب قاضی صاحب ہر الائی 2003ء میں میرے ساتھ بیٹھے اپنے بارے سیاسی ماضی کو نکال رہے تھے تو
 اس وقت بھی وہ راولپنڈی، کوہستان، کوٹلی، سوات، اسلام آباد، پشاور، وادی، کوہستان، انگ اور دیگر شہروں
 میں ہانپتیر پارٹی کے لیے سیاسی رہنمائی کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھے۔
 نواز شریف کے بعد جنرل مشرف اقتدار میں آئے اور لیگل فریم ورک آرڈر کے خلاف ایک
 مظاہر سے کاہنہ راستہ کرنے پر قاضی صاحب کے نام ایک دلدہ بھنوبھنے چہ درج کر دیا گیا۔

میں نے اپنی سب سے بڑی بات کو ان کے لیے لکھا ہے کہ ان کی قوم سے کیا کیا ہوگا
ان کے لیے جو ان کے لیے ہے۔

[illegible]

قاضی صاحب کا خیال تھا کہ اب یہ بغیر بھٹوس طرح کے لوگوں کو دوبارہ پارٹی میں شمولیت دینا چاہیے۔
میں نے کہا کہ قاضی صاحب! مجھے یہ بتائیں آپ کو سہولت پارٹی کے لیے پانچ سال تک میں
میں کچھ کرنے سے کیا ہے۔

میرا سوال ہی کہ قاضی صاحب کے چہرے پر ایک غریب مسکراہٹ چھلک اُٹھی اور وہ نے کہ
ایک یہ تو کہہ کر تھے اور یہ تو کہہ کر بغیر کسی لاشا کے پادری کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ ایک اور کہہ نے
کہ اے لوگوں! کیا تم سب ہی پوجتے تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا اس پر انہیں کوئی عیب نہ لگا تھا
بلکہ وہ اپنے آپ پر فخر کرتے ہیں۔

[illegible]

تم نے کہا کہ کاغذی احباب اس وقت تک کہ وہ اس کے لئے ۱۸۸۸ء

جو کہ ان کے ساتھ تھے ان کے ساتھ تھے ان کے ساتھ تھے
ان کے ساتھ تھے ان کے ساتھ تھے ان کے ساتھ تھے

وہ بھی صاحب نے جو بیخبر ہوسا جب کہ ان کا کیا اور جو سے کہ وہ ایک ہزار لڑنے تھیں اور انہوں
نے ان کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ یعنی قرآن پڑھا اور ملک میں مصروفیت اور لوگوں کے
لیے بہت کچھ کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ میں بھی گئی تھیں۔

اب جبکہ یہ تغیر ہوتا جاؤا تو انکی مشقیں اور فاضلی صاحب اس بات پر اس قدر خوش تھے کہ انکی ہر
موج کی مشق پادائی کے لئے لیا۔ خصوصاً آصف علی زوردار کی تے انکی ہر حرکت اور پیادہ
قد اور وہی صاحب نے ایک دن فاضلی صاحب سے کہا کہ جب ان کا زمانہ اوروں کی مشقیں میں آئے گا
تو ان کے ساتھ کام کریں گے کیونکہ یہ پہلے پادائی کے ان پر چڑھ رہے تھے اور کہ ان میں سے ایک ہیں
جنہوں نے زوردار علی بھٹو سے لے کر حضرت بھٹو، یوسف علی بھٹو، اب آصف علی زوردار کی کے ساتھ پادائی
کے لئے کام کیا تھا اس لئے وہ چاہیں گے کہ بھٹو سے ملا لیں تاکہ وہ پادائی کے لئے کام کرتے ہیں۔

قاضی صاحب نے کہا کہ انہوں نے ساری عمر یہ کوشش کی تھی کہ وہ زندگی بسر کوئی ایسا کام نہ
 کری جس سے لوگوں کو ان کا مذاق اڑانے کا موقع ملے۔ یہ زندگی جیسی کا طریق ہے کہ انہوں نے
 لوگوں کے ان کے قدر پر غور کیا۔ عمر وہ بچتیں اور عقیدہ حقیت کی اگر اگر ان سے۔ شہید کی جدت کی کہ انہوں
 نے عمر بھر ساری زندگی کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک نادر انسان بنیں۔ ان کو ملتا ہے تھے کہ ان
 کی وجہ سے ایک عورت ساری عمر یہ طریقہ سالی کی زندگی گزارے اور ان کے ساتھ چلے رہے لوگوں کے
 طریقہ جس کی کہ وہ اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کرے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ ان کی اس بات کا مقصد ہے
 کہ انہیں نے بھی ان سے کچھ الگ قدر کی اور سے غور کیا کہ یہ قدر ان سے ان کی صاحب الکتاب کہ ہے۔

چوتھی صواب سے کی گئی تھی۔ یہ شہادت اب تمام دوسرے علماء کی ہر ایک رائے کا چوتھی
 صواب کی باتوں سے غلط ہے۔ اگر شہادت تھی ۱۱۰۰ مسکنوں کے ساتھ جو وہاں تھے تو ان کی تعداد
 ان کے مسکنوں سے دو گنی ہو گئی۔ یہ آراء کا وہ نہیں ہیں ایک طرف ان کے ساتھ ۱۱۰۰ مسکن
 ان تمام ان کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ صواب کے ساتھ وہ ان کی رائے کے ساتھ وہ
 ان کے ساتھ ۱۱۰۰ مسکنوں کے ساتھ ان کے ساتھ ۱۱۰۰ مسکنوں کے ساتھ

قاضی صاحب ایک مطمئن انسان ہیں۔ وہ اپنے بھتیجیوں اور خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگ اب ان کی بی بی عزت کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر برا بھلا کہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے رہ کر ہیں اور سب سے بڑھ کر ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر نصرت بھٹی جیجیجی بھٹو زرداری صاحب تک سب لوگ ان کی عزت کرتے رہے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ اب وہ آنے والے دنوں میں اپنے کیا سیاسی مستقبل دیکھ رہے ہیں تو وہ نے کہ میری زندگی کی خواہش ہے کہ میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پیپلز ہوں۔ 2003 کے مارچ میں ہونے والے انتخابات میں زرداری صاحب نے کوشش کی تھی کہ مجھے پارٹی کا ٹکٹ مل جائے لیکن پنجاب میں جسٹس کم ہونے کی وجہ سے میرا نام ہار اپ کر دیا گیا تھا۔

زرداری صاحب واقعی یاروں کے یار ہیں۔ وہ 2003ء میں قاضی سلطان محمود کو پنجاب سے جیل کا ٹکٹ تو نہ دوا سکے لیکن پیپلز بھٹو کے قتل کے بعد جب 2008ء میں وہ پارٹی کے کوچیز میں بنے تو انہوں نے اپنے پہلے چند کاموں میں سے جو ایک کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے قاضی سلطان محمود کو پیپلز پارٹی کی سکرل ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر بنا دیا جہاں یوسف رضا گیلانی، مخدوم امین فقیر، راجہ پرواز اشرف، منور مہاسی، رحمان ملک، نواب یوسف تالپور، قائم علی شاہ، شاہ محمود قریشی، احمد مختار، ریشمی، غور شید شاہ جیسے لوگ بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے آصف زرداری نے بھٹو کے اس سیاسی ورکر کو جس کو جیل بھیجا، کو قتل کرنے کی سازش کے جرم میں پانچ سال سزا دی گئی تھی، وہ عزت دی ہے جو انہیں شاہ پیپلز بن کر بھی ملتی۔

جنرل محمد امجد

ماہ 2003ء کی بات ہے کہ میں اور انگریزی اخبار ڈان کے زبردست رپورٹر ارشد شریف جو آج کل ڈان کے انگریزی مجلے ڈان نیوز کے اسلام آباد میں بیورو چیف ہیں، اسٹیل قومی اسمبلی کا وفد سوالات کرتے تھے۔ ارشد شریف بہت ہی ٹیلنٹڈ صحافی ہیں۔ وہ ان صحافیوں میں سے ہیں جن کی میں بے پناہ عزت کرتا ہوں۔

ایک دن میں وفد سوالات سے ڈرائیٹ ہوا تو میں نے ارشد شریف کو قومی اسمبلی کی لابی میں تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے پیچھے دوڑا تو پتہ چلا کہ موصوف اس وقت وزارت دفاع کے پارلیمانی سیکرٹری میجر جنرل حسین (گھوکار) روٹو سید کے بھائی کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ میرے پیچھے پر ارشد بتانے لگے کہ دراصل تھوڑی دیر پہلے ایک سوال کے جواب میں میجر صاحب نے قومی اسمبلی کو بتایا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کی ایک شوگر مل کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیاں ہونے پر تحقیقات جاری ہیں۔

میں حیران ہوا کہ اس طرح کی خرید و فروخت اور اس میں بے ضابطگیاں بی بی عام سی بات ہے۔ ارشد نے میری طرف دیکھا اور کہا جناب عالی ایہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ فوجی فاؤنڈیشن کا ایم۔ ڈی کون ہے۔ میں نے اطمینان کا اظہار کیا تو ارشد شریف بولے کہ حضور اس لیے آپ

اس خبر کی اہمیت نہیں سمجھ رہے۔ جنرل محمد امجد اس فوجی قاذوڈیشن کے چیئر مین ہیں جن پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس کی فروخت میں خاصی بے ضابطہ کاریاں ہوئی ہیں۔

میرے ذہن میں فوری طور پر جنرل امجد کا نام ٹھک نہیں ہوا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جناب یہ وہی مہسوف ہیں جو پہلے سب کے چیئر مین تھے اور جنہوں نے احتساب کے نام پر 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جرمی ان کے ہاتھ چڑھا انہوں نے اسے اٹھالیا۔ گرفتاری پہلے کی تھی اور الزامات بعد میں عائد کیے گئے۔

میں چونکہ چارہ میں نے ارشد سے کہا استاد یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔

خیر، سبکدوش سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں نے بیٹھ کر وہ خبر بتائی۔ اس خبر کی مختصر تصدیقات کچھ یوں تھیں کہ سندھ میں فوجی قاذوڈیشن کی ایک اپنی شوگر مل تھی۔ جنرل امجد اس کے ایم۔ای بے تو اسے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ دو تین پارٹیوں سے بات چیت ہوئی۔ ایک پارٹی نے 37 کروڑ روپے پیش کرنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ دوسری پارٹی نے اس کی بولی تیس کروڑ روپے لگائی۔ فوجی قاذوڈیشن نے دو شوگر مل تیس کروڑ روپے والے کے ہاتھ بیچ دی۔ اس خوش قسمت انسان نے دو تین دن بعد وہی شوگر مل 37 کروڑ بولی لگانے والی پارٹی کو بیچ دی۔ یوں راتوں رات اس ایک انسان نے بغیر کچھ کیے سات کروڑ روپے کمالے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جن صاحب کو یہ تیس کروڑ روپے کی مال پٹنگ تھی وہ جنرل صاحب کے خیر خواہوں میں سے تھے۔

سب سے خیر خواہ ان اور وی نیوز میں بھی تو اس پر خاصا دوا دیا ہو گیا۔ بی بی سی کے اجلاس میں فرحت اللہ ہار نے اس پر ابھی خاصی تقریر کی اور معاملے کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے دفاع میں بھیج دیا گیا۔ اس سٹوری کے پھیلنے کے اگلے دن بعد فوجی قاذوڈیشن نے انگریزی اخباروں میں ایک بہت بڑا اشتہار دیا جس میں بغیر اس بات کے انکار کیے کہ سرکاری طور پر اس ذیل کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہیں جس شخص نے اس کی کوشش کی تھی کہ سب اچھا تھا۔

آصف زرداری راجستھان گیا تو اس کے رہنما، جنہوں میں جنرل امجد کی جانی بولی سب کے ہاتھوں سزا نہیں مل سکتے رہے تھے۔ آج جنرل امجد خود کربلا کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ ان جنرل پارٹی نے اس کو ٹھل کو ٹھپا اچھا لے کا فیصلہ کیا اور بات بڑھتی شروع ہو گئی۔

ایک دن میں قومی اسمبلی میں تھا کہ مجھے اٹنی پائے کی جرنلسٹ وٹا سرور کا فون آگیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل امجد ان کے انگل ہیں اور آج کل ان خبروں کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ بتاتے تھے اچھا کہا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو ان کا پوائنٹ آف ویو لے لیں۔ باقی آپ کی مرضی کہ آپ نے کیا اور کیسے لکھتے ہیں۔

میں وٹا سرور کی اس بات کی دوا دواں کا کہ انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں کہا کہ چونکہ جنرل امجد ان کے انگل ہیں لہذا میں کچھ ان کا خیال کروں جیسے عموماً ہم صحافی لوگ ایک دوسرے کو اپنے دوستوں یا قریبی رشتہ داروں کو اس طرح کی صورت حال میں پا کر کہتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے جنگ گروپ میں ایک اٹنی عہدے پر فائز ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحافت میں مجھ سے بہت سیکھ رہے ہیں لہذا میں توقع کر رہا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے انگل پر کچھ ہاتھ دلا رکھتے تاکہ ان کی جگہ انہوں نے خالصتاً ایک پروفیشنل بات کی کہ مجھے ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لینا چاہیے۔

بات چل نکلی ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ شاید وٹا سرور کو یاد ہو کہ 90ء کی دہائی کے وسط کی بات ہے، وہ لاہور میں دی نیوز آن سنڈے کی انچارج تھیں۔ میں ان دنوں اپنا صحافت میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں دی نیوز کے لاہور میں واقع دفتر میں دی نیوز آن سنڈے کے ہی ہمارے مٹان کے اچھے صحافی خالد حسین سے ملنے چلا گیا۔ خالد حسین سے تو ملاقات نہ ہوگی تاہم وٹا سرور سے مل لیا۔ وہ اس وقت کمپیوٹر پر تینھی کام کر رہی تھیں۔ تمام روایتی صحافیوں کی طرح انہوں نے بھی کمپیوٹر سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے دو تین منٹ بات کی۔ مجھ سے پوچھا کہ میں مٹان میں ڈیڑھ گھنٹہ کی طرح کی رہ رہ کر سکتا ہوں۔ میں نے دو تین آئیڈیے انہیں بتائیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ایم کیو ایم مٹان میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وٹا سرور بولیں کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ ایم کیو ایم کا فوٹو پٹ کیا تھا۔ ان کو تو مٹان سے کوئی اچھا رہنما نہیں ملا تھا۔ اب مردہ گھوڑے میں ہان دالنے کا کیا فائدہ؟ دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے اہواز سے لی کہ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں والے نہیں گئے والی!

مجھے یقین ہے کہ وٹا سرور کو یہ ملاقات جگر کا دھنک ہوگی کیونکہ اس طرح کے کی تو جہان کی آواز ہے کہ انہوں نے ان کے دفتروں میں پھرتے رہتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

[illegible]

عمر کے لئے عزلی صاحب الکیا ہے درست ہے کہ وہی دیکھ لوں یہ بھی جس پارٹی کے نہیں
مخبروں کے لئے اور اس سے توجہ اور قوت پر اور اسے کرا دی تھی۔

عزل صاحب نے کہا کہ جب ایک دفعہ انہوں نے کچھ دق تو ان کے گھوڑوں کا اس سلاطین
پر دھک لگا کر ان پر دھکی لے آئے تھے اس کو پہنچ گئی۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب ایسا بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ یہ
کچھ ہو سکتا ہے کہ آپ ایک شے میں کہہ میں بھی اس پر اپنی اسات گانے ان کا کہہ میں بھی۔
آپ کا کہہ لیا کہ ہے کہ اس میں کوئی گڑبگ نہیں ہے۔ کیا وہ بھی جس نے ایک سات میں سات کو
بہت کاتے تھے آپ کا دست نہیں تھا۔

عزل صاحب نے اس کا طویل جواب دیا وہ مجھے بتانے لگے کہ کبھی فنی کا وہ شے کہ پہلے
عزل نے غیر انہوں کے پاس میں دے تھے کہ میں کہہ میں کوئی گڑبگ نہیں ہے تھے۔ میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر
اس بات میں کوئی ایسا پتہ نہیں تھا تو ہر روز اس وقت ان کے آپ کے خلاف تحقیقات کا حکم کیا ہے وہ تھا۔
عزل صاحب نے کہا کہ انہیں ابھی تک تحقیقات کے آثار نہیں ملے ہیں۔ جب میں نے اس
کو کہہ لیا۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب آپ کا بیعت کی قیادت کی تھی اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
میں ان باتوں آپ سے پوچھ چکا ہوں۔

عزل صاحب نے کہا کہ انہیں ابھی کوئی شے نہیں مل سکی ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔
پتہ نہ ہو کہ انہوں نے ان کے پاس میں کوئی شے نہیں مل سکی ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کہہ لیا کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
ان کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ

عزل صاحب نے کہا کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کہہ لیا کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ

میں نے کہا کہ عزل صاحب انہوں نے کچھ دق تو ان کے گھوڑوں کا اس سلاطین
پر دھک لگا کر ان پر دھکی لے آئے تھے اس کو پہنچ گئی۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب ایسا بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ یہ
کچھ ہو سکتا ہے کہ آپ ایک شے میں کہہ میں بھی اس پر اپنی اسات گانے ان کا کہہ میں بھی۔

آپ کا کہہ لیا کہ ہے کہ اس میں کوئی گڑبگ نہیں ہے۔ کیا وہ بھی جس نے ایک سات میں سات کو
بہت کاتے تھے آپ کا دست نہیں تھا۔

عزل صاحب نے اس کا طویل جواب دیا وہ مجھے بتانے لگے کہ کبھی فنی کا وہ شے کہ پہلے
عزل نے غیر انہوں کے پاس میں دے تھے کہ میں کہہ میں کوئی گڑبگ نہیں ہے تھے۔ میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر
اس بات میں کوئی ایسا پتہ نہیں تھا تو ہر روز اس وقت ان کے آپ کے خلاف تحقیقات کا حکم کیا ہے وہ تھا۔
عزل صاحب نے کہا کہ انہیں ابھی تک تحقیقات کے آثار نہیں ملے ہیں۔ جب میں نے اس
کو کہہ لیا۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب آپ کا بیعت کی قیادت کی تھی اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
میں ان باتوں آپ سے پوچھ چکا ہوں۔

عزل صاحب نے کہا کہ انہیں ابھی کوئی شے نہیں مل سکی ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔
پتہ نہ ہو کہ انہوں نے ان کے پاس میں کوئی شے نہیں مل سکی ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔ یہ تو ان کا وہ ہے۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کہہ لیا کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ

عزل صاحب نے کہا کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کہہ لیا کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ
اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ اس کے وقت میں ہوا ہوا ہے کہ

۱۹۱۰ء کو ہزل احمد اس وقت شہر ہزل تھے، شام کو کالج تکمیل کرنا چاہتی تھیں
 واقعہ یہ کہ وہاں گئے تو انھیں پتہ چلا کہ ہزل شریف کو اس میں کر کے ہزل فیما، والدین بہت گویا
 آدمی تھے، ان کا کیا تھا۔ اس کی بات پر قہمی ہزل احمد کے ہزل شریف اور ہزل بہت وہاں سے
 ان کے تعلقات تھے۔ اور ہزل شریف کو ۱۹۸۵ء سے ہاتھ تھے وہاں تک کہ وہاں تک تھے اور انھیں
 انھیں کافی میں ان کے پاس تھے۔ پھر ہزل احمد کی انہوں تک بہت تھے ان سے کہ ان کے پاس
 کہنا اور ان کے پاس ان کے پاس ان کے پاس ان کے پاس ان کے پاس ان کے پاس ان کے پاس

جزل شرف کے ان الفاظ نے جزل احمد کو وہ اعتماد دیا کہ پھر انہوں نے مرکز چھو نہیں دیکھا۔ جزل احمد کے نزدیک سب سے آسان مارگٹ وہ لوگ تھے جنہوں نے فیکٹوں کے قریبے واقف نہیں کیے تھے اور جن کی فہرست فوری طور پر مل سکتی تھی۔ جزل صاحب نے فوری طور پر فیکٹوں کے صدر اور نائب انگریزوں سے ملا شروع کیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے ان فیکٹوں کی فہرستیں دیں جنہوں نے قریبے واقف نہیں کیے ہیں۔ جزل احمد نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ اس کروڑ روپے سے لاپرواہ کے اور لوگوں کو بھلا نہ پائے گا اور اس طرح شروع میں 1866 ایسی کمپنیاں نکالی گئیں جو اس کمپنی میں آتی تھیں۔ جزل احمد پہلے ہی ایک مینے کی ایک لاکھ روپے چکے تھے کہ 18 لاکھ 1800 روپے تمام اکٹھے اپنے

کہا کہ جب تک وہ بھڑکھن نہیں ہے، جہاں مشرف نے انہیں ایک دن بھی کسی کام پر نہ لایا تھا۔
 انہیں کہا کہ انہیں ایک طرح کا فری وولڈ دیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ جہاں صاحب آپ کی سہیل ٹیوشن تو یہ کہہ رہی ہے کہ آپ نے ان تمام
پہنچانوں کو وارنٹ کیا جنہوں نے لی ایم ایل کیو میں شامل ہونے سے انکار کیا تھا۔

جہاں سے لے لے ایک ایک سی بات کی کہ جناب اچھے تو یہ بھی بد نہیں تھا کہ کسی سادہ دل
کا کسی پارٹی سے تعلق تھا۔ یہاں کی کا کچھ بد نہیں بہت کہ ایک سادہ دل کہتے ہیں ایک پارٹی میں
گروہ ہے اور دوسرے میں کوئی اور پارٹی جو ان کر لیتا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ بھی اسے جہاں میں
نہی جاتا ہے کہ ان سب کے سر پر کرتے ہوئے بھی اچھا نام و وقت لگتا ہے۔ تو اگر شریف اور ضلعی جہ
کی پارٹی کے سادہ دلوں کا اس لیے بھی ضرورت کیا کیا تھا کہ چھپنے کی اور سادہ دلوں میں ان دلوں نے اس
کے حکومت کی تھی اور سب کتاب بھی ان دلوں پر انہوں کا ہوتا تھا۔

میں نے کیا کہ جنرل صاحب اس طرح کے اعتبار میں تو پھر بہت سارے سیکرٹری
ہوئے گئے تھے یہاں کہ پاکستان مسلم لیگ ق کے قیام آصف کے کہیں میں جوا تھا جیسے جیو کی
اداس کے کی بجائے ایک تھے میں دیکھ کر ہا کہ یہ کیا تھا اس آ پ نے خدایاں سے سلامتی کی آگے تھوڑا

جولہ ہونے کے بعد اپنے طرف سے پوری کوشش کی گئی کہ اس طرح کی صورت حال سے بچنے کی جتنی کوشش ممکن تھی وہ کر لی جائے۔ یہ سب سے زیادہ اہم اور اہم ترین بات تھی کہ وہ سب سے زیادہ اہم اور اہم ترین بات تھی۔

میں نے کہا کہ عزرا صاحب اگر آپ کا یہ دعویٰ سچ مان لیا جائے کہ آپ سیاست دانوں کے خلاف جاسوسی کارروائی کر رہے تھے تو پھر مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے سابق اسپیکر قومی اسمبلی جے ایف سہیل کو جس اثرات پر پکڑ کر جیل میں ڈالا وہی اثرات آؤٹ ریج میں دوسیم سہیل پر بھی لگائے گئے تھے لیکن جب دوسیم سہیل عزرا شرف کے ساتھ مل گئے تو آپ نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔

جزل احمد نے مجھے اس کا جواب دیا اور کہنے کے طور پر آصف اور مسز فزانہ کے کمرے کے دروازے پر گئی اور کمرے کے اٹیشن کا علم لکھا۔

میں نے کہا کہ جزل صاحب! پھر آپ کو ہوتا کیوں کیا تھا؟ یہی چاہس کی وجہ تھی کہ آپ سے

عکاس لیا تو وہ نے لیا کیا تھا۔ اب سے پاسی مٹا دیا حاصل کرنے کے لیے عیب کے علاوہ عیب کی
شہادت تھی۔

جبریل احمد کا خیال تھا کہ یہ ایک بہت مشکل المیہ تھا کیونکہ انھیں ترقی دیکھ کر کھانا، مقرر کردہ کامیابی
 تھا اور وہ اس سے خوش تھے۔ تب کے خیر میں کی حیثیت سے انھیں ایک بات کا واقف تھا کہ وہ ان کی ہاکی
 طرف سے کوئی دیا نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ اگر جنرل شرف آپ کی کارکردگی سے مطمئن تھے تو پھر انہوں نے ایک خط لکھا اور جنرل امجد کی جگہ سب میں کسی سے چرے کی تہوار سے فخر۔

جہاں مسجد بنے کہ وہاں دارے میں کوئی شجر نہیں کر سکتے کہ انھیں ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا ہو۔
تقدیر انہوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ انھیں ہٹانے سے پہلے ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور نہ
یہ ان سے کہا گیا کہ وہ کسی جے میں کلام جوڑ کر لیں۔

جہاں اچھے ایک نگار کا اکثر کیا کہ جب 2001 میں اس کی سید سے ملاو اور ان کو
 دیکھتے ہوئے اس کی آغوشوں کے خلاف ملک اور ملک پر غصے کے رہے تھے۔

میرے کیا کہ حلال صاحب! کیا آپ ان چوتھی آغیر والے کلام سے متوجہ نہ کریں گے؟
یہ کہ ان کے لیے ہم جتنے مشکل قرار دے رہے ہیں، سناؤ ضرور کیا کہ عبد اللہ بن عباس
کے خلاف کرپشن کیس پر کام کر رہے تھے تو اس وقت انھیں عیب سے بڑا ان کی کج سے بدلتا تھا۔

میں نے کہا کہ جرنل صاحب ایچ جی جی صاحب سیکرٹری ہونے والے ہیں اور ان کے پاس
پاسٹوں کے خلاف ٹیب اس طریقے سے کیوں کر ہوا تھا جسے جرنل صاحب نے لایا ہے کہ
پاسٹوں کے ساتھ یہ کام جاری تھا۔

حضرت امجد نے کہا کہ ان کا روبرو ان دونوں بہت سارے چاشت خانوں کے خلاف حقیقت کر رہا
تھا اگر ان لوگوں کے خلاف حقیقت کے لئے ان الزامات کا قیام نہیں ہوتا تو یہ حقیقت نہیں
کلیئر کر دیا گیا ہوگا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ میرے جانے کے بعد وہ کرناٹک کے گھوڑا سواروں کے ساتھ تو شرم
نہیں کرے گا۔

میں نے کہا کہ جزل صاحب! آپ ابھی بھی پاکستانی تاریخ کے اس اہم باب کے بارے میں

میں نے یہ سب کچھ آپ کے لیے ہی کیا ہے تاکہ آپ کو ہر شے سے آگاہ ہو سکے۔
میں نے یہ سب کچھ آپ کے لیے ہی کیا ہے تاکہ آپ کو ہر شے سے آگاہ ہو سکے۔

کتابت شد در روز شنبه ۱۲۰۴ قمری در محضر مولانا صاحب کرامت
مجلس علمیه کربلا و در کتبخانه کربلا و در کتبخانه کربلا
در روز شنبه ۱۲۰۴ قمری در محضر مولانا صاحب کرامت

[illegible]

جام، وہ کسی صورت میں ان چوبیس آری آفسروں کے عام ہانے کو تیار نہیں ہے جس کے
نوائے وہ عقیدت کر رہے ہے۔

جزل احمد سے ملنے کے بعد ایک بات کا مجھے ضرور احساس ہوا کہ فوجی ہمارے جیسے سولین کو
ای وقتے دارانے میں کامیاب ہوتے ہیں جب انہوں نے وردی پہلی ہوتی ہو یا پھر کرنٹن کے نام پر
انہوں نے ملک پر مارشل لا لگایا ہوا ہو۔ جب ان پر خود کرنٹن کا الزام لگے تو پھر یہ میرے جیسے ایک عام
صحافی کو اپنا دوست اکیٹر کر کے اس سے مشورے مانگنے میں بھی کوئی حار محسوس نہیں کرتے۔

جزل احمد کے چہرے پر شوگر ٹریکیٹوں کی پھیلی ہوئی دھشت کے پارے میں چھو جتا ہوا میں
ان کے دھڑ سے باہر نکل آتا کہ کیا یہ وہی جزل تھا جو کسی زمانے میں پاکستانی سیاست دانوں، وزراء، وکٹوری
یافٹس میں اور دیگر لوگوں کے لیے ایک دھشت بنا ہوا تھا۔

بسم الله الرحمن الرحيم

[illegible]

جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے سوت میں پہنچا تو بمشکل ایک دو نوک وہاں بیٹھے تھے۔
 جمالی صاحب اپنے ٹیلی فون طودا ٹینڈ کر رہے تھے۔ دو تین افراد جمالی صاحب کو یہ احساس دلانے کی
 کوشش کر رہے تھے کہ وہ ابھی بھی اس ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ڈراوٹے خواب کی
 طرح تھا جو ان کی آنکھ کھل جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا اور پھر وہی پرانی شان و شوکت، مٹری
 ٹیکری، پرہیزگاروں کی لمبی لمبی گاڑیاں، ہونٹ کی آوازیں، ریم این این کی لمبی قطاریں، دلوں کا شہر، بھانجے
 بھانسیوں کے پیچھے اونے سوالات، دلی دی گیسروں کا رعب۔ سب بکھڑاتے آئے گا۔

صاحب کو کھانے پر بلایا جاتا تھا۔

اس صحابی نے اچھائی، چائے اور دھن کی کھانے میں نے انہیں کہا تھا کہ کھانے پر گھرا جانا اگر
بہرے کھانے پر بلایا گیا کہ ضروری شہر صاحب کے لئے کھانے کا قاعدہ انہیں نے انہیں یہ کام بھیج دیا کہ صاحب
کی سلام آج آج آپ کو کھانا کھلا دیں گے۔ ابھی اب اس امر سے مراد ہے۔

مجھے اتنی ہی یاد ہے کہ کھانا کھانا جہاں صاحب کو کھانا ملا۔ کیا ہم صحابی واقعی اسے غور و خوض
کرتے ہیں کہ ایک اس پختہ ایک ہی وزیر اعظم سے ملنے کے لئے ہم کتنوں انتظار کرتے تھے اور آج
اسے وہاں سے ملنے کا انہیں ہوا اس میں دعوت کے نام پر بلایا جاتا تھا اور اب ضروری کام تھے وہ کھانا
کھانے کو بلاتے۔

میں نے بہتوں کو بلایا تھا کہ یہ واقعہ بتایا تو وہ خود بہت سے میرا ان اور انہوں نے اور
کہنے لگے کہ ہاں وہ ہمارے صحابی دوست تھے تاہم یہ کوئی بڑی بات تھی۔ وہ جہاں صاحب کو کھانا
کھانے کے بعد رات کو بار ایک بجے تک میرے گھر پر بیٹھا رہا لیکن تو بھی میرے لئے کوئی اکھاڑا
مستطیل نہیں تھا۔

میں اسلام آباد ہجرتی 1998ء میں آیا تھا اور سنا تھا کہ اس شہر کے حکمرانوں، صحافیوں، وزراء
کرپشن اور سب سے واپس پر کسی امر و نہ کرنا کیونکہ یہ وقت اور طاقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ میں
نے کسی اس بات پر یقین نہیں کیا تھا لیکن آج چھ سال بعد میں مجبور ہو گیا کہ اس بات پر ایمان لے آؤں
کہ واقعی اسلام آباد میں وفاقا رہاں اور دوستیاں ایک لمحے میں ختم اور ٹوٹتی ہیں۔ جب تک کسی کی
ضرورت رہتی ہے تو ہم اس کے خزانے اٹھاتے ہیں اور جس لمحے یہ احساس ہو گیا کہ وہ بدو اب ہمارے
کسی کام کا نہیں رہا تو پھر آگے نہیں بڑھتے بلکہ میں ایک سیکڑ بھی نہیں لگتا۔

○○○

میرے ساتھ محکمہ کرتے ہوئے جہاں صاحب کو کچھ نہیں آری تھی کہ اس طرحان سے کوئی ایسی خط
ہوئی تھی کہ وہ تو اپنی سہ ماہی رو کر اپنا کام کر رہے تھے۔ جب سے وہ وزیر اعظم بنے تھے تو وہی
کہہ کر رہے تھے کہ انہیں بتایا گیا تھا۔ میرا ان سے استغنی کیوں کیا گیا؟ انہوں نے تو کبھی بھی اپنی اہمیت

سے باز جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جہاں صاحب نے مجھ سے یہ کہہ لیا کہ میں تو جہاں شرف
پر وہی شجاعت کے کہنے پر ہی سب کچھ کر رہا تھا۔ ہمارے ہی کیا تھی ہے۔

میں جہاں صاحب کے اس سوال سے اچھا ہوا کہ بات جاننے کا خواہش تھا کہ انہیں وزیر اعظم
جاننے کا فیصلہ کیا ہے کیا اب اور کب کیا تھا۔

جہاں صاحب راہوں سے وہ اٹھاتے ہوئے کہ وہ وہی شجاعت اور انہیں جہاں شرف
پر وہی شجاعت کے کہنے پر ہی سب کچھ کر رہا تھا۔ ہمارے ہی کیا تھی ہے۔
تھی کہ جہاں شرف نے انہیں وزیر اعظم جاننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ وہی شجاعت ہے انہیں بتایا کہ
جہاں شرف انہیں اس لئے وزیر اعظم بنائے ہیں کہ وہ اپنا جتنی کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہ ہو
کہ وہ نے وہ سے ہوا جانے اور قرقر و قال ان کے کام لگا ہے۔ جہاں صاحب نے یہ وہی شجاعت کو
کہا کہ میرے کہ وہ خود وزیر اعظم بن جائیں لیکن فیصلہ ہو چکا تھا کہ وزیر اعظم کون سے ہو جائے۔
جہاں ہونگے پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دے چکے تھے اور انہیں
وزیر اعظم جاننے کا فیصلہ کیا گیا۔

میں نے کہا کہ جہاں صاحب کیا یہ ممکن تھا کہ یہ وہی شجاعت آپ کو اس لئے وزیر اعظم بنا
جانتے تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پنجاب سے فاروق لغاری، ایچ ایم اختر اور غوث شید قصوری میں سے
کسی ایک کو وزیر اعظم بنایا جائے۔ پنجاب میں چہ درہی پر وہی الٹی کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد اگر اسی
سورے سے کسی اور کو وزیر اعظم لایا جاتا تو شاید چہ درہیوں کی طاقت، غرور اور ان کو ہمیں پہنچتی۔ ایک
طرف پنجاب میں طاقت کے دوسرا کڑ بن جاتے تو دوسری طرف یہ ہو کر ان کے قوت پر وہی الٹی کو ہر وہ
جا کر ان جیوں میں سے کسی ایک کو ایئر پورٹ ریسیو اور الوداع کرنا پڑتا۔

میرا یہ لہجہ سوال سن کر جہاں صاحب چپ رہے اور انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے بھی بہت نہیں ہاری اور اسی سانس میں ایک اور سوال پوچھا کہ جہاں صاحب کیا
میں چہ درہی صاحبان نے انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے وقتی طور پر تو استہوال نہیں کیا ہے اور اب
اب ان کی ضرورت ختم ہو گئی تھی اور وہ اب تک ایچ ایم اختر، فاروق لغاری یا غوث شید قصوری کے وزیر اعظم
بننے کے امکانات نہیں تھے تو انہوں نے انہیں سے کبھی کی طرح انہیں نکال کر بے سبب دیا تھا۔

جہاں صاحب اس کی جگہ خالی رہے۔

عبدالصاحب نے یہ بات تسلیم کی کہ جب ملک میں بے انتظامیہ کے بعد واپس آئے ہیں
مردانہ بات تو یہ ہے کہ وہی شہادت حسین ہی ہے جو کہ ہم جھڑپ کا قہر تو انہوں کے ساتھ نہیں لے کر آ رہے
تھے۔ عبدالصاحب کو یہ بات تو اچھی ہے کہ وہی شہادت کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس سے کہیں
کیوں مل رہے تھے۔ شہادت اور پھر اسی شخص نہیں بنیں گے کہ یہ بتا دیتے تھے کہ حال کیا ہے۔ یہاں
شخص سے ملنا ہے تو اسے یہ بتا کر چلے آئیں۔ عبدالصاحب نے سوشل سے ان کی ہدایت ہمیں
کرتے۔

میں نے کہا کہ میں صاحب انجمن آپ میں کا فتوہ لوگوں سے جو ہماری شہادت اور ہمہ تن
پہنچائی کے باوجود انہ انکار کرتے تھے کیا کسی مرتضیٰ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو یہ بھی لکھا جائے
آپ میں ملک کے ایک کا فتوہ دیا اہم غلام کر کے لے گا ایک ذی اعتدال صاحب نے اس پر
کیا کہ یہ بات غلطی کی کہ میں نے اس طرح کا کوئی مطالبہ کسی سے نہیں کیا تھا کیونکہ انھیں اس بات کا علم
تو کیا نہیں کہ غلام کا اہم کے کیا مقدمات تھے۔

میں نے کہا کہ ایسا ہی مناسب جواب آپ کی کاہنہ کے ذریعہ کی ضرورت تھی یہاں پر قیود
آپ کی طرف سے وہ کہ باقیوں کا وہ علم نہیں تھیں فصل سال کی بات تو سچ تھی۔ یہاں پر یہی
مکروہ ہو کر میری رائے ہو کر نکلا۔ کے ساتھ حال پہاڑ شرف کی طرف سے خود ہی کے
تھے۔ اس طرح باقی تھیں نے اپنی پائی کی طرف سے اپنے لیے اس کی تھی اور یہ تھیں کے ہم
دیکھے تھے۔ کہ ایک نے اپنے ذریعہ کی ضرورت حال کی تھی۔ جہاں تک پاکستان مسلم لیگ ق کے
دراپوں کا تعلق تھا تو ان کے طرح یہی خواہش نے ہی ملے کیے تھے۔

میرے ابا کی ساری باتوں کا سلیقہ تھا۔ ابا کی باتوں کی جتنی قدر کرتا تھا۔
ابا کی باتوں کی جتنی قدر کرتا تھا۔

عالمِ مباح و نامحرم کا یہ شر یہ فرح کے لوگوں کا قبول کرنا جس نے اُنکی فساد کی تیار
ہمیں بہت اہلِ فساد سے روکیں گھر والی کی طرف رہا ہے۔

میرے لیے کہ میں اس بارہ کی حوصلہ کی بات ہے کہ اس بارہ کی بات ہے

میں نے وہ تین حصہ، اگلے عام پہ کی تھیں اور اہمیت کے لیے ان کو صرف کے لیے بتائی گئی
تو ان کے کوئی حصہ ہے سو فیصد کے حصوں کے ساتھ کہ ایک میں صرف ہے اس پہ وہ ایک حصہ ہے
تو اس کے لیے

[illegible][illegible]

۱۔ سب سے پہلے اس کی تعلیم دینی ہوگی۔
 ۲۔ اس کی تعلیم دینی ہوگی۔
 ۳۔ اس کی تعلیم دینی ہوگی۔

تمام سب سے ایک طرف سے ان سے جواب دیا کہ میں نے تم سے نہیں کہا
 میں نے اس طرف سے کہا کہ وہاں سے تم سے نہیں کہا کہ میں نے اس طرف سے
 کہا کہ وہاں سے کہا کہ وہاں سے کہا کہ وہاں سے کہا کہ وہاں سے
 کہا کہ وہاں سے کہا کہ وہاں سے کہا کہ وہاں سے کہا کہ وہاں سے

میں نے اپنے لیے ایک اور بات یاد رکھنی چاہی ہے
ان کے لیے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہی ہے

تاجم، بھالی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے ایک طبقہ اس گمان کے خلاف بہت
 زیادہ مستعد تھا۔ وہ تو آج بھی حجازی شرف کو اس کے لئے چار تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس
 میں بھلائی کی بات ہے کہ بہت سارے بڑے حضرات آج بھی اپنی پارٹی کے سربراہوں کو اس کے لئے کھڑے
 کرتے ہیں اور اگر انہوں نے حجازی شرف کو اس کے لئے چار تھے تو انہوں میں کسی بڑی بات ہو گی تھی۔
 میں نے کہا کہ بھالی صاحب اب جب آپ وزیراعظم نہیں رہتے تو آپ کیا محسوس کرتے
 ہیں۔ وہ بولے کہ ان کے پاس باتیں کرنے کو تو بڑا جیس جیس یہ موقع مناسب نہیں تھا۔ ایک دن سر
 لوگوں کو وزیراعظم ہاؤس سے ملے جانا ہوتا ہے اور وہاں بیٹھے ہوئے شخص کو اس بات کے لئے چار تھے
 ہا۔

میں نے محسوس کیا کہ بھالی صاحب ابھی بھی ایک مسئلے کی حالت میں تھے اور اپنی زندگی کے
 ان سب سے اچھے اچھے سال کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وزیراعظم ہاؤس میں گزارے گئے کوئی بات
 کرنے کو چاہتے تھے۔

میں نے کہا کہ بھالی صاحب آپ نے اتھلی اسپتال سے محفل ایک رات پہلے اپنے ایک لی
 ولی اور اس میں یہ کہا تھا کہ آپ اتھلی نہیں دیں گے۔ وہ بولے کہ میں آپ کو بڑی سچی سچی سے بتا رہا
 ہوں کہ انہوں واقعی یہ کہہ نہیں سکتے کہ ان سے اتھلی لے لیا جائے گا۔ انہوں نے جو کہہ بھی کہا تھا وہ
 تھا کہ ان وقت تک ان سے کسی نے اتھلی اسپتال کی بات نہیں کی تھی۔ انہیں 28 جون 2004ء کو
 ان کے صدر بلا لیا گیا وہاں ہالے سے قتل انہوں نے قرآن پاک پڑھا اور عدا سے دعا کی کہ وہ انہیں گنا
 گناہوں سے کیسے بچا کرے۔ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ کسی طرح ملک کا سیاسی
 نظام بچا رہے اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے اتھلی کو ذاتی ادا کا حصہ نہیں دانا چاہتے
 تھے کیونکہ داخل میں بھی بہت سارے وزراء، اعظم کو اس دور کے صدر دس مس کرتے رہے تھے تو سب
 وزیراعظم ہاؤس میں گئے جہاں بڑی لمبی کالونی تھیں بڑی جگہیں تھیں جگہ حاصل نہیں ہو۔

بھالی صاحب بولتے رہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی گیربکس میں اب تک چار پانچ حکومتوں کو
 اقتدار میں آتے اور جاتے دیکھا تھا اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اب کی دفعہ اگر ایک اور سیاسی
 حکومت ان کے فیصلے وضو کی ہو تو اس میں ہو گی تو شاید اس سے کسی کا بھی بھلا نہ ہوگا۔

میں نے کہا کہ بھالی صاحب تاجم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے کسی سرے پر اپنی اپنی جگہ
 کرتے کو چاہتے۔

بھالی صاحب نے انتہائی مہفی خیر لکھ میں بھالی صاحب کی طرف سے ان کی کوئی سہولت نہ
 ہوتی ہے تو نتیجہ وزیراعظم کے پاس کی آغوش آجاتے ہیں۔ ان کے پاس بھلائی نہ تھا لیکن وہ تو انہیں
 چاہتے تھے کہ اس پارکسٹ کو فتح کر دیں جس کی عمر ابھی آج دو سال کی نہیں ہوئی تھی۔ وہی پارکسٹ نے
 انہیں وزیراعظم ہاؤس سب ایم این ایج کو ایک سے سارے سارا قاتل لڑا تو انہوں نے بھلائی کا
 کہہ دی تو پارکسٹ کے جہانے یہ آخر ہو گا کہ وہ سارا نقصان اپنے سر لے لیں۔
 بھالی کی باتیں ایک ایک کر کے آفر کھانا شروع ہو گئی تھیں لہذا میں سہیل کر اپنی کری ہ
 دیتا گیا۔

میں نے کہا کہ بھالی صاحب آپ کے اور چودری پوجا الہی کے تعلق کب اور کہاں صاحب
 ہونا شروع ہوئے تو وہ بولے کہ وراٹل وہ فیصل صاحب حیات کی دھڑکتی ہوئی تھی انہوں نے جگہ جگہ میں کی
 تقریبات میں شرکت کرنے پہلے گئے تھے۔ یہ کہانی چودری پوجا الہی کو بہت پسند آئی۔ وہ بولے کہ وہ
 قریب چودری پوجا الہی سے بات نہیں کیجے کہ ایک وزیراعظم ہاؤس کے گاہکے بھلاؤد کہتے اپنے وزیر
 والہ کی اس طرح کی درخواست کو نظر انداز کرتے۔

بھالی صاحب نے کہا کہ اب انہیں ایسا لگتا ہے کہ چودری الہی اور دیگر صاحبان اس بات پر ان
 سے وراٹل ہو گئے تھے کہ وہ فیصل صاحب حیات کے شریکوں گئے تھے۔

میں نے کہا کہ بھالی صاحب کیا آپ کو کسی کی سرے پر یا سراسر بھلائی کہ حکومت لڑا ان
 کی تکرار وزیراعظم بن جائیں گے۔ وہ بولے کہ انہیں حکومت لڑنے کے وزیراعظم بننے کا علم نہیں تھا لیکن
 ان پہلے سے انہیں غریبی ضرور ہوئی تھی۔

بھالی صاحب بولتے رہے کہ ان کی پارٹی ان کی کارکردگی سے ٹوٹ گئی تھی۔ چودری لہامی
 نے انہیں یہ بات بتائی کہ چونکہ پارٹی ان سے ٹوٹ گئی تھی لہذا لیکن ہے انہیں وزیراعظم ہاؤس سے ہٹا
 ڈالے۔ سب ایک دفعہ پارٹی نے فیصلہ کر لیا تھا تو پھر بھالی صاحب کے پاس وزیراعظم ہاؤس میں رہنے
 کا کوئی حق نہیں رہتا تھا۔ تاجم، انہیں اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اگر اس مشکل وقت میں چودری

میں نے بات نہ کی اور جمالی صاحبہ سے پوچھا کہ ان کے بارے میں تو بات نام کی ہے
اسپیکٹر آفری ہاؤس میں ایم ایم ایف کے جاکر گھنٹوں کو غفل کر رہے تھے اس لیے اسپیکٹر ان دو عورتوں سے
پہلے کا راز ہے کہ ان سے وہ غفل تھے۔ جمالی صاحبہ کے بقول بہت سارے لوگ انہیں کی کر
لا رہے تھے تاکہ ان پر آسانی سے وار کیا جاسکے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۱ء میں اسپیکٹر دو عورتوں کو اس لیے اسپیکٹر آپ سے
دور کر رہے تھے تاکہ اگر "اسٹیشن" میں انہیں پکارتے کے بعد کوئی مسئلہ پیدا ہو تو کم از کم ان کے وہاں سے
مٹھیں رہیں۔

میں نے بڑی گھپ سی بات محسوس کی کہ ان کی ساری سہ عزتی، جہاز بھرت اور ہنگامی جہاز
کے باوجود بھی جمالی صاحبہ اس بات پر بڑا غر محسوس کر رہے تھے کہ ان کے اسٹیشن دینے کے بعد صدر
شرف نے انہیں فیملی کے ساتھ ایم ایم ایف میں کھانا دیا تھا۔ جمالی صاحبہ نے اپنی آواز میں پچھلے
پتہ پر جہاز کی کہ وہ پاکستانی تاریخ کے شاہی پہلے وزیر اعظم تھے جنہیں بڑی عزت دیکر وزیر اعظم ہاؤس
سے رخصت کیا گیا تھا اور نہ ماضی میں تو بہنو سے لے کر جو نیو، بی نظیر بھٹو اور نواز شریف کو انجانی ذیل کر
کے یہاں سے رخصت کیا گیا اور جیلوں میں ڈالا گیا۔

ایم ایم ایف میں لگی کھانے کی بڑی میز پر بیٹھے ہوئے جمالی نے جنرل شرف کو بتایا کہ وہ جنرل
ایم ایم اور فیما کے اوپر میں جیلوں میں بھی رہے تھے۔

جنرل شرف کو حیران دیکھ کر جمالی نے انہیں اپنی زندگی میں حاصل کیے گئے چند تجربوں کی
کہانی سنا شروع کی۔ شاید وہ انہیں ابھی بھی جبکہ وہ وزیر اعظم ہاؤس سے نکالے جاتے تھے، حنا
کرنے کے پتھر میں تھے۔

جمالی نے شرف کو بتایا کہ ایک سیاستدان کی زندگی میں تین قسم کے دوست ہوتے ہیں۔
کٹا اور غور نئی، ٹیل اور سیاست کے دنوں کے دوست۔

جمالی کے بقول کہ ایک سیاستدان اپنی سیاسی زندگی میں بنائے گئے دوستوں پر بھی اتنا
نہیں کر سکتا۔ آپ جیل اور کٹا ایک کے دوستوں پر اب بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔

جنرل شرف چپ چاپ اپنے ہی ہاتھوں سے چھنی کر لے گئے ایک ایسے وزیر اعظم کی باتیں
کر رہے تھے جو شاید انہیں یہ سچہ سچہ کی کوشش کر رہا تھا کہ جنرل صاحبہ اگر آج میرے یہاں

دو عورتوں نے مجھے پراہن کر دیا ہے اس کی وجہ سے مجھے اسٹیشن دینا پڑا تھا اور آپ بھی وہاں رہے
ہیں۔ کسی دن آپ کے گھر میں اس وقت آپ کو بھی دھوکا دیا گیا۔

جمالی کی یہ بات چار سال بعد اس وقت گئی کہ ۱۹۷۱ء میں وہ بڑی شہادت نے جنرل
شرف کے گھر پر پاکستان مسلم لیگ کی قیادت کا وہ آخری خط لکھنے کے واسطے گئے تھے ان کے پاس ہاتھ
کر دیا گیا کہ وہ بڑی شہادت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ جنرل شرف کو ان کی شہادت کی ریکارڈیں
جنرل شرف کی آپ مجھے یہ بات نہیں ہے کہ آپ ۲۰۰۷ء کے آخری دنوں میں وہ بڑی شہادت نے
جنرل شرف کے منہ پر پارٹی کی قیادت کا ہونے سے انکار کیا تھا کہ جنرل شرف جمالی کی چار سال
پہلے والی یہ بات یاد آتی تھی انہیں کہ سیاست میں بنائے گئے دوست بھی ان کا قاتل بن سکتے ہیں۔

ہاتھ ہاتھوں میں جمالی صاحبہ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ کبلی دھوکا دیا گیا تھا کہ
انہوں نے جن صحافیوں کی لسٹ تیار کی ان میں سے چار صحافیوں کے نام ایم ایم ایف سے نکال دیے۔
ان چار صحافیوں کے نام کاٹنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ جنرل شرف کے خلاف لکھ رہے تھے۔

جب میں یہ انٹرویو جمالی صاحبہ سے بلوچستان ہاؤس میں کر رہا تھا، اس سے بھرپور پہلے ہی
حکومت عزیز پر ایک میں خود کش حملہ ہوا تھا جب وہ ایم ایم ایف کے کانفرنس لانے کے لیے ایک انجانی پلے
سے خطاب کرنے جا رہے تھے۔ انہیں ایم ایم ایف اس لیے بلایا جا رہا تھا کہ وہ جمالی کی جگہ اس ملک
کے وزیر اعظم بن سکیں اور اس دوران چالیس دنوں کے لیے چوہدری شہادت حسین کو وزیر اعظم بنایا گیا
تھا جن کے بارے میں اسلام آباد میں یہ مذاق مشہور تھا کہ وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہیں جو اپنی
مقررہ مدت چالیس دن پوری کر کے باعزت طریقے سے گھر چلے جائیں گے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحبہ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ حکومت عزیز پر ہی کیوں قاتلانہ حملہ
کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ وہ جنرل شرف کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اس لیے
ان پر خود کش حملہ کیا گیا۔ میں نے کہا اگر یہی معیار یا جو از حکومت عزیز پر حملے کا ہے تو جمالی صاحبہ
آپ پر خود کش شہادت حسین پر بھی اسی طرح کا حملہ ہونا چاہیے تھا۔

میرا ذرا چہرہ ہوا سوال سن کر جمالی صاحبہ جو گئے اور انہوں نے اس کے جواب میں مجھے
حکومت عزیز پر مجھے کی چوہدری شہادت بتائیں۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ شوکت مری کا اپنے آپ کو ایک سے ایم این اے منتخب کرنا کہنا عام بننے کا فیصلہ تھا۔ اگر شوکت مری کو بیٹھی چاہیے تھی تو جمالی صاحب کے بقول وہ اپنی بیٹھن کے لیے جانی کر دیتے۔

دوسری وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ شوکت مری پر قاتلانہ حملہ سیاسی قائد کو ہو گا۔ ان کے بقول یہ بہت اہم سوال تھا جس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے، انہوں نے کہا کہ بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شوکت مری عالمی اداروں اور بہتر طاقتوں کا لہجہ ہے لہذا اس لیے بھی اس پر غور کیا گیا۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ شوکت مری جس کا اپنا کوئی سیاسی بیک گراؤ نہ تھا، وہ ان تمام برسوں میں جنرل مشرف کے بہت قریب رہا تھا۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ بہت سارے پارٹی کے ایم این اے شوکت مری کے ذریعہ مہم بنے یا ریزرو خزانے تھے۔ اگرچہ وہ اس فیصلے پر غامض رہے لیکن انہیں یہ فیصلہ پسند نہیں تھا۔

آخری بات یہ تھی کہ شوکت مری کو وزیراعظم ہاؤس کے انہیں پھر انٹیشن ان انا ایک بہت بڑا خطرہ تھا کیونکہ ان کو پانچ بہت سارے خطرات کے سامنے لا کر آیا گیا اور ان پر قاتلانہ حملے کی ایک کڑی تھی۔ ان کے بقول جب پارٹی کسی کو یہ عالم فسطح کے مہم سے کے لیے مقرر کرتی ہے تو اس وقت یہی اعلیٰ اہل تشکیف ہوتی ہے اور پوری کی پوری پارٹی اس وزیراعظم کے پیچھے پوری قوت سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ شوکت مری کو پارٹی نے وزیراعظم ہاؤس نہیں کیا تھا لہذا ان کے پاس پارٹی کی کوئی طاقت نہیں تھی۔

آخر میں جمالی صاحب نے کہا کہ محض چند نوجوان ایم این اے کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کی سب لہجہ و شب و شب مانگے الگ نہیں گئی تھی۔ انتہائی ریلوں میں انہوں نے پارٹی کے کسی اہم رہنما کو وہاں نہیں دیکھا۔ جمالی کے بقول یہ بھی ممکن تھا کہ چند طاقتور، موزوں جودہ، جمہوری نظام کے خلاف تھیں لہذا انہوں نے شوکت مری پر حملہ کرنا جنرل مشرف کو یہ نظام پسند کی کوشش کی ہو۔

میں نے ایک بات نوٹ کی کہ جمالی صاحب پوری شہادت پر تو بہت واراض تھے لیکن وہ شوکت مری کی طرف نہیں کرتے اور انہیں پسند نہیں تھا۔ یہ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شوکت مری

بہت قابل آدمی ہیں اور آئے والے دنوں میں اس ملک کو نئے نئے طریقے سے چلائیں گے۔ تاہم انہوں نے یہ بات ضرور کہی کہ شوکت مری کو سیاسی طور پر بہت جلد چلی کا مظاہرہ کرنا ہو گا تاکہ وہ ان قوتوں سے بہت سبب نہیں جنہوں نے ان کے خلاف سازشیں کر کے انہیں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے ہٹا دیا تھا۔ جمالی صاحب کے بقول شوکت مری باقی تمام محاذوں پر کامیاب رہیں گے لیکن سیاسی محاذ انہیں شدید مشکلات کا شکار کر سکتا تھا۔

جمالی صاحب نے نام تو نہیں لیا لیکن ان کا واضح اشارہ پوری شہادت تھیں۔ پوری شہادت دہلی اور تاجپور کی طرف تھا جنہوں نے جمالی کو سیاسی طور پر اتار دیا اور کھڑا کیا تھا کہ سب ان پر وار کیا گیا تو جمالی صاحب کو انہوں میں استغنیٰ دیکر گھر جانا پڑا۔

تاہم، بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ شوکت مری جیسے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جمالی صاحب جیسے بھٹو سے زیادہ سیاست کرنے کے لیے تیار تھے۔ جمالی نے مسلم لیگ سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ انہوں نے 15 نومبر 2007 تک جب انہوں نے وزارت عظمیٰ چھڑی تو پوری شہادت، تاجپور، پوری، الہی اور دیگر گواہ اپنے خلاف ایک ایسی سازش نہیں کرتے تھے کہ وہ جسے سے اپنے وقت چھڑا دیا۔ شوکت مری نے یہ ثابت کیا کہ وہ جمالی صاحب سے بڑا گناہگار سیاستدان تھے اور انہیں پتہ تھا کہ پنجاب کے ان تین تینوں شہادت، پوری، الہی اور تاجپور اسے حرکت دیکھتے تھے۔

ان دنوں جمالی صاحب کے بچے فرج جمالی کے خلاف کرپشن کی بہت کہانیاں چھپ رہی تھیں۔ جب میں نے یہ بات پوچھی تو انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے ان کے اس بھارے بچے کو بھی نہیں لکھا جو کتنے سالوں سے ان کی سیاست ہلا رہا ہے۔

جمالی صاحب کو پتہ نہیں کیا یا آج کا وہ بڑے جنرل لیڈا مالک اکڑا رہی کاوند کے دارہوں کے ساتھ بھڑکی پھانسی پر پھانسی دیتے تھے۔ ایک دفعہ 1988ء کی ایک کاوند مالک کے دوران انہوں نے جنرل لیڈا سے بھڑکی پھانسی کا معاملہ دیکھ کر شروع کیا۔ جمالی جنرل لیڈا سے بڑا بھڑکاوا رہے تھے کہ انہوں نے دورانے کپڑے گزاری تھی اس رات ان کے علم پر بھڑکاوا کے وقت پھانسی دی گئی تھی۔

میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔

میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔

میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔

توا از شریف

میں دسمبر 2004ء میں آٹھ پاکستانی صحافیوں کے ساتھ عراقی حکومت کی دعوت پر وہاں
 کے وہاں میں گھوم رہا تھا کہ ایک دن رگ رگ کے ہنگام پر فٹبال مارا گیا
 فٹ بال مارا گیا۔ دسمبر کے مہینے میں ہی مجھے اسے اپنی انٹرنیشنل کاپ آف دی ورلڈ کا جواڑی ملا۔
 یہ 1991ء دسمبر 2004ء کو اس وقت کے وزیراعظم شوکت عزیز نے سربراہی میں جے ایم ایف ایک
 تقریب میں دیا تھا۔ اس سے 11 دن قبل 12 دسمبر کو 11 سے 12 کے لیے جاری تھا۔ یہ سب
 لیے اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ میں یہ جواڑی اپنے لیے رکھ دوں یا عراقی حکومت کو
 عراقی حکومت کے لیے رکھ دوں۔ میں نے اسے اپنے لیے رکھ لیا۔ یہ سب
 سب کا کرنا تھا۔ میں نے اسے اپنے لیے رکھ لیا۔ یہ سب

میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔
 میں نے اپنے کئی کئی دوستوں کو بھیج دیا ہے اور ان کے پاس سے بھیج دیا ہے۔

میں ۱۲ ابرہان ہوا کہ ان بلائے خدا کے گھر سے مجھ جیسے گنہگار کے لیے ایک بلا آگیا تھا۔
جہاں خدا کے گھر حاضری دینے کی خوشی تھی وہاں میرے ذہن میں یہ بات بھی چمکی تھی کہ شاید اگر
نواز شریف سے ملاقات کا موقع ملتا تو اپنے اخبار کے لیے ان کا انٹرویو ضرور کروں گا۔ میں نے مسلم لیگ
نواز کے ایڈر خوب محمد آصف سے درخواست کی کہ وہ میاں نواز شریف صاحب کو فون کروں کہ اس طرح
ان سے ملنے اور بات کرنے میں آسانی رہے گی۔ خوب محمد آصف نے شہباز شریف کو میرے بارے میں
بتایا تو انہوں نے کہا کہ رفاق جب جدہ آئے تو ان سے رابطہ کر لے۔

میں اور ایکسپریس کے چیف رچرٹر محسن گورایہ اسلام آباد ایئر پورٹ سے جدہ کے لیے روانہ
ہوئے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیں کہ اگر محسن گورایہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں اچھے
طریقے سے جج اور اس کے فراموش نہ ادا کر سکتا۔ محسن گورایہ نے مجھ سے زیادہ جج کی تیاری کی ہوئی تھی
اور ان کی تیاری میرے ذہن سے کام آئی۔ اگر میرا جج خدا کے حضور قبول ہوا تھا تو اس میں بلاشبہ محسن گورایہ
کا ہاتھ تھا۔ محسن گورایہ اور میں نے اپنے ہوٹل کے قریب واقع خوبصورت ساحل پر شام کو دو گھنٹوں
تک جوہاگ کی قہقہے اور شادیوں کی آوازوں سے منہ منہ کیا۔

میں نے ایک روز ان بعد میں ہر شخص فون کیا۔ آپ بڑے گوتایا کہ میں نے شہباز شریف سے بات
کرتی ہے اس نے مجھ سے میرا نمبر لیا اور بتایا کہ وہ بعد میں مجھ سے بات کر لیں گے۔ اگلے دن میں
نے یقین کیا تو شہباز شریف سے بات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ خوب محمد آصف نے انہیں پہلے
فون کر کے ہمارے میں فون کرنا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کل شام کو سرور ملے آجائے۔ میں
گپ شپ ہو جانے کی اگلی شہباز شریف نے شام کے وقت گازی بھیجی دی۔ جب میں وہاں پہنچا
تو ایک صاحب نے جاتی سلام عرض کیا۔ یہ تھا کہ شہباز شریف کو سعودی عرب سے سرکے جانے کی
بہداشت لگی ہے جہاں انہوں نے اپنے ہسپتال چیک اپ کرانا ہے۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑی خوش
خبری تھی۔ کچھ گپیں کر کے میں نے اپنے اپنے گھر کو اس وقت واپس کیے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کی اہلیہ جہاں جہاں ملی خاتون بھی اپنی پہلی کے ساتھ وہاں جج کرنے
کے لیے آئے ہوتے تھے۔ روزانہ وہاں صاحب سے ملنے سرور ملے جاتے۔ انہوں نے مجھے وہاں

دیکھا تو بڑے خوش ہوئے۔ میاں صاحب سے میرا بھرپور تعارف کروا دیا۔ چودھری صاحب کی بیوی
میرا بھی کیا انہوں نے میرے بارے میں اتنے اچھے الفاظ استعمال کیے کہ میں آج شب پانچ سال بعد
بجائے لائیکس لکھ رہا ہوں تو وہ سب کچھ میرے ذہن میں ہے۔ میاں صاحب ایک بہت بڑے دل میں
پہلے ہوئے تھے اور مسلسل قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ ان کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے
جن میں پاکستان سے آنے والے بھی شامل تھے۔ ایک صاحب کے ذہن سے یہ تھا کہ پاکستانی انتخابات
میں پیچھے والے کالم اور خبریں اونچی آواز میں وہاں موجود سب لوگوں بشمول میاں صاحب کو سنائیں۔
جب وہ خبر یا کالم سنا چکا ہوتا تو اس پر بحث و مباحثہ شروع ہوتا۔ میاں صاحب جمیوں کی سے سنتے اور ہر
کوئی بے تکلف یا جملہ کہتے۔ اتنی دیر میں نماز کا وقت ہوا۔ سب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ چودھری
دار علی خان کی کمر میں تکلیف تھی وہ جھک نہیں سکتے تھے لہذا ان کے لیے کرسی لائی گئی۔ میاں نواز شریف
صاحب اگلی صف میں کھڑے تھے اور میں ان کے پیچھے والی صف میں کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا
نواسہ بھی کھڑا تھا۔ چائیک میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اگلی صف میں بھیجی کہ وہاں
میاں نواز شریف صاحب تھے جنہوں نے مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ نماز کے بعد کھنگھارانی
رہی اتنی دیر میں شہباز شریف کے جانے کا وقت آگیا تھا۔ وہ ایک ایک سے گئے۔ جب
شہباز شریف اپنے بڑے بھائی نواز شریف سے ملے گئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ میرے
بچے کوئی کے لیے بھی ایک بڑا تکلیف دہ واقعہ تھا۔ شہباز شریف میرے قریب آئے اور بات کی
بجائے کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتے۔

شہباز شریف صاحب نے ان کے ساتھ مل کر بیٹھ کر ایک اور بات بھی بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ
کون کون کیا کیا۔ اس بحث میں ایک شخص جو کہ کچھ عرصہ پہلے سے وہاں شہباز شریف کے ساتھ
میں آئے ہیں کے ہاتھوں کے ہاتھ سے کھانے پانے کے لیے آئے ہیں کہ اس سے کچھ کہہ سکتے ہیں۔
انہیں بتایا جانے کہ وہ کون تھے۔ میں نے ان کی بات سن کر کہہ دیا کہ آپ شہباز شریف کے ساتھ آئے ہیں۔
اس سے چھ سو فیصد اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ مجھے بہت قہقہے کی کہ میاں صاحب کا اس کا ہونے پہلے کھانا
تک پہنچا رہا تھا۔ تاہم ایک شائد ان کی طرح میاں صاحب نے اللہ کرنے کے لیے
کامل کرنا سب کیا۔

اتنی دیر میں میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ میاں صاحب کی یہ کوشش تھی کہ ہر مہمان کی پلیٹ میں پہلے کھانا ڈال دیا جائے۔ اتنی دیر میں کسی نے آکر میاں صاحب کو بتایا کہ اسے آروائی سے ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میاں صاحب نے کھانے کی ٹیبل پر ان سے بات کی اور باہر اسی طرف میری طرف دیکھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ وہ مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے شہباز شریف کی امریکہ روانگی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ یہ پاکستان میں بہت بڑی خبر تھی کہ شہباز شریف کو سعودی عرب چھوڑ کر امریکہ جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میاں صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ خبر اس وقت تک آؤٹ نہ ہو جب تک شہباز شریف کا جہاز جدہ ایئرپورٹ سے اڑ نہ جائے کہ کہیں آخری مرحلے پر ہی جنرل مشرف کی حکومت کوئی مسئلہ پیدا کر دے۔

میاں صاحب نے ڈاکٹر شاہد مسعود کا فون بند کرتے ہی مجھ سے پوچھا کہ رؤف صاحب آپ نے ہی یہاں سے بیٹھے ہوئے یہ خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو ایک کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں لرز کر رہ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بھرے ہوئے گلاس میں لٹکا کر ہمارے میری تو اس وقت ڈاکٹر شاہد مسعود سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سب سے بڑھ کر میں اس خبر کا انحصاری Exclusive سمجھ رہا تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ کھانے کے بعد میاں صاحب سے اجازت لے کر یہ خبر اپنے اخبار دی لے کر کے لیے فائل کروں گا۔ بسلا میں کیونکر اتنی بڑی خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو ان کا۔

میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور میاں صاحب کو بتایا کہ میں تو ڈاکٹر صاحب کی انی طور پر ہمارا بھی نہیں ہوں اور دوسرے ایک صحافی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اتنی بڑی خبر اپنے نام سے اسے مان کر لے گی اور صحافی کہے کہ وہ اس کا کرے گا۔

میاں صاحب نے پپ کر کے میری بات سن لی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں ابھی بھی شک تھا کہ یہ اتنی بڑی "سرس" کن کے مگر میں چپ کر گئی اور نے نہیں میں نے کی تھی۔

کھانے کے بعد میں پھر دہری دار کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ وہاں صاحب سے میرا ایک انٹرویو کرانے دیں۔ دار نے کیا کیا وہاں صاحب سے بات کریں گے۔

اس سے پہلے میں میاں صاحب سے دو تین دفعہ باتوں باتوں میں یہ درخواست کر چکا تھا لیکن انہوں نے مجھے ایک بار بھی اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ مسلسل قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی طاری رہتی۔ یہ طبع وہ بات ہے کہ جب لندن میں وہ رہیں بعد ان سے ملاقات ہوئی تو اتنے بٹاش بٹاش اور کپ شپ کرنے والے لفظ کے میں حیران رہ گیا کہ واقعی دو سال پہلے میں انہی سے جدہ میں ملا تھا جو ہر وقت قرآن پاک ہاتھ میں لے کر چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے ملتے تھے۔

میاں نواز شریف صاحب میرے انٹرویو کی درخواست کو ٹال گئے۔ آخر طے ہوا کہ جب میں جج کر کے جدہ واپس آؤں گا تو اس وقت اس پر دوبارہ بات کریں گے۔

مجھے ملتے میں جج کر کے واپس آیا تو میں نے پوچھ دہری دار علی خان سے دوبارہ رابطہ کیا۔ انہوں نے مجھے پھر وہیں سرور پکس بلا لیا۔ میاں صاحب کی طریقے سے بھی انٹرویو پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ پوچھ دہری دار انہیں راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پوچھ دہری دار دراصل مجھے منون کرنا چاہتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میاں صاحب پوچھ دہری دار کے لیے طبع شاہد اس انٹرویو کے لیے بھی تیار نہ ہوتے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دراصل سعودی حکومت اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی دلیلی میں یہ بات بھی ملے ہوئی تھی کہ نواز شریف کسی پاکستانی اخبار کو انٹرویو نہیں دیں گے اور نہ ہی سیاست پر گفتگو کریں گے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ اس کا ایک راستہ یہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ مجھے ساری باتیں بتائیں گے جو میں ان سے پوچھوں گا لیکن میں انہیں اپنی سٹوری میں ان کا کام دینے اور اپنی طرف سے انہیں گا۔ میں اس بات پر بھی تیار ہو گیا۔ کام ابھی ابھی میاں صاحب کے ذہن میں کوئی بات ٹک رہی تھی۔ وہ کوئی بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ آخر مجھے وہاں سے کے بعد یہ بات ملے ہوئی کہ میں پاکستان واپس جا کر ان کا سارا انٹرویو لکھوں گا اور لکھ کر پوچھ دہری دار علی خان کو دکھاؤں گا۔ پوچھ دہری دار کو کوئی اعتراض ہو گی کہ وہ اس انٹرویو میں کیا کاغذ پھانت کرے ہیں اور میں اس پر کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔

میں اس بات پر تیار ہو گیا کہ میرے خیال میں نواز شریف سے ان کی کوئی خطا اس بات

سے زیادہ اہم تھا کہ وہ مسودہ چھپنے سے پہلے جو ہدیہ ڈارملی خان Edli کریں گے۔ یہ ہدیہ ڈارملی خان
کیونکہ میں ایک اعتراض کر رہا تھا کہ ان کے اپنے دوائے شخص کو اس کے اعتراض کا مسودہ لکھا تھا کہ اس
میں تھا کہ وہ اپنی اپنی بات سے غور نہ کرے اور اس کے اندر ایک لڑکھائے۔

میں پاکستان والوں آج اور اپنی محنت سے دیکھ کر میں نے 4200 الفاظ میں یہاں ڈارملی خان
کا ایک ٹکٹ انداز میں یہ دوا لکھا۔ میری دوا ہی ہر اسٹامپ آواز میں فہم نہیں دی لہذا کے الفاظ میں
پتے تھے۔ یہ سب تک اس طرح کے جس کے قریب سیاسی ہر دوا تک پہنچ چکے تھے جنہیں بہت
مہارت ملی تھی۔

ان ہر دوا کو چھاپنے کا سارا کرڈٹ دی نہ کے ایڈیٹر سلیم بخاری اور جنگ گروپ کے
مالک میر تقی الرحمن کو ہر دوا جنہوں نے جرنل شرف کے مخالفین جو ہدیہ ڈارملی خان، اسحاق اس
نور احمد آصف اور سب سے زیادہ کر جرنل علی قلی خان کے وہ اعتراض چھاپے تھے جس میں انہوں نے جرنل
شرف کو بڑے سخت الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان دنوں جرنل شرف ایک طاقتور آرمی ڈکٹیٹر بن
چکے تھے اور اپنے آپ کو ہادی صدر بھی منتخب کر چکے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ جنگ گروپ پر بہت شدید
دباؤ تھا کہ جرنل شرف کے مخالفین کے یہ اعتراض نہ چھاپے جائیں تاہم سلیم بخاری اور میر تقی الرحمن
کام نہ رہا کہ باوجود ان کے چھاپے ہوئے۔

مجھے اس وقت یہ اندیشہ تھا کہ اب میر تقی الرحمن نے نوادر شریف کا بعد سے کیا کیا
انہوں نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت تک سلیم بخاری صاحب جا چکے تھے اگر نہ مجھے یقین ہے کہ ان
کے اندر یہ حیرت کہ وہ میر تقی الرحمن کے خلاف لکھیں چھاپے پر تیار نہ آسکیں گے۔ تب میں نے
سنا تھا کہ

میر تقی خان نے وہ محنت کی تھی کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ اعتراض چھپ جائے۔ ایک دن
مجھے یہ خبر آئی کہ ایک دن میر تقی خان نے ایک کتاب لکھی تھی کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ
موضوع ہے جس میں ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے
نکسار کی تھی۔

یہ کتاب ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے

میں نے اپنے گروپ سے صاحب کی مہارت سے ملنے کی کوشش کی اور ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے
جو وہاں سے انہیں اس کی کوئی مہارت نہ تھی۔ ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں
ایک طرح کی بات لکھی ہوئی ہے کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں
تھا کہ میر تقی خان اس طرح کا ایک قصہ بھی لکھا ہے۔ کتنی صاحب نے ان کی بات میں جانا دیا
بائیں شروع کیا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ مجھے نوادر شریف کا انداز بھی لکھیں۔ میں نے اس پر
بائیں میں چھاپوں گا اور اس کی ایک انجی ایس ایس ڈی ہائپر میں بھی چھاپوں گا۔ یہ وہی رقم تھی جسے جنہیں
اپنے دور اقتدار میں نوادر شریف نے رات کو لاہور میں واقع ان کے گھر سے خفیہ طور پر لے کر
پھر ان کے یہاں لیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے میں ایک ٹکٹ لکھ دیا ہے کہ ان کا
بڑی تیزی سے ایک کام کا سب سے کٹھن فٹن کر رہا ہے۔ یہ ٹکٹ وہاں ہے کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے
صاحب کی بات خود جیروانی سے اپنی تقریروں میں کرتے تھے کہ پاکستان کو کامیاب بنانے
میں فوجیوں اور فوجی حکومتوں کا کتنا بڑا رول ہے۔ اگرچہ یہاں نوادر شریف کا وہ انداز تھا کہ ان کے یہاں
میں چھاپا لیکن جنگ کی کمی کی وجہ سے اسے اچھا خاصا Edli کیا گیا تھا۔ ہم ان کے یہاں کے نوادر
تھادی اجازت دینے سے اس طرح Edli کیا کہ اس میں یہاں صاحب کی اپنی اپنی باتیں چھپ
گئیں۔

○○○

نوادر شریف مجھے اور میر تقی خان کو ملے کہ سرور میں اس واقعہ پر ایک ٹکٹ لکھنے سے
بائیں میں چکے۔ وہ چاہتے تھے کہ میر تقی خان ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں
نوادر شریف صاحب سے کہیں گے کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں
ہو چکا ہے۔

میں نے ایک بات غصے سے کہی کہ نوادر شریف ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں
مجھے یہ خبر مل رہی تھی کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں
تھے کہ ان کے یہاں صاحب کا یہ موضوع ہے جس میں ان کے یہاں

آج دو ہزاری شریف لکے انہوں نے اپنے دھندلوں سے اس ملک کا آرمی ٹیپ کاٹھا اور ملک کا
صدر کا چٹا تھا۔ وہ ایک عرصہ پہلے اس وقت آکر پہلے آتے تھے جب دوزخیا عظیم تھا اس کی
دعوت کی سب سے بڑی قوا اہل بدعت افراد کے کسی انتظامی عہد سے یہ نظری کی کیفیت و ملک آج
ہا کہ ان کا کہنا تھا آج دو اس ملک کے دارالاعظم تھے۔

نواز قریب کی باتوں سے گنتا تھا کیا باتوں نے اپنے دوستوں کو عداوت اور حسد سے گھبرا کر لایا
تھا اور وہ اسے میر سے اس دن کا انکار کر رہے تھے جس دن وہ دودھ مارو کی داستان دیکھیں یا نہیں گئے۔ جس
نے محسوس کیا کہ اس ع سے میں نواز قریب نے خاصا وزن بڑھا لیا تھا لیکن نئے بال گونا نے کے بہود
نوجوان سے نکلا رہے تھے۔

میرے لیے خیر الٰہی کی بات یہ تھی کہ نو از شریف میں اب یہ خوبی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ میرے ہر سوال کا جواب براہ راست دینے کے بجائے اسے فلسفیانہ انداز میں دے رہے تھے۔ انہیں آفریقہ اسی اور سیاہی النور کو ایک فلسفیانہ رنگ دینا ہی کیا تھا۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر نیچہ بولی آتی جا رہی تھی اور ان چار سالوں میں انہوں نے بہت سے مشکل مسئلے ٹکھائے تھے۔ اب تو وہ اپنی ان تمام غلطیوں کا اعتراف بھی کرنے پر تیار تھے جن کی وجہ سے وہ آج اس حالت میں پہنچے تھے۔ نو از شریف کو یہ بھی پتہ تھا کہ سچینے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور وہ اپنی ان غلطیوں سے سچینے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ہاتھوں ہاتھوں میں محسوس کیا کہ اگرچہ لوگ ان سے اس وقت بھی بٹے آتے تھے اب
دور براعظم تھے آج اب وہ وہ میں اپنی جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو بھی لوگ ان سے بٹے
ڈاکٹران سے آئے تھے۔ کامیاب ہوئے۔ یہ کہ باطنی کے لئے دوست اب ہزار شرف کے غلبہ
سے ان سے بٹے نہیں آتے تھے۔ کامیاب انہوں نے اپنی اس نئی زندگی اور لوگوں کے لئے راہوں سے
بگھڑ کر اپنا لاکھ بھاریاں چاہے کہ سر اوٹل میں چلے کر وہ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔

[illegible][illegible]

یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کے بارے میں میں نے بہت ساری باتیں سنی ہیں۔
میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں۔

نور شرف کا یہ نام اور اس کا نور شرف کے درمیان واسطے والے نام
 کے بارے میں غائب ہوا ہے نور شرف کا نور الہی و وحی ہے جو کہ حاکم و مقرر کے واسطے
 کرنے کے لیے رابطہ میں ہے۔

جہاں شرف کی یہ بات فی دہی چہ کن کرنا اور شرف نے ملی ہوں انہاں اور جہاں ہوں وہ ہے
 اس کی۔ اس سے پہلے جب آصف علی زہرا کی مثال سے رہا ہوئے تھے تو بھی انہوں نے انہوں کو
 کہا کہ کہہ دوئی تھی۔

[illegible]

اور صرف اے نے محرم سے پہلے کہ ام کیوں اس وقت جن طرف اور ان کے ساتھ
اور ان کی کریں۔

[illegible]

لیندوں سے متاثر ہونے بغیر چند گئے جب ان سب نے ایک زبان میں یہ کہا کہ 1947ء سے
اب تک بھارت کی سب سے بڑی کامیابی جمہوریت تھی۔

کسی ایک بھی بھارتی وزیراعظم نے یہ نہیں کہا کہ بھارتی اکادمی یا اس کی فنی طاقتوں
پہاس برسوں میں ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

نواز نے کہا کہ لاٹھی پٹیل کی اس کال کو فنی میں جیت کر انہوں نے اس گھٹک سے ایک سی تیر
1947ء کو قوموں کی تحریک میں جمہوریت سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ جمہوریت کے بعد ہی کسی بھی ملک
اور قوم کو دیگر کامیابیاں ملتی ہیں۔ نواز شریف نے کہا کہ جب انہوں نے سابق بھارتی وزیراعظم کو یہ
کہتے سنا کہ ان پہاس برسوں میں جمہوریت ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ انہوں نے اٹھا کھینچا
آپ کو شہید شرمندہ محسوس کیا کہ ہم بھارتیوں کی طرح بی بی سی پر جیت کر پوری دنیا کے سامنے یہ دعویٰ نہیں
کر سکتے تھے جو ان پر سابق بھارتی وزیراعظم نے کیا تھا۔

میں اب بات کو اصل موضوع کی طرف لاتا ہوں رہا تھا۔ یہ امر ادھر کی باتیں صرف اس لیے کی
تھیں کہ نواز شریف میرے ساتھ اپنے آپ کو یہ سکون محسوس کریں اور مجھ سے مکمل کلمات کریں۔

مجھے پتا تھا کہ نواز شریف دو دفعہ وزیراعظم ہونے کی مشیت سے بہت سارے اہم فیصلے کرتے
آئے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ وہ تھا جو 1993ء میں سپریم کورٹ سے اپنی حکومت بحال
ہونے کے بارے میں انہوں نے آئینی دے دیا تھا ان سے لے لیا گیا تھا۔ اب تک ہمیں یہ بتانا کہانی
کس وقت کے آری ہیٹ جنرل وسپہ کا کڑے انہیں دھمکیاں دیکر ان سے آئینی لیا تھا۔

اب میں نے نواز شریف سے یہ سوال پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک اور کہانی سنائی۔ اب نواز
شریف اور نظام اسحاق خان کے درمیان حکومت بحال ہونے کے بعد بھی مشکلات کم ہونے کے
بجائے بڑھتے گئے تو انہوں نے جنرل کا کڑے کو فون کیا کہ وہ آئینی دے دیا تھا وہ یہ ہیں کہ ان کے لیے
نظام اسحاق خان جیسے صدر کے ساتھ مل کر حکومت چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ اب جنرل کا کڑے نے نواز
شریف کے سامنے یہ بات کہی تو ایک لمحے کے لیے وہ ششدر رہ گئے اور پوری جہالت سے نواز شریف
سے پوچھا کہ آپ کیوں آئینی دے گئے۔ تاہم اب جنرل کا کڑے نے نواز شریف کو اپنی بات دہرانے
اور لے لیا تو وہ نے۔ اور کے سوا آپ کچھ اس ملک کے گراں وزیراعظم بن کر نہ لے لیا تھا کہ انہیں

جس نواز شریف نے یہ آفر قبول نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے جنرل کا کڑے کے ساتھ ایک اور شہرہ
رہی اور نے کہ جنرل صاحب اس آئینی دیکر گھر جا رہا ہوں لیکن وہ مجھ جس کی جہت کا کیا ہو
جوان بچا ہوا تھا اسے بھی میرے ساتھ ہی گھر جانا چاہیے۔

جنرل کا کڑے نے نظام اسحاق خان کے بارے میں سخت زبان استعمال کیا اور نواز کو بھینچ دیا کہ
آپ جی رہیں کہ نظام اسحاق خان کو بھی گھر جانا ہو گا اور اگر انہوں نے حراست کی تو میں انہیں رہائی
نہ ملے گا۔

نواز شریف کو یہ بات پتا نہیں آئی کہ ایک فنی جرنل ایک سو بیسین صدر نظام اسحاق خان کے
بارے میں اس طرح کی سخت گفتگو کرے چاہے وہ اس وقت ان کا سب سے بڑا سیاسی دشمن ہی کیوں
نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں کسی کو بھی لوگوں کے دلوں سے غلبہ کچے کے صدر کی بے عزتی کرنے کا
انتہا نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں یہ فنی لوگ دراصل سو بیسین لینڈ روں سے لڑتے کرتے ہیں تاکہ ایک
دوسرے کی بڑی عزت کرتے ہیں چاہے وہ بنا ڈرائی کیوں نہ ہو جائیں۔

دوسری دفعہ وزیراعظم بننے کے بعد نواز شریف نے ایک بڑا فیصلہ کیا کہ جنرل جہاگیر کراست
سے آئینی لینے کا تھا۔

میرے اصرار پر نواز شریف نے ایک اور کہانی سنائی۔

اب نواز شریف کو یہ پتا تھا کہ آری ہیٹ نے کچھ عام پیش بیکورلی کو مل جانے کا آئیڈیا ان
کی حکومت کو دیا تھا تو انہیں شہید ہر فیصلہ آیا۔ ان کے خیال میں جنرل جہاگیر کراست نے ایک آری ہیٹ
ہونے کے قاتل سے اپنی مدد اور انتہا رات سے لیا اور کیا تھا اور اب وہ اس قاتل نہیں تھے کہ یہاں
حکومت ان پر حملہ کر سکتی۔ یہ جنرل جہاگیر کراست کا انتہا نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی بات کرتے۔
نواز شریف کو محسوس ہوا کہ جہاگیر کراست نے ایک بیان دیکر ان کی وزیراعظم کی مشیت سے ساری
انسانی ایک لمحے میں ختم کر دی تھی۔ اب نواز شریف کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک سیاسی
حکومت کے ہیٹ ایگزیکٹو ہونے کے آئینی انسانی کو سنا لیں اور اس ایک بیان سے بڑا انتہا رات
کے دوران میں گزار دی ہوئی تھی اسے درست کر لیا۔ نواز شریف نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ جنرل جہاگیر
کراست کو مار کر انہیں قاتل نہیں کے کہ انہوں نے ایک لٹریچر کی تھی اور اب اس کی انہیں قاتل نہ

چلے گی۔

جنرل جہانگیر کرامت کو پرائم مشنر ہاؤس بلایا گیا اور نواز شریف نے انہیں یہ سے واضح لکھوں میں بتایا کہ پاکستان کے وزیر اعظم ہونے کے ناطے ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ ان کا آزادی چھپ اس طرح کے سیاسی بیانات داتے۔

جب جنرل جہانگیر کرامت نے نواز شریف کو اس موضوع میں دیکھا تو اچانک انہیں احساس ہوا کہ واقعی انہوں نے ایک سیاسی بیان دے کر ایک شدید غلطی کی تھی۔ چنانچہ نواز شریف نے بغیر وقت ضائع کیے جنرل صاحب سے کہا کہ باہر ہو گا کہ آپ شام تک اپنا استعفیٰ بھیج دیں۔

نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب آگے سے جنرل جہانگیر کرامت نے بغیر بحث و مباحثہ کیے یہ کہا کہ وہ شام تک اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیں گے۔

جہانگیر کرامت اپنی بات کے پتے نکلے اور شام کو ہی جی آئی ایس آئی رہا جیم ان کا استعفیٰ لے کر نواز شریف کو دے آئے۔

یہ ساری کہانی سننے والے میں نے نواز شریف سے کہا کہ تو پھر آپ نے یہ طریقہ جنرل شریف کے ساتھ کیوں نہیں اختیار کیا۔ جہانگیر کرامت کی طرف آپ انہیں بھی اپنے جتر جاتے اور انہیں کاہکی کے بستے پر دھجوا کر کے ان سے استعفیٰ طلب کرتے۔ انہیں دس دس کرنے کے لیے آگاہ کیا پھر چلانے کی اپنا ضرورت تھی۔

نواز شریف نے میری طرف توجہ سے دیکھا۔ وہ تھوڑی چہرہ پر ہے۔ وہ شاید مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ میں شاید جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل شریف کی صورت حال کا آپ کے سامنے سے موزان کر کے ان سے یہ سوال پوچھاؤں گا۔

ان نواز شریف نے کہہ دیا کہ اس میں وہ مختلف باتوں میں وہ مختلف آری تھیں کہ ان کو اپنی کار سے لے کر انہوں کے لیے ایک مختلف حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے انہوں کو اپنے لطف و ان میں اپنی کر لے کی کوٹھل کی۔

تاہم، مجھے نواز شریف کے اس غیر مطمئن جواب سے یہاں تاہم وہ انہوں نے جنرل شریف کو اس میں کر لے کا لطف اٹھائی ہندی میں کیا تھا جس کی ان کے پاس اب کوئی توقع نہیں تھی۔ یہی وجہ

تھی کہ جنرل شریف کے کہیں میں وہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکے جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے میں حاصل کیا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک جنرل علی قلی خان سے لیے گئے اعتراض میں پوچھی گئی ایک بات یہ آئی تھی جس کے جواب میں علی قلی نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ جنرل شریف جہانگیر کرامت کی جگہ آزادی چھپ بننے کے لیے نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے تھے۔ علی قلی خان نے یہ بھی بتایا تھا کہ نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری نے انہیں یہ کہا تھا کہ اگر وہ آزادی چھپ دینا چاہتے تھے تو پھر سادہ کاری میں سادہ کپڑے پہن کر وزیر اعظم سے خفیہ ملاقات کر لیں۔ تاہم، جنرل علی قلی خان نے ان شراکتہ نواز شریف سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور یوں وہ آزادی چھپ نہیں دے سکے۔

نواز شریف نے ان تمام باتوں سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کسی جنرل شریف سے علیحدہ طور پر نہیں ملے تھے۔ تاہم، انہوں نے کہا کہ جنرل شریف کو آزادی چھپ دینے کے پیچھے اور بہت ساری وجوہات تھیں۔ جنرل علی قلی خان کو اس لیے آزادی چھپ نہیں دے دیا تھا کہ ان کے بارے میں انہیں پتہ نہ تھا کہ ان کی جی جی کہ جب ان تک جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی بات پہنچی تو انہوں نے اس پر جرح و تردید کی۔ ان کا یہ کہنا کہ جنرل علی کے خلاف کیا اس طرح کی روایتیں ان کے پاس تھیں۔ اصل کو یہ وجوہات خان اور سیف اللہ لکھلے کا ساتھ دینا بھی جنرل علی قلی کے خلاف پانچویں اور نوے کی کوئی بھی چاروں لینے کو چاہتے تھے کہ علی قلی خان کو آزادی چھپ دے جانے کے بعد ان کا ان کی ایک تکی سیاسی سازشوں کا انکار دے دیتے گی۔

نواز شریف نے اس بات کو بھی انکشاف کیا کہ گوہر ایوب خان جو اس وقت ان کے وزیر خارجہ تھے اور علی قلی خان کے بہنوئی بھی تھے انہوں نے انہیں آزادی چھپ دینے کے لیے کوئی ایک سنگ کی تھی۔

اب نواز شریف کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ جنرل علی قلی خان کو آزادی چھپ دینے سے ان کی حکومت پر سیاسی اعتراضات میں گہری رہے گی تو پھر ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ جنرل جہانگیر کرامت کو آزادی چھپ دے۔

میں نے یہاں صاحب سے پوچھا کہ جنرل جہانگیر کرامت کو آزادی چھپ دینے کی سہولت انہیں

اور فریب ایک لمحے کے لیے رکے، مجھے عجب دیر کے چائے پانوں کے ساتھ ساتھ
کری، بیٹھے جو وہی ڈیڑھ گھنٹہ کو دیکھ کر چلائی میں اس سے کہتا "یہ تو صاحب میں فریب دیا
اس میں کہ حال شرفیوں کی میرے گول کے لئے ہے۔"

یہ پہلی کتاب فیضانِ عالمی ہے۔ مجھے میرے اہل کمال کا خیال تھا کہ اس کی طرف سے
آئی جیل جانے والے یہ پہلی کتاب فیضانِ عالمی کے بھائی یا بہنوں کی تیار کی ہوگی جس پر
تکلف نہیں ہے۔

میں نے یہاں ملائی ہے پوچھا تو محلہ خیر آباد میں کہنے کا حکم کیا گیا ہے۔
 فوارہ شریف نے ایک اور کھائی بنائی۔

ایک ان نواز شریف کے کانوں تک یہ بات پہنچائی گئی کہ جس آدمی کو وہیں سے امریہ
جو کرکل آؤت آیا تھا اور عدالت گویا پاکستان پہنچا کرتے تھے وہ کا تھا آقا قادی ان ہی ان ہی اللہ امر ہمارے
تھے کہ یہ سارا کیا ہوا نواز شریف کا تھا۔ فوجیوں نے فوجی امر ہمارے تقریرات میں نواز شریف کے خلاف
سرکوشیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ نواز شریف کے بارے میں یہ بات فوج میں کی جاتی تھی کہ اگر نواز
شریف عدالت کے ساتھ بیٹھا نہ کرتے کہ لیے امریکہ نہ جاتے تو پاکستانی فوج محض بیکار ہو کر رہ جاتی۔
تھیں یہ واقعہ کہہ دیجئے۔

اب نواز شریف کے کانوں تک یہ باتیں پہنچیں تو جہاں وہ حیران ہوئے وہیں انھیں حسرتی
آیا۔ وہ غوری صبر پر چڑھا ہو گئے کیونکہ یہ وہ کوئی نہیں، عزت شریف ہی تھے جنہوں نے نواز شریف سے
یہ درخواست کی تھی کہ وہ امریکہ کی آمد سے بدھارتی فوجیوں کو کارگل کے بعد پاکستان پر مزید حملے کرنے
سے روکیں اور اب اپنا تک نواز شریف کے اگلی جنس ذرا دلچ یہ کہہ رہے تھے کہ غوری جتنے یہ ساری امار
اور ان کی پادشاہی ہے تھے۔ خصوصاً اب نواز شریف کو اس بات کا علم تھا کہ کارگل آپریشن میں پاکستان
آرمی کو اپنی تاریخ کے انتہائی خطرناک سولہ ہلاک کر دیا گیا تھا۔ پاکستانی فوجی کارگل کی پہاڑیوں پر کبھی
پہنچے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تو چھوڑ کر کھائے پینے کے لیے بھی گئے تھے۔ اب بدھارتی فوجیوں نے

[illegible]

اور شریف نے مجھے بتوایا کہ انہوں نے یہ کیا تھا کہ انہوں نے جو اس وقت تک کہ وہ اس کے پاس آئے تھے وہ اس کے پاس آئے تھے

جس نے ان شریف کو یہ سنا دیا کہ تم اپنی اہلیہ اور بیٹا تمہارا لکھو کہ وہ ہمارے ہاں ہیں اور تمہاری اہلیہ
کا بستر پر ہے۔ ان شریف کی سوجھ بوجھ میں حلال ہونے پر ان شریف نے اپنی اہلیہ کو ان کے پاس لے جانے کا ارادہ کیا۔
ان شریف کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ گو وہ ہمارے پاس میں وہ تو لاکھ کی لاکھ کی اہلیہ کے پاس لے جانے کا ارادہ کیا۔
ان شریف کو نہ دیا گیا تو پھر ان شریف نے اپنی اہلیہ کو لے جانے کا ارادہ کیا۔ ان شریف نے اپنی اہلیہ کو لے جانے کا ارادہ کیا۔
ان شریف نے اپنی اہلیہ کو لے جانے کا ارادہ کیا۔

یہی سوچ کر اپنے ملک کی فوج کی 77 تہذیبوں کے لیے فوج شریف نے فوجی طور پر سرکے جا کر فوج کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ جب نوادہ شریف یہ فیصلہ کر کے فوجی طور پر فوجی طور پر فوج کے حجاب کے خلاف شہر شہر شریف نے انھیں سرکے جانے سے روکا اور کہا کہ وہاں کشتی آگ کی قیامت کو اپنے لیے کی گئی تھی۔ اگر آج انہوں نے اپنے سیاسی لین دین کی منشا کے بغیر کارکنوں پر ہتھکڑی کی تھی تو پھر وہ فوجی لین دین کو آج ہمارے فوجی فوجوں کا سامنا کرتے رہیں گے۔ ان کی ہتھکڑیوں پر ہتھکڑیوں کی سیاسی حکومت کے کہنے پر شروع کر دیا گیا تھا۔

خواجہ شریف نے یہ کہہ کر چھوڑ دی کہ وہ: اھمیاہ شریف کا بہت ٹھکانہ ہے کہ سلسلہ پاکستان آئی

کے ان جرنیلوں کا نہیں تھا جنہوں نے کارگل کی پہاڑیوں پر یہ سارا کھیل کھیلا تھا جس میں اب تک فتح
جزیرہ پاکستانی فوجی ہے مگر وہ کھل مارے گئے تھے۔ یہ دراصل اس ملک کی فوج کی عزت اور اہمیت کا مسئلہ تھا
جسے اس وقت بھارتی سرکاری تھا۔

ان اپنی فوج کی عزت بچانے کے نام پر نواز شریف نے فوجی طور پر 4 جولائی 1999ء کو
امر کیا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف انہیں اسلام آباد ویزیت پر عندا صاف کھینے کے لیے آئے۔ ان
کے بعد 4 جولائی کو امریکا میں 11 اوسب کے سامنے تھا۔ واپسی کو بڑی مشکل سے علی گشت نے
بیزیت پر واپسی کیا۔

اب اس ایک گروڈ میں جب نواز شریف کو یہ اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ جنرل مشرف اور
ان کے بریل اپنی سرکاری اور فوجی محفلوں میں کارگل جنگ کا ذکر دار انہیں غمناک ہے تھے اور یہ دعوے کیے
ہو رہے تھے کہ وہ اگر امریکا ہا کر بیزیت کرنا تو شاید ہماری فوجی بھارتی کشمیر پر قبضہ کر لیتی تو انہیں
شدید غصا آتا۔

نواز شریف اب مزید ان دردی والوں کی دھوکہ بازی اور چالوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
انہوں نے بغیر تاج کی پروا کیے جنرل مشرف کو دس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات
وہنگی تھی کہ جنرل مشرف نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ پھر بھی انہوں نے جنرل مشرف کو دس مس کرنے
سے پہلے اس وقت وزیراعظم ہاؤس میں موجود اپنے بھائی شہباز شریف اور چوہدری ثار علی خان سے
مشورہ کیوں نہیں کیا تھا تو نواز شریف نے میری طرف دیکھ کر بڑے ہنستے لہجے میں کہا کہ جناب اس
وقت شہباز یا ثار سے مشورہ کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا تھا اور انہوں نے
وہ کچھ کیا جو ان کے خیال میں اس وقت کرنا چاہیے تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر انہوں
نے شہباز اور ثار سے بات کی تو شاید وہ انہیں روکنے کی کوشش کریں اور اس دفعہ انہوں نے رکنا نہیں تھا
کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

میں نے نواز شریف سے کہا کہ آپ پر یہ الزام لگتا ہے کہ آپ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو
بھی مدد آئے یا آرمی چیف، آپ کی اس سے ضرورت لگاتی ہوتی ہے۔

میری بات سن کر وہ بولے کہ آپ بالکل درست بات کہہ رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد لیڈر
ہیں جنہوں نے ہمیشہ ان آرمی چیفوں کے ساتھ نگرانی جو اپنے قانونی اور انجینیئرنگ کے مسائل میں رہنے کے
بجائے اس ملک کے سکران بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا مقصد آرمی چیفوں کو سویلین حکومت کی
دست میں لانا تھا۔ آرمی کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ ملک پر نگرانی کرنا۔

نواز شریف کے من سے فوجی جرنیلوں اور آرمی چیفوں کے خلاف سخت گھٹنیں کھڑی تھیں کہ
کہہ سرائے آپ تو خود بھی ایک آرمی ڈیپارٹمنٹ جنرل ضیاء کی بیوہ اور تھے۔ میری بات کا براہ منانے بغیر
نواز شریف نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے لیکن اس کے پیچھے 11 اوسب کی بات ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ نواز شریف اس بات پر معذرت خواہ نہیں تھے کہ آج اب وہ جمہوریت
سے ٹھیک بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے آرمی جرنیلوں کے سیاسی کردار کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے
تھے تو باقی میں وہ خود بھی جنرل ضیاء کی وجہ سے سیاست میں آئے اور وہیں سے ان کا عروج شروع
ہوا۔

تاہم، نواز شریف نے مجھے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے دو جہات بتائیں۔ پہلی
بات تو یہ تھی کہ پاکستان پر زیادہ عرصہ فوجی جرنیلوں نے حکومت کی تھی۔ جتنے بھی لوگ سیاست میں آئے
اس وقت ملک پر مارشل لا تھا۔ وہ کوئی اکیلی لیڈر نہیں تھے جو مارشل لا دور میں سیاست میں آئے۔ اگر
ملک پر فوجی حکومت نہ ہوتی تو یقیناً سیاست دان بغیر فوجی حکمرانوں کی مدد کے سیاست میں آتے۔

نواز شریف نے کہا کہ آپ کم از کم مجھے اس بات کا کریڈٹ تو دیں کہ انہوں نے طاقتور
ایلیٹس پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے ان کی کسی بھی
غیر قانونی حرکت کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ واحد وزیراعظم تھے جنہوں نے سویلین حکومت کی رت
کاٹنے کے لیے ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

نواز شریف کا خیال تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں اس بات میں کامیابی ہوئی یا
نہیں لیکن کم از کم انہوں نے یہ بات تو ثابت کی کہ وہ کسی آرمی جنرل کی سیاسی معاملات میں مداخلت
نہداشت نہیں کریں گے کیونکہ یہ قانون اور آئین کی خلاف ورزی تھی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ جنرل مشرف اکثر یہ کہتے تھے کہ اگر نواز شریف

انہیں اس کی نہ کرنے تو ہمارے ہی منہ پر ہے۔ کیا یہاں جہ کی فطرتی صورتیں ہوتی ہیں
کچھ انہیں اس بات پر چاہئے کہ انہیں حلال شرف کو اس میں نہیں کرتے جیسے تھا انہیں

ایک بیٹے کی انہیں بہت بڑی سزا تھی۔
نواز شریف نے اسے پتہ لگے میں صاحب دیا کہ انہیں اس بات پر جو کوئی کچھ نہیں ہے
کی نہیں ہے حلال شرف کو اس میں کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں ہر قسم ہراس سے بھرتی ہیں
لاڈلی بیٹی لے جایا گیا تھا۔ وہ حلال شرف کی اس بات پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ایک بھری ہوئی
ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کچھ جہان نے ہر حالت میں ہو کر رہتا ہوتا ہے اور وہ ہوتی ہیں اور انہیں
ہونا چاہیے۔

نواز شریف کے من سے یہ بات سن کر مجھے یوں لگا کہ شاید میں کسی ایک پلٹنے والے سزاوار
ہو کے ہال کا کارڈ کے مرکزی کردار سے گفتگو کر رہا تھا۔

نواز شریف نے اپنی بات جاری رکھی اور بولے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بہت سوچ بچ کر کیا اور
بہت کچھ ملک کے اہل علم میں تھا۔ ان کے پاس ایک ایسے آدمی چیف کو اس میں کرنے کا ہوا اور
تیار اپنے ہی وزیراعظم کے خلاف فوج میں ہر دیا گیا وہ کر رہا تھا۔

نواز شریف کے لیے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے جو کچھ مشرف کے ساتھ کیا اس کی انہیں
قانون اور آئین کے تحت اہلالت تھی۔ اگر وہ ایک آدمی چیف جنرل جہاگیر کرامت کو قتل کر سکتے تھے
اور دوسروں کو بھی کر سکتے تھے اگر ان کے پاس اس کے لیے مناسب وجوہات تھیں۔

نواز شریف نے انہیں سے پوچھا کہ میں اپنے اس فیصلے پر کیوں بچھتاؤں جو ہر حال سے
قانونی اور آئینی تھا۔

میں نے نواز شریف سے پوچھا کہ مجھے یہ بتائیں کیا آپ کو جنرل مشرف کی بیٹی سے بڑی کچھ
فی اور وہ یہاں ہر دمک کیسے پہنچے۔

نواز شریف نے مجھے ایک کہانی سنائی۔

جب انہیں وزیراعظم ہاؤس سے اٹھنا پڑا تو انہیں ڈیل کراپی لے جایا گیا تو وہاں کل
کوٹھی میں بیٹھے انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ کتنے طاقتور لوگ ان کی زندگی بچانے کے لیے کوششیں کر

سے تھے کہ پاکستان آرمی ایک دفعہ ہمارا اقتدار چلی ہوگی۔ اس کا ایک اور بیان وہی ہے کہ انہیں
سے سعودی عرب کے کراؤں پر جس جگہ جہاد نے نواز شریف کی سعودی اور گرفتاری کے خلاف
شعبہ جس کا ہونا تھا کہ نواز شریف کو چاہیے کہتے ہیں۔ پھر کے بعد اور پاکستان کے ہر جہاد
نے بھی انہیں یہ کہہ دینے کے لیے تھے کہ شیش شروع کر دیں۔

نواز شریف اس بات پر مطمئن تھے کہ ان کی بیٹی مدد مل حلال شرف اور جہاد جہاد کے
دہان سے پانے والی ملاہت کا سہرا جس کا ان دنوں کی اول سے کوئی حلق نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ یہاں صاحب! آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر آپ 2000 کو جہاد ہونے کے
ساتھ اسے آزادی کی حق میں بیٹے والے سیاسی دانش کے بعد پاکستان میں بیٹل میں رہے تو شاید
ہزل مشرف کے لیے چھ ماہ سے زیادہ وقت اور میں رہنا ممکن نہ رہتا۔

نواز شریف صاحب نے کہا، ہاں ممکن تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کے بیٹل میں بیٹے رہے
سے بعد صاحب بیٹل پارٹی اور پی ایم ایل نواز میں دانش ہو چکا تھا۔ جنرل مشرف کو اقتدار چھوڑنے پر
بہرہ کیا جاسکتا تھا۔ تاہم دوسری طرف یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ سیاسی قوتیں اپنی تمام کوششوں کے باوجود
ہی جنرل مشرف کو اقتدار سے باہر نہ نکال پائیں۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ نواز شریف کو اس بات کا ہرگز بچھتاؤ انہیں تھا اس وقت پاکستان
سے باہر نہیں لھٹا جاتا ہے تھا اب سیاسی قوتوں کو ان کی وہاں بڑی اشد ضرورت تھی۔

نواز شریف صاحب نے نموداری بات کا رخ بدلا اور مجھے بتائے گئے کہ میں طریقے سے

پاکستان کی فوجی حکومت نے ان کے والد صاحب کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے مسائل سے
کھینچنے کی کوشش کی تھی اس سے انہیں خاصی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ شہباز اور خاندان کے دوسرے لوگوں

کے ساتھ اپنے باپ کی میت کے ساتھ پاکستان جانا چاہ رہے تھے۔ اس وقت سعودی عرب میں
پاکستان کے سفیر لدی کے سابق چیف مہد اعرج مرزا تھے جنہیں نواز شریف نے اپنے دستخطوں سے اس

مہد سے یہ تعینات کیا تھا۔ مرزا صاحب ان سے ملنے کے لیے وہاں آئے اور انہوں نے نواز شریف کے

ساتھ پندرہ گھنٹہ تک جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ نواز شریف، شہباز شریف اور کلثوم نواز اپنے والد
کی میت کے ساتھ پاکستان نہیں جائیں گے۔

نواز شریف نے پورا پاکستان کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں۔

پندرہ دن بعد جنرل شریف نے نواز شریف کو ہندوستان لایا اور اس بات پر غور کرنا کہ ان کے پاس کیا ہے۔

وہ اپنے والد صاحب کی بہت کے ساتھ پاکستان کیس لکھوا آئے تھے۔
شرف کے من سے یہ بات سن کر نواز شریف بہت ہی بھان ہوئے اور انہیں بتایا کہ جیسا
آپ کا اپنا بھیجا ہوا سپر ہی انہیں پہنچ کر کے گیا تھا کہ وہ پاکستان نہیں جاسکتے اور اب آپ کا چہرہ
ہی کہیں پاکستان کیس لکھوا آئے۔

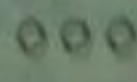
جنرل شریف نے نواز کی یہ بات سن کر اس طرح تاڑ دینے کی کوشش کی جیسے پاکستانی سپر نے
انہیں لٹل پیغام دیا تھا اور وہ ان کے خلاف شدید ایکشن لیں گے کہ اس نے کیوں لٹل پیغام ان تک پہنچایا
تھا۔ جنرل شریف کے بقول وہ دونوں بھائیوں کو پاکستان آنے کی اجازت دینے پر رضامند تھے۔

نواز شریف نے اٹا بھجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ آخر ایک سفیر کی مگر ملک کے صدر
اور آرمی چیف کا لٹل پیغام ان تک پہنچانے کا اور سب سے بڑا کہ جنرل شریف کے اس فون کے بعد بھی
اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ ان کی کب تک پاکستان واپسی ممکن ہو سکے گی۔
انہوں نے پھر مجھے ایک سیاسی ملا سٹر کے سے انداز میں جواب دیا کہ رؤف صاحب اور دکتا ہے میں کل
ہی اسٹ ہاؤس اور مجھے ہال دیکھ کر کوئی حیران رہ جائے۔

اپنی اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسٹ ہاؤس
انٹرنی کی خدمات نے 2000 میں انہیں سزا سنائی تو یہ کس نے سوچا کہ وہ پاکستانی سپر نے
ہو چکے ہائیں گے۔ اس لیے اب وہ محض اپنی انہیں اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ انہیں اس طرح
وہ پاکستان سے ہائے کی جیسا کہ انہیں اسٹ ہاؤس کے کال کر رہا ہوا ہے۔

میں نے ان کے ان ہائے کو اس وقتوں کے بارے میں بات کرنا چاہی تو انہیں جنرل شریف
شرف کے ساتھ انٹرنی پہنچے تھے۔ انہوں نے یہ جوری شہادت دی کہ وہ یہاں پہنچے تھے
میں نے ان کو اور دوسرے لوگوں کے خلاف کوئی شہادت کر کے دیا تھا اور انہیں ان کے
گمان کی پوری خبر اب دہی ہو چکی تھی جو پوری اور انہیں بہت کے ساتھ ساتھ دیکھتے تھے۔



اس وقتوں کا انہیں پتہ نہ تھا کہ وہ جن کی ضرورت ہے۔ یہاں سے انہیں لگتا ہے کہ
ہوئے ہیں لیکن آج پتہ چلا ہے کہ انہیں لگتا ہے۔ انہیں اس بات کی پوری خبر تھی کہ پاکستان میں ان
کی پارٹی کا مدت تک وہی رہتا رہا ہے اور لوگ انہیں جانتے ہیں۔ اب انہیں صرف اس وقت کا
اظہار ہے جب وہ پاکستان واپس جائیں گے اور وہاں اپنی پارٹی کی قیادت کریں گے۔ ان کے
مقابل میں نوجوان کا براہ راست حکمرانی کرنے کا انہیں یہ قلمدہ ہوا ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے کد کو سنا
کرتے ہیں کہ میاں صاحب کے ساتھ اب کمزور سیاستدان جنرل شریف کے ساتھ کھڑے ہیں جیسا کہ ان کے
بالک لینڈ ران کی پارٹی میں ہیں۔ نواز کا خیال تھا کہ وہ ابھی بھی ان سیاستدانوں کو اپنی پارٹی میں واپس
لینے کے لیے تیار ہیں جو ہو سکتا ہے جنرل شریف کے دور میں ان کے ساتھ نہیں رہے لیکن انہوں نے کل
کران کے خلاف کوئی بیان بازی نہیں کی۔ تاہم نواز شریف نے انہیں ہاتھ لگے میں مجھے بتا پاکستان
سیاستدانوں کے لیے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے جنہوں نے ان کی حکومت میں بھی حصہ لیا ہے
اور جنرل شریف کے اقتدار میں آتے ہی موقع ملے پر پہلی فرصت میں ان کی ہاتھ میں چھرا گھونپا دیا ہے
موقع پرست سیاسی لینڈ ران کے لیے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس
ہے کہ جنرل شریف ان کے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو بہکانے کے لیے مختلف جھگڑے استعمال
کرتے رہے تھے لیکن انہیں اس بات کا یقین ہے کہ شہباز شریف کبھی بھی اس طرح کی سازشوں کا حصہ
نہیں بنیں گے۔

رات خاصی دو بجی تھی۔ انفرادی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سہو کا سرواٹکس چھوڑنے سے پہلے نواز
شریف نے مجھے آخری بات کہی کہ انہوں نے بات یاد رکھنا کہ میں کسی وقت بھی پاکستان واپس لوٹ سکتا
ہوں۔

نواز شریف سے بیان دینے والوں نے 2008 میں ان کو لکھا تھا کہ انہیں اس وقت کے پاکستان
کی لکھی گئی پاکستانی اسٹ ہاؤس تھے۔ انہیں اسٹ ہاؤس کی اسٹ ہاؤس کے لیے تھے۔
نواز شریف سے یہ بات سننے کے بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ ان سے کیا ہوئی تھی۔

رہا۔ بعد ازاں میں ہوئی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں صاحب سے بھی
ملاقات ہوگی۔ 2000ء میں 9 اکتوبر کو میری ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ میں
صاحب سے ملنے کے لیے وہاں جاؤں گا۔ وہاں میں ہوں گے جہاں سے ایک سال پہلے
میں ان کے ساتھ ان کے پاس گیا تھا۔

اب میں اس شخص پر اعتماد کرنے کے لیے لندن پہنچا تو اس نے میرا ہاتھ دلا اور
کہا کہ میں یہاں سے آیا ہوں۔ صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے
ملاقات کر لی تھی۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ان کے سامنے ان کے دفتر میں آکر
ملاقات سے ملے۔ وہ وہاں سے تشریف لے گئے تھے جو وہ اس کے سرور میں تھے۔ 2003ء میں
تھے۔ وہ اب وہاں سے تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت وہ اس کے سرور میں تھے۔ اس وقت
کرنے والے تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت وہ اس کے سرور میں تھے۔ اس وقت
ایک ہفتے میں ان کے پاس تھے۔ اس وقت وہ اس کے سرور میں تھے۔ اس وقت
کئی گھر نہیں آتا۔ اس ملاقات میں شہزاد شریف بھی موجود تھے۔ یہاں صاحب نے بڑی مبالغہ سے
مجھ سے کہا کہ وہاں صاحب آپ کو پاکستان جاتے ہی کیا ہو گیا تھا کہ آپ نے بڑل شریف کے
خلاف اس طرح سے کلمہ جاری نہیں رکھا ہے آپ پہلے کرتے تھے۔ یہ ان کی مہربانی تھی یا ان کی بھول
پکے تھے کہ ان کا وہ اعتراف میرے اپنے گروپ کی نیوڈ میں نہیں ہوتا تھا۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس
گروپ پر یہ کہہ رہے تھے کہ شاہ میرے قلم میں وہاں سے نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔

میں یہاں صاحب کے احترام میں چپ رہا اور ان میں یہ پوچھ سکتا تھا کہ اگر بڑل شریف کے
خلاف وہ وہاں سے آئے ہوں تو ان کے خلاف مزاحمت کرنا ایک آسان کام تھا یا نہیں
پاکستان پہنچ کر یہاں کے تھے۔ مجھے جیسے کی محفلوں نے پاکستان رو کر ہی بڑل شریف کے ساتھ
اپنے قلم کے ذریعے شہزاد شریف کے لیے قلم سزا نہیں دی تھی۔

ایک کچھ اسی طرح کے تشریف صاحب پر پڑے تھے کہ میں انہیں پاکستان کی
ساری مہربانی کے بارے میں لے کر آیا تھا۔ میں نے کلمہ شریف کی تو کسی سرے پر شہزاد
شریف صاحب نے مجھے ڈک کر کوئی اپنی بات کی تو تشریف لے گئے انہیں فوراً کہا کہ مجھے آپ کے

جانتے تھے کہ ان کا بھی شریف سے یہاں سے ایک کلمہ تھا۔ یہ کلمہ ان کے پاس سے ہی
نہیں لے کر آیا۔

ایک ایسا شخص تھا کہ وہ شریف کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے
دفتر میں صاحب سے ملاقات کر لی۔ وہ صاحب سے ملاقات کر کے اپنے قلم کے
ذریعے ان کے پاس سے ایک کلمہ لے کر آیا۔

وہ ان میں سے ایک شخص تھا۔ اس نے ان کے پاس سے ایک کلمہ لے کر آیا۔
شریف کی طرف سے ملاقات سے تھی۔ ان دنوں میں شریف کے پاس سے ایک کلمہ
لے کر آیا۔ اس ملاقات سے ان کے پاس سے ایک کلمہ لے کر آیا۔ اس ملاقات
میں صاحب نے ان کی بات جاری کیا تھا۔ یہاں صاحب اس بات پر غور کرتے تھے۔ اپنے
پہلے ہونے انہوں نے مجھ سے اس بیان پر غور کرنے کے لیے کہا۔ میں صرف ان کا بھول
صاحب میرا خیال تھا کہ میں نے ان کی بات جاری کیا تھی۔ اس نے ان کے پاس سے ایک کلمہ
لے کر آیا۔ اس طرح کی باتیں نہیں کرتی تھیں۔ ان دنوں کے اس بیان میں
بڑے جس کا نام پاکستان کے فوجی سکرائون کو ہو گا۔ یہاں صاحب نے اس بات سے اتفاق کیا اور
ان کی طور پر یہ کلمہ جاری کیا کہ وہ اپنے بیان کی سائنٹ لکھ میں تیار کر رہے۔

میں نے یہاں صاحب میں ایک غریب شخص کی کہ وہ اپنے بھلے والے پر نہیں سے
ساری ملاقات پر اسے لیتے۔ وہ چاہے فیصلہ نہ کرے لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی کلمہ میں اپنے
دانی کے اس باتوں اور دیگر اہل اب کے ساتھ ملاقات ضرور کرتے۔

ان کی بڑی مہربانی کی دلی دعا انہوں نے مجھے بھی اپنے ان قریبی محفلوں کے قلم میں شامل
کرنے کی کوشش کی جن کا کام ان دنوں میں صاحب کو طور سے لے کر تھا۔ میں نے بڑی مبالغہ سے یہ
کہ کہ یہ دلی دعا لیا کہ وہ ان کے پاس سے یہ بات لیں کہ میں انہیں ساری طور سے
اگر ایک دفعہ میں نے انہیں طور سے لے کر تھا کہ ان کا کام انہیں لے کر تھا۔ انہیں لے کر
طور سے لے کر تھا کہ ان کے خلاف تو ان کا کلمہ لے کر تھا۔ انہیں لے کر تھا۔ انہیں لے کر
انہیں لے کر تھا کہ ان کے پاس سے لے کر تھا کہ انہیں لے کر تھا۔ انہیں لے کر تھا۔

میاں صاحب کے ہاں احمد بڑا شور شرابہ اور کھانے پینے کا دن ہوتا تھا۔ میاں صاحب کے شہدائی دور اور ان کے حلقوں سے ہر قسم کی خوراک لے کر آتے۔ سماجیوں سے لے کر سیاستدانوں اور عام لوگوں تک سب بہت بھر کر کھاتے۔ میاں صاحب اکثر ہمارے جیسے مہمانوں کی پیشکشوں میں ملے ہوئیاں یا برپائی دلاتے دیکھے جاتے۔

بینظیر اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ذیل کی باتوں نے اگرچہ نواز شریف کے ہاں غما پریشان کیا ہوا تھا، تاہم سیاستدانوں کی طرح وہ بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ بینظیر بھٹو کا ذیل کر کے پاکستان چلے جانا ہی ان کے سیاسی فائدے میں تھا۔ اگر کل کلاں بینظیر بھٹو اقتدار میں آگئیں تو یقیناً وہ طالبان کے بجائے نواز شریف کو اپنا اپوزیشن لیڈر دیکھنا زیادہ پسند کریں گی۔ نواز شریف یکپ کو یہ بھی لگتا تھا کہ بی بی کی جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی ذیل کا زیادہ فائدہ انہیں ہوگا۔ بدنامی بینظیر بھٹو کے جسے میں آئے گی جبکہ وہ بڑے مزے سے لوگوں کو بتائیں گے کہ انہوں نے ڈکٹیٹر سے ذیل نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ بات بڑے سامنے کی تھی کہ جنرل مشرف اور نواز شریف میں ذیل ہوئی نہیں سکتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں نے 12 اکتوبر کو ایک دوسرے کو ڈس مس کیا تھا۔ اب نواز شریف اور جنرل مشرف کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ساتھ مل بیٹھتے۔ بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف میں بہت ساری چیزیں کامن تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان 12 اکتوبر کی طرح کے ماضی کی کوئی زنجیر ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔

نواز شریف یکپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک دفعہ بینظیر بھٹو پاکستان چلی گئیں تو پھر انہیں روکنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بینظیر سے اپنے سیاسی تعلقات چار طرف ڈیمو کریسی کی خلاف ورزی کرنے کے باوجود ختم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بینظیر بھٹو کی ذیل میں ہی انہیں اپنی سیاسی زندگی نھر آتی تھی۔

نواز شریف اس دن بڑے خوش تھے جب 7 جولائی 2007ء کو لندن میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ وہ انہیں جہد میں مجھ سے براہ راست جنرل مشرف کے بارے میں بات کرتے ہوئے اور تھا آج پاکستان سے آئے ہوئے امین قیوم، مولانا فضل الرحمن، عمران خان، محمود خان اچکزئی اور دیگر بڑے بڑے اہل راہ کے سامنے جس طرح جنرل مشرف کو لڑ رہا تھا، یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو

رہی تھی۔ جس انداز میں نواز شریف تقریر کر رہے تھے اس سے میرا خیال ہے سب کو یہ انداز ہو گیا تھا کہ ان گزشتہ برسوں میں ان میں اور کوئی تبدیلی آئی ہو یا نہیں، تاہم وہ ایک اچھے مقرر ضرور رہی گئے تھے۔

اس بات پر لندن میں شرمیں گئی ہوئی تھیں کہ بینظیر بھٹو اے پی سی میں شریک ہوں گی یا نہیں۔ جسے میں آ رہا تھا کہ جنرل مشرف نے بینظیر بھٹو سے مذاکرات کامیاب کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ نواز شریف کے اس سیاسی شو میں نہیں جائیں گی۔ دوسری طرف نواز شریف یکپ کا یہ خیال تھا کہ وہ ضرور آئیں گی تاکہ جنرل مشرف پر دباؤ ڈال کر ان سے بہتر ذیل کی جاسکے۔

نواز شریف اور بینظیر بھٹو دونوں ایک دوسرے کو جنرل مشرف کے مارشل لا کے بعد استعمال کرتے آئے تھے۔ 10 دسمبر 2000ء کو نواز شریف نے بینظیر کا سیاسی پریشراستعمال کر کے جنرل مشرف سے ذیل کر لی تھی۔ جہد رواں گئی سے آٹھ دن پہلے ہی نواز شریف نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کے ساتھ اے آر ڈی بنائی تھی۔ بینظیر بھٹو اب وہی کچھ کرنے جا رہی تھیں۔ وہ نواز شریف کے ساتھ اپنے سیاسی اتحاد کا پریشرا جنرل مشرف پر ڈال کر ان سے بہتر شرائط پر پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ نواز شریف بھی شاید اس بات پر چپ تھے کہ چلیں، اس بہانے دونوں کا سکھ براہر ہو رہا تھا۔ اگر کبھی انہوں نے جنرل مشرف کی قید سے رہائی پانے کے لیے بینظیر بھٹو کے سیاسی پریشراستعمال کیا تھا تو آج بینظیر بھٹو بھی ان کا سیاسی دباؤ استعمال کر کے پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ میں دونوں سیاستدانوں کو ایک دوسرے سے کوئی جھگڑ نہیں تھا۔

اے پی سی کی کامیابی سے نواز شریف میں ایک نیا اعتماد آیا۔ ان کے اندر جیسے دستان نے انہیں یہ یقین دلایا شروع کر دیا کہ اب جنرل مشرف کے لیے انہیں پاکستان آنے سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اسی اثنا میں یہ باتیں پھیلائی شروع ہو گئیں کہ بینظیر بھٹو بہت جلد انہیں سے پہلے پاکستان واپس چلی جائیں گی۔ اس سے نواز شریف یکپ پر اور پریشرا حوالہ انہیں یہ چھس جھاکا کر ان کے دل سے یہ موقع نکل گیا تو پھر کیا پتہ بینظیر بھٹو جنرل مشرف کے ساتھ مل کر نواز شریف کا راستہ سمجھ کر لے گی جہاں ان کا راستہ روکنے پر تیار ہو جائیں اور انکیشن جیتنے کے بعد ہی نواز شریف کو واپس آنے والا جائے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ نواز شریف کو یہ یقین دلایا جائے گا کہ پاکستان

اب القاب کے لیے تیار ہے۔ وہ آیت اللہ مہدی کی طرح اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اتر کر چتر گھوڑوں میں جزل مشرف کا تختہ الٹ دیں گے۔ لندن میں اپنی ایم ایل نواز کے جس لیڈر سے بھی بات ہوئی وہ نواز شریف کے پاکستان واپس آنے کو آیت اللہ مہدی کے فرانس سے تہران واپسی کے ساتھ ساتھ ہارن کرتا۔

20 جولائی 2007ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے نواز شریف کو مزید پختہ کیا کہ وہ واپس جائیں۔ اب جزل مشرف دھیرے دھیرے ختم ہو رہے تھے۔ سپریم کورٹ نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو بحال کر دیا تھا۔ پاکستان بدل گیا تھا۔ اب سب سے اچھا موقع تھا کہ اس وقت پاکستان جاپا جائے جب چیف جسٹس بحال ہو چکے تھے اور فیصلہ بھی دے چکے تھے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کو پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے وطن واپسی کا پورا حق تھا۔ یوں سپریم کورٹ نے وہ ذیل سکرپٹ کر دی تھی جو بقول نواز شریف کے جزل مشرف اور سعودی بادشاہ کے درمیان ہوئی تھی۔

ایک دن مجھے لندن میں نواز شریف کے ترجمان نادر چوہدری کا فون آیا کہ میاں صاحب اپنی پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ میننگ کے بعد ڈورچسٹر ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ توقع یہی کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی پاکستان روانگی کے پروگرام کا اعلان کریں گے۔

آخر وہ وقت آن پہنچا تھا کہ نواز شریف اپنی جلا وطنی ختم کرنے کے بعد اپنے ان نامزد کردہ آرمی چیف سے مگر لینے کو تیار ہو جائیں۔

ڈورچسٹر ہوٹل میں قتل و حرے کی جگہ نہیں تھی۔ پاکستان سے متعدد صحافی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ عالی میڈیا بھی اس میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے اس ہال میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ مشہور کالم نگار عرفان صدیقی صاحب ایک کونے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کمال شفقت سے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور وہیں کھڑے ہوئے کو تھوڑی سی جگہ دی۔ تمام کیمرے اور فلاپس نواز شریف پر مرکوز تھیں کہ وہ کب پاکستان واپسی کی تاریخ کا اعلان کریں گے۔ پہلے انہوں نے ایک بیان انگریزی میں پڑھا اور پھر انہوں نے اردو میں گفتگو شروع کی۔ نواز شریف نے بتایا کہ وہ 10 مئی 2007ء کو اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اتریں گے۔ اپنی جلا وطنی ختم کرنے کے لیے نواز شریف نے جو فیصلے کر لیے وہ ان کی جگہ لگی تھیں۔ میں نے اپنے آدھ کھڑے اور ان صدیقی صاحب سے کہا کہ مراد گراہی

نہیں تو ایک بات کہوں۔ ہمیشہ بڑی محبت اور پیار سے کھٹکھٹ کرنے والے عرفان صدیقی صاحب نے فرمایا کہ بالکل ضرور!

میں نے کہا کہ صدیقی صاحب! میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ میاں صاحب جو تقریر اس وقت اردو میں کر رہے ہیں وہ آپ نے لکھی ہے۔ آپ سے بہتر اتنی اچھی اردو اور سیاسی تقریر شاید یہاں پر موجود اور کسی سیاستدان، صحافی یا کالم نگار کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرفان صدیقی مسکرائے اور بولے کہ اگر آپ نے پہچان ہی لیا ہے تو میں مان لیتا ہوں کہ یہ تقریر میں نے لکھی ہے۔

میاں نواز شریف کے 10 ستمبر کی تاریخ دینے کے ساتھ ہی لندن اور اسلام آباد میں ایک بوجھال سا آ گیا تھا۔ اسلام آباد کے حکمرانوں نے فوراً اس پر رد عمل کا اظہار کیا کہ نواز شریف کو کسی صورت پاکستان واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ وہ باقاعدہ ایک ذیل کے ذریعے دس سال کے لیے پاکستان سے باہر گئے تھے اور مقررہ مدت سے پہلے انہیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ لندن کے مذاقات میں جزل مشرف کے قریبی ساتھی بریگیڈیئر نیاز اور شہباز شریف کے درمیان ملاقاتوں کی خبریں آنے لگیں۔ سعودی اور لبنانی پیغام رساں نواز شریف سے ملنے لگے لیکن لگتا تھا جس طرح نواز شریف نے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا اس پر انہیں سعودی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ نواز شریف نے بھی ایک دن یہی بات ہم صحافیوں کو بتائی کہ ان پر سعودی حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے جزل مشرف سے براہ راست کوئی ذیل نہیں کی تھی۔

لندن آئے ہوئے تمام سیاسی لیڈروں کو واپس پاکستان بھیجا دیا گیا کہ وہ جائیں اور نواز شریف کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ صحافیوں کی فہرستیں بننا شروع ہو گئیں کہ پاکستان سے کون اور کہاں سے آئے گا۔ لندن سے میاں صاحب کے ساتھ کون کون سے صحافی جائیں گے۔ اپنے پروگرام کو خیر رکھنے کے لیے جن مختلف ایئر لائنز پر سیٹوں کی بکنگ کرا دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز شریف کے شاف کے لوگ اور عمران اور محمد افضال اس کام میں زبردست تھے۔ انہوں نے آخری لمحے تک اس بات کی ہانکی کوٹیں لگتے رہی کہ انہوں نے کوئی ایئر لائن پر کسی کو بکنگ کی ہوا تھا ان کے صحابیوں سے ہوئے اور یہ حقائق تھے لیکن عمران اور محمد افضال نے نواز شریف کے ملاقات میں اس راز کو آخری لمحے تک راز رکھا کہ ان صاحب نے اپنی اسے ایئر ٹیکٹ ایئر لائن سے جاری کی تھی۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔

سواری پر اس کی اسلام آباد آئے۔ اس نے نواز شریف کو ایک ہونہال بھیجا۔
 اس نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔

اس دفتر میں پہلی خوفناک جمیدگی نے ہم صحافیوں کو بھی مسکرانا بھلا دیا تھا۔ ہمیں کچھ نہیں آ رہی
 تھی کہ کل 10 ستمبر کو میاں صاحب نے پاکستان روانہ ہونا تھا اور آج 9 ستمبر کو وہ ایمر جنسی میں پریس
 کانفرنس ہلا کر بات چیت کرنا چاہ رہے تھے۔
 کیا نواز شریف سعودی شہزادے کے پاکستان آنے کے بعد اپنا پروگرام تبدیل کرنے والے
 تھے۔

یہ سوال ہم سب صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ نواز شریف اب
 پاکستان واپس نہیں جائیں گے۔ شہباز شریف بھی ان کے ساتھ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ کیا دونوں
 بھائی یہ انور اکبر سمجھتے تھے کہ وہ ایک دفعہ پھر گرفتار کر کے جیل جہاں سے بڑی مشکل

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔
 میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس طرح کی بات کہی ہوگی۔

میں ہم سب کا خیال تھا کہ نواز شریف ایک بہت زیادہ سیاسی شخص ہیں۔
 شہباز شریف Do or die کی سیاست کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اب حرج پاکستان سے رہے جس
 انہیں اپنی سیاسی خودکشی نظر آ رہی تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ان دنوں کو ابھی پر گرفتار کر کے جیل بھیجا دیا تو کیا ہوگا۔
 میں نواز شریف کے دفتر کے ایک کونے میں بیٹھا یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر میں
 پریس کانفرنس شروع ہوگئی۔ اسلام آباد سے آنے والے دہائیوں نے نواز شریف کو ایک ایسی سیاحت
 کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا احساس انہیں 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ایئر پورٹ پہنچنے سے پہلے ہی
 ہو گیا تھا۔

جب نواز شریف نے گفتگو شروع کی تو لگ رہا تھا کہ وہ راحت کے سوا کچھ نہیں تھے۔ وہ اب
 پیچھے آنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سعودی حکمرانوں کو بھی ناراض کرنے پر تیار تھے۔ اب ان کا راستہ نہیں
 رہا جاسکتا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن جب میاں صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تو
 سے یہ پڑھنا شروع کیا کہ ان کا جرنل شرف کے ساتھ باہر رہے گا سواہر پانچ سال کا تھا کہ کئی سال
 کا تو ہم سب چونک پڑے۔ ہمارے خیال میں یہاں صاحب ایک ایسی بات کہہ گئے تھے جس کا خیال
 انہیں سیاسی طور پر جھٹکتا ہوگا کیونکہ اب تک ان کے چھلے آٹھ سالوں میں وہ مکہ اور مدینہ میں جہاں کہیں
 کھاتے رہے تھے کہ انہوں نے جرنل پرویز شرف سے کوئی ٹیلی فون کی تھی اور آج وہ سب کو یہ بتا
 رہے تھے کہ ان کی اہلیں پانچ سال کے لیے تھیں۔

پاکستان میں تمام فی وی جیکل اس وقت موہاں ٹیلی فون کے ذریعے نواز شریف کی یہ تاریخ تک
تکرر ہے تھے۔

میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سعودی شہزادے کا اسلام آباد میں رہنے
کے لئے وہاں لے جانے کا اظہار کرنا پاکستان کی خود مختاری پر ایک ضرب نہیں ہے۔
میاں نواز شریف نے میری طرف دیکھا اور انہوں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ تاہم وہ
دیکھ بھی پاتے تو نہ دے پاتے۔

نواز شریف صاحب اور ان کے حامیوں کا خیال تھا کہ پانچ سال کی ایل کی بات کر کے وہ اپنی
واپس کا براہِ عملہ کر لیں گے۔ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی ان دنوں
ہاٹکوں سے لگے کر دیا تھا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے ساتھ کوئی ایل نہیں کی تھی اور آج اسی سپریم
کورٹ اور پاکستان کے محام کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ ایل تو ابھی نہیں دس سال کے لئے نہیں لگے۔
سال کے لئے تھی۔

وہی بات اور اس کی توقع تھی۔ جنرل مشرف اور ان کی کابینہ کے وزیروں نے اسلام آباد میں
آسمان سر پر اٹھایا۔ وفاقی وزیرِ خارجہ سب سے آگے تھے۔ ہائی وزیروں نے بھی میاں صاحب پر
ٹھن کرنی شروع کی کہ دیکھیں آٹھ سال تک وہ بھڑے ہوئے۔ یہ کہ انہوں نے ایل نہیں کی تھی اور
آج وہاں سے ایک دن پہلے انہوں نے نوادہ پل زہان سے یہ اعتراف کر لیا تھا۔

ہوں پاکستان میں بارہ گھنٹے کے اندر رات نواز شریف کے اس اعتراف کو اس طریقے سے لڑال
مشرف کے وزیروں نے استعمال کیا کہ ملی ایم ایل کے لیڈروں اور وکروں کا سارا جوش ہائی حد تک
غلط ہو گیا اور اسے عام ہائی حد تک جنرل مشرف کے حق میں ہموار ہو گئی۔

میں نے پریس کانفرنس سے نکلنے کے بعد نواز شریف کے قریبی ایڈر سے یہ کہا کہ منظور اب
کچھ اور مشورہ میاں صاحب کو کس نے دیا تھا تو انہوں نے نہایت سیاسی جواب دیا۔ بولے کہ یہ سب کا
مشورہ کہ فیصلہ تھا اگرچہ وہ ایک لوگ اس کے خلاف تھے لیکن میاں صاحب کا خیال تھا کہ وہ کوئی بھڑت
نہیں بول رہے تھے۔ وہ کہتا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ ایل جنرل مشرف اور سعودی حکمرانوں کے درمیان
ابھی تھی جو کہ پانچ سال کے لئے تھی۔ یہ ایل نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان نہیں تھی۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ادب سے کہا کہ حضور اب آپ یہ بات پاکستان میں کس کو رکھ
یہ کہ انہوں نے سمجھا ہے کہ یہ ایل جنرل مشرف اور سعودیوں کے درمیان تھی اور نواز شریف کو
اس کی خبر آج آٹھ سال بعد لندن میں بیٹھ کر پہلی دفعہ ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ ساہیوال کے
پریس کنفرانس پر اقبال کا شعر شاید اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا کہ

بھڑت ۱۱ ہے تو قائم بھی اس پر دلو نظر

آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے۔

میں نے کہا کہ صاحب اگر آٹھ سال تک یہ بھڑت ہوا تھا تو اگلے بار کبھی بھی اس بھڑت پر
قائم رہے۔ کیا ضرورت آئی تھی کہ آپ خود بیٹھ کر اس کا اعتراف کر لیا کہ ایل پانچ سال کے لئے
تھی۔

جہ کہان سے اٹھ چکا تھا۔ نواز شریف کے حامیوں کا انہوں نے کہا تھا کہ اسلام آباد میں
ہو گیا پاکستان نواز شریف کا اشتہال کرنے کے لئے آئے گا۔ انہیں انہی نے اپنی ایل دیکھ لی تھی
نہیں کہ جس نے ان کو دیا تھا۔

نواز شریف نے نوادہ پل زہان صحافیوں کی گروپ ہال میں انہوں نے ان کے ساتھ اسی جہاز
میں سفر کیا تھا جس میں وہ اسلام آباد آئے والے تھے۔ کسی صحافی کو کوئی پتہ نہیں تھا کہ کون سے جہاز پر
میاں صاحب سفر کریں گے۔ ہم صحافیوں کو کہا گیا کہ ہم یہ جہاز دیکھ رہے تھے کہ جہاز کی جگہ۔ میں اور
اس نواز جیکل کے ارشد شریف اسٹیفن ایڈر پارٹ پٹیل۔ ہم دونوں نے اسی جہاز میں سفر کیا تھا جس میں
دونوں میاں برادران نے جانا تھا۔ ہوائی اڈے پر ہزاروں ڈروں تھا۔

علامہ مصطفیٰ کمر بھی پاکستان سے مخصوص طور پر لندن پہنچے تھے۔ ان کا وہاں آنے کا ایک ہی
مشورہ تھا کہ دنیا بھر کے کمرے وہاں اکٹھے ہوں گے اور فی سکرین کے کسی کوئے کمرے میں میاں
صاحب کے پیچھے ان کی شکل بھی نظر آ جائے گی۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی تھی کہ کچھ بائبل علامہ مصطفیٰ کمر
کی بڑی جیہندہ درانی سے شہباز شریف نے شادی کی تھی اور آج کمر صاحب اپنی سابقہ بیوی کے لئے
شوہر کو لندن سے اسلام آباد لانے کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔ جس غیرت اور عزت کا مظاہرہ کمر

میں نے اس سے ہمہ تن ہوشیاری سے بچنے کے لئے یہ باتیں یاد رکھیں
 ہیں کہ اس کی باتوں میں کوئی عقل و حکمت کے لئے اس سے کبھی بات نہ کرو
 اور اس کی باتوں سے غور و فکر نہ کرو اور اس کی باتوں سے غور و فکر نہ کرو

مذہبی گروہوں کی ایک جگہ کر رہے تھے جیسے وہ اسلام آباد میں ہو کر لوگوں کو آکر نہیں بھاگنے دے
تھے۔ اپنے گروہوں کا کام یہ تھا کہ ان کے لیے وہ فواد شریف کو ضرور دیکھنا سے پاکستان سے باہر لے
گئے۔ وہ اسلام آباد میں ہونا کو اجازت دیا، جیسے ان کیلئے کے ہاتھوں پھانسی لگنے سے اس لیے نہیں بھاگنے دے
کہ انہیں اپنی جان عزیز تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ اب کی دیکھ وہ ضرور فواد شریف کو اجازت دے گا کہ ان کے ہاتھوں پھا
کر ضرور پاکستان لے جائیں گے۔

مجھے مصطفیٰ کمری دسترخوان پر پاؤں پر حرکتیں دیکھ کر بڑی ہنسی آ رہی تھی کہ کچھ سال کی عمر میں
 بھی مصروف ایک بڑھی نامیکہ کی طرح اپنے جوان عاشقوں سے تھوڑی سی توجہ لینے میں مصروف ہے۔
 مصطفیٰ کمر سے زیادہ مجھے نواز شریف اور شہباز شریف کی مقتل پر ہنسی آ رہی تھی جنہوں نے بغیر انکوں
 اور دم کے اس کاغذی شیر کو اپنے ساتھ جہاز میں لے جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

وقت کیسے بدلا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایسے ہی جب اپریل 2004ء میں آصف زرداری دہلی سے لاہور کے ایئر پورٹ پر صحافیوں کے جھرمٹ میں اترے تھے تو جو شخص سب سے پہلے زرداری صاحب کے لاہور میں واقع گھر پر ان کی پریس کانفرنس میں پیچھے کھڑے ہونے کے لیے پہنچا تھا۔ وہ اور کوئی نہیں مصطفیٰ کھری تھے۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر کھر صاحب کو جلا وطنی سے واپس آنے والے بریڈر سے کیوں محبت ہو جاتی ہے کہ وہ ہماگ کر ان کی پریس کانفرنس کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہا یہ کمروں کے آگے آنے کا ایک نیا سیاسی ٹرک تھا جو پچھتر سال کی عمر میں کوٹ ادو کی دھرتی کا یہ پوتہ ہی کر سکتا تھا۔

۱۴۔ ہم مجھے شہید الشریف اور مصطفیٰ کمر کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے کے بعد واپس پورٹ پر پہنچے اور دیکھا کہ یہ کچھ نہیں آ رہی تھی کہ جیسے وہائی نے مصطفیٰ کمر کو چھوڑ کر شہید الشریف سے کیوں شہادی کر لی تھی یا یہ بھی ممکن تھا کہ جیسے وہائی بھی سیاستدانوں کے ساتھ رہے ہوئے یہ کچھ گئی تھی کہ ہر کچھ انھیں کو چاہئے ہے۔
۱۵۔ راج کو سلام کر رہا ہے۔ مصطفیٰ کمر کا سیاسی بلوچ کہہ کا ختم ہو چکا تھا اور شہید الشریف کا ابھی ہاتھی تھا۔

یہاں کوئی اور ایسی کافیل نہیں رہا اور کھانا بھی نہیں تھا، خصوصاً سب سے زیادہ شریفانہ اور معنی کی کمر لہوں کی سزا کوئی
 دیکھوں جس کا قصہ دانی کرنا پڑا، میں وہاں ایسی کچھ نہ کر سکا کہ اس سے بچے۔
 دفتر و ایجنسی پر مشتمل ایسی کچھ نہیں کیا گیا تھا کہ ہم نے کوئی ایسی بات نہ کی کہ وہاں کوئی کارروائی ہو

کہانی میں خوش اسلوبی تک موجود ہے۔

ہیں یہ نہیں تھا کہ اب اصل سر پر انڈا شروع ہوئے والے ہیں۔ کہانی میں پہلے موزاں دیکھ
آجانب میں کہا گیا کہ آپ لوگ ملی آئی اے کے کاؤنٹر پر جا کر اپنے بورڈنگ کارڈ لیں۔ کوئی سوچی بھی
نہیں سکتا تھا کہ نواز شریف ملی آئی اے کی فلائٹ سے اسلام آباد کا سفر کریں گے۔ سب کو اس بات کا
خوف تھا کہ ممکن ہے کہ نواز شریف کا علیحدہ اسلام آباد نہ اترنے دیا جائے اور اس کا رخ پشاور یا لاہور موز
دیا جائے اور وہاں سے انہیں سعودی عرب بھیج دیا جائے۔

ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس فیصلے کے پیچھے کیا وجہ تھی کہ نواز شریف کا جہاز ایک
 لے رہے تھے۔ میں نے ارشد شریف سے کہا کہ میرے ذہن میں نواز شریف کے فیصلے کی ایک ہی وجہ
 آتی ہے کہ وہ جنرل مشرف پر ایک نفسیاتی وار کر رہے ہیں۔ نواز شریف کو یہ تھا کہ جنرل مشرف ان کے
 غیارے کا رخ کسی اور سمت میں نہیں موڑیں گے۔ جنرل مشرف نے پاکستان میں مارشل لا ماس خلیا اور
 لگایا تھا کہ سری لنکا سے کراچی آنے والی بی آئی اے کی فلائٹ کو نواز شریف نے نہیں اترنے دیا تھا۔ اگر
 پچھلے اور گزرتے تو شاید وہ غیارہ کر لیں کر جاتا۔ آج اگر نواز شریف کا غیارہ موڑا گیا تو جنرل مشرف
 پر وہی الزام لگ سکتا ہے جو نواز شریف پر لگا کر انہیں ملک بدر کیا گیا تھا۔ میں جنرل مشرف کو بھی یہ
 دیکھ نہیں لیں گے کہ بی آئی اے کی پرواز کا رخ کسی اور سمت موڑ دیا جائے اور جس خلیا پر انہوں نے یہ
 مارشل لا لگایا تھا اس کا جہاز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

جب ام اسلام آباد لہذا ہوا تو اس نے قومی مدرسہ شریف کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا کہ
قادر شریف نے جہاں شریف کا دہریں مچا دیے صاف کھارے کو کم از کم اسلام آباد تو ضرور ہوتے دیکھا
ہائے گاہیں کے بعد جو اہلکار دیکھا جانے لگا۔

اسلام آباد کی سے قتل کی خبر پر ہر مسلمان کا دل لرز گیا ہے۔

کاروانے کر جہاز کی طرف جارہے تھے تو میں نے اپنے آگے کچھ دھکیلے پر ایک بھیلر بکھی۔ ہم آگے
 گئے تو شہباز شریف کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اسحاق اور ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے ان کو
 شریف سے حیران ہونے کو یہ کیا ہوا ہے۔ تو ان شریف شہباز شریف کو وہیں چھوڑ کر جہاز کی طرف
 چلے گئے تھے۔

کہانی میں ایک اور سوز آچکا تھا ایک اور سر پر اثر ہوا تھا۔

میں ابھی پوری بات بگھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ شہباز شریف نے مجھے کہا کہ کھانا صاحب
 آپ ہی بھائی صاحب کو کھانا نہیں کہہ دیا کرتے ہیں اور مجھے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔
 میں نے پوچھا سر کیا ہوا ہے؟

شہباز شریف صاحب ہوئے کہ میں صاحب نے مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے کر جانے سے
 انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اکیلے جاتے ہیں گے۔ انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ میں شیخ سے واپس
 لوٹ جاؤں۔

مجھے ایک لمحے میں پوری کہانی سمجھ آ گئی۔ یہ ایک اور سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا اور میرا خیال ہے
 یہ ان کا درست فیصلہ تھا کہ وہ ان کو پاکستان واپس نہیں جانا چاہیے۔ اگر وہ وہیں بھائیوں کو گرفتار
 کے قتل میں داخل رہا جائے تو پوری دنیا کو برا انتظام ہوتا اور اگر وہاں سے انہیں جہاد بھیجا جائے تو بھی ان
 کی پارٹی ہر سے اہم سیاسی موقع پر اپنے لیڈروں سے محروم ہو جاتی۔ اس لیے یہ سوچا گیا تھا کہ صرف
 شہباز شریف پر ہی دھک لگائے تاکہ اگر وہ قتل ہاتھ میں لے جائے تو کم از کم شہباز شریف ان سے الٹی
 پارٹی کو چھوڑ دے۔

اس لیے کوئی شک نہیں تھا کہ ان دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ ایک دور پہلے ہی کر لیا تھا لیکن
 ایسا ہر گز نہ ہوا کی روایت سے بلکہ یہ پہلے شہباز شریف کو روک کر منع کرنا اور اسے کے ایک ایسے طاقت
 کا تصور تھا کہ ان میں باطن کی توقع کے خلاف کہانی میں ایک ایسا موڑ آ گیا تھا جسے اہم کرنا
 مشکل لگ رہا تھا۔ مگر پارٹی کے لیڈروں کو یہ پتا چلا کہ شہباز شریف نے آخری لمحے میں شہباز
 شریف کو اپنے ساتھ پاکستان جانے سے روک دیا تھا جبکہ ایک اور لمحے کو بھی نظر آ رہا تھا کہ یہ فیصلہ ایک
 اور اسے کا سر ہٹ تھا جس پر دونوں بھائی ہالی ووڈ کے آکر اپنا راز یافتہ اور کارروں کی طرح پوری

جہاز میں سے مل کر رہے تھے۔

میرے بس میں ہوتا تو میں اس موقع پر شہباز شریف کو بھیجا ہوتا کہ وہ اس وقت کے
 وہ بھی موت سے ہم کو کون کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہاں صاحب نے انہیں آخری لمحے
 میں مع کر کے ان کے ساتھ روانہ کی ہے۔

جب ہم جہاز کے اندر پہنچے تو وہاں ایک اور سر پر اثر ہوا تھا کہ جہاز

جہاز کے چلنے میں خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ اس کا ایک بڑا چارہ کسی سمارٹ کوئل کا دورہ چاہے۔
 میں اور شہباز شریف جہاز کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اسے یہ سیٹیں راستے کب
 ختم ہوں گے۔ ارشد نے حیران ہوا اور بولا کہ اس میں راستے کی کیا بات ہے ایک شخص کوئل کا دورہ چاہے
 ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ راز دار ہے۔

میں نے کہا بھائی جان! آپ ایک بات پر غور نہیں فرما رہے کہ جہاز کی روانگی میں ہاں بوجھ
 کرنا غیر کی جارہی ہے۔ اگر یہ جہاز اپنے مقررہ وقت پر یہاں سے روانہ ہوتی تو صبح آٹھ بجے سے پہلے
 اسلام آباد ایئر پورٹ پر اتر جائے گا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ صبح آٹھ بجے تو شہباز شریف کو چلنے کے
 لیے ایئر پورٹ پر کتنے لوگ موجود ہوں گے۔ لہذا اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ جہاز یہاں سے کم از کم
 ایک دو گھنٹے لیٹ روانہ ہو تاکہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترتے اترتے ان کے اس کیا روٹی جائے تاکہ
 ان کی وہ بھی تو شہباز شریف کے لیڈر اور پارٹی اور گرو ایئر پورٹ پہنچ سکیں۔ اگر تو شہباز شریف کو روانہ ہونے
 جانے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیڈر اور گرو گرو اسلام آباد ایئر پورٹ میں داخل ہو کر یہ کوشش کامیاب
 ہو جائے گی۔

خاصی تاخیر کے بعد جہاز وہاں سے روانہ ہوا۔ یہ پتا چلا کہ مجھے اصغر نے اسے جہاز کے
 پہلے ہی میں آگئے۔ وہ تھا مجھے پتا ہوئی اور خوش تھے۔ وہ پاکستان کے اسے اسے کے بعد جہاز میں ختم کر
 گئے وہاں صاحب کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ سر کی آواز تو آپ نے ایک
 کے بعد دوسرا سر پر اثر دے کر سنا لیوں کے علاوہ اسلام آباد پہنچے اور بے نظروں کو بھی پریشان کر دیا
 ہے۔ میں نے کہا کہ ادارہ ایلی چاہیے اس شخص کو اس نے بیٹھ کر یہ پورا سکرپٹ لکھا تھا اور بدشاہ باب تک
 کے حالات کے مطابق ان کی حکمت عملی بہت اچھی جارہی ہے۔

جہاز میں چڑی رات کوئی نہیں سو یا سوائے میاں نواز شریف صاحب کے اس میں تیراں بھرنا تھا
 کسی ایک شخص کیساتے آرام سے جہاز میں سو سکتا ہے خصوصاً جب یہ پتہ نہ ہو کہ اس کی انگلیں جھل
 اسلام آباد ہے، انکے کا قہقہہ یا پھر جہاد کا سرور نہیں۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص خیر کی دہائی میں نہیں گھر
 سکتا تھا اگر اس کے ذہن پر غیر فحشی صورتحال چھائی ہوئی ہو۔ نواز شریف نے ہم سب کو غلط ثابت کر دیا
 تھا۔ دوسرے سے اس سے جس کا اس میں اپنی خیر پوری کر رہے تھے۔

○○○

سات گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد اندیشوں اور انہجانے خوف میں گھر سے اس طیارے کے
 مسافر اب اسلام آباد کی فضاؤں میں سب سے پہلے گئے تھے۔ خبر آئی کہ نواز شریف صاحب جاگ گئے
 ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ تھوڑی دیر میں جہاز کی کچھلی سائیڈ میں آنے والے ہیں۔ جہاز میں ایک عجیب سی
 بے چینی اور خوف کا عنصر لہا ہوا تھا۔ کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر نواز شریف کا
 کس طرح کا استقبال ہونے والا تھا۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ صحافی بھی اسے ہی
 زوں اور کسی حد تک خوفزدہ تھے۔ ہمارے ذہنوں میں لاہور ایئر پورٹ پر پرویز الہی کی پولیس کے
 ہاتھوں شہباز شریف اور آصف علی زرداری کے ساتھ آنے والے صحافیوں کی درگت کے مناظر بھی
 تازہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ تزلزل شریف بھی ان صحافیوں کو یقیناً سزا دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے جو
 نواز شریف کے ساتھ لندن سے آ رہے تھے۔ خیر، نواز شریف نے بھی بڑی فطرت کی قیامی کہ انہیں غفلت
 میں نہ لے سکے لوگوں کو اپنے ساتھ لانے تھے تاکہ ان کی نظروں کے سامنے ہی سب کچھ ہو۔

جب جہاز اسلام آباد کی فضاؤں میں داخل ہوا تو نواز شریف آ کر جہاز کی درمیانی سیٹوں پر
 بیٹھ گئے۔ ان کے ارد گرد ان کی پارٹی کے لیڈر اور صحافی کھڑے ہو گئے۔ شد چلے گئے وہاں شروع ہو
 گئی۔ انکی دیر میں نواز شریف نے کسی سے سچا گفتگو نہیں کیا اور مختلف فیہر گھمانے لگے۔ کسی نے میرے
 کان میں سرگوشی کی کہ وہ اسلام آباد کی طرف آنے والے اپنے لیڈروں کے لیے ہمارے ہیں تاکہ ان
 سے بچا جاسکے کہ یہ بے تکلف و انجمن کا استقبال کرنے کے لیے جمع ہو چکا ہے۔ ہر حال ملانے کے بعد
 میاں صاحب کے پیر سے کارنگ فٹ ہو چکا ہے اب اس لیڈر کا سوا کچھ نہیں رہتا۔ آج وہ اس لیے رات

کرتے کے بعد میاں صاحب نے اپنے سچا گفتگوں اور ایک طرف کھینچی۔
 نواز شریف کی کہانی اسلام آباد کی فضاؤں میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ
 رہیں ہو گئے تھے۔ انہیں ایئر پورٹ پر پہنچنے کے لیے سب تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔

جب جہاز اسلام آباد کے رن وے پر اترا تو ہمیں دور سے ہی نظر آ گیا تھا کہ اسلام آباد آج
 پنجاب پولیس کے کمانڈر کے ترے میں تھا جہاں کسی چٹا کو بھی ہمارے کی اہلالت نہیں تھی۔ میں اور
 ارشد احمد نے لگانے لگے کہ وہ کھڑے کون سے جہاز میں سموی شہزادہ اس جہاز سے نواز شریف کے
 اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب پی آئی اے کا جہاز اپنی مقصد پر جا کر کھڑا تو ہمیں چاروں طرف کالی
 دروہوں میں ملیں پنجاب پولیس کے کمانڈر کی کمانڈ ورنظر آئے۔

میں نے ایک بڑی عجیب بات نوٹ کی کہ اس وقت صحافیوں کی اکثریت ہڈیاتی طور پر نواز
 شریف صاحب کے ساتھ مل چکی تھی۔ ایک نیلی وین میں کچھ کامیور اسکرتو اس وقت باقاعدہ میاں
 صاحب کا ہاؤس کا روبرو بن گیا تھا۔ یہی صاحب شوکت عزیز کے بھی سب سے قریبی دوست تھے۔ وہ اس
 وقت میاں صاحب اور ان کی پارٹی کے لیڈروں کو ہدایات دینے میں مصروف تھے کہ اگر پولیس کے
 کمانڈر جہاز میں زبردستی داخل ہوتے ہیں تو انہوں نے کیسے میاں صاحب کی حفاظت کرنی ہے۔ اس
 نے کہاں پوزیشن لیٹی ہے۔ اس وقت وہ ایک اسکرتو پر سوار ہوا ایک تربیت یافتہ پولیس آفیسر کے
 رہے تھے جو ہر قیمت پر میاں صاحب کو پولیس کے ترے سے نکال کر ایئر پورٹ سے باہر لے جانے پر
 تیار تھے۔

جہاز کے دوسرے عام مسافروں کو جانے کی اہلالت دہی گئی تھی اور جہاز میں صرف وہی
 رہے تھے جہاز شریف صاحب کے ساتھ لندن سے آئے تھے اور ان میں ایک تربیت یافتہ پولیس آفیسر کی بھی۔
 ہم صحافیوں کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ تزلزل شریف نے نواز شریف سے ملنے کے لیے کیا کھات گئی تھی
 رہا ہے۔ جہاز کے بعد نواز شریف کے ساتھی بھی گئے اس وقت تزلزل شریف نے ہم اہلالت کے لیے
 کی ہم دہی نہیں کر سکیں گے اور نواز شریف کو ہدایات دینے کا کام سب کے ذہنوں میں چٹا کہ
 اہلالت نہ ہو وہ میاں صاحب کو کرتا کر کے سب کے مختلف خدمات میں کمک نکل بھی دیا جانے کا۔
 نواز شریف نکل جانے کے لیے تیار تھے کہ کس میں انہیں اپنی رہا ہو رہی تھی اور سب سے

کتابخانه جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

ارشاد شریف نے میری طرف دیکھا اور سٹپ کر رہا کہ وہ فاقہ تمام مشکلات تھما دیا۔
جہاں آ کر وہ ایسا خیال تو اب تک ہی انجام میں تھا کہ کسی بھی لینڈ کو نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے اس کو
کو یہ مشورہ دیا ہے۔

میں نے ارشد سے کہا کہ تم دیکھ لینا نواز شریف شکرانے کا یہی سبب یہ سجدہ نہیں کریں گے اور
دوسرے میں نواز شریف کے اس شکرانے کے سجدے کو ایک سیاستدان کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتی کی
آنکھ سے دیکھ، ہاں اس کا عوام پر کیا اثر پڑے گا۔
ارشاد شریف نے مجھے کہا کہ تم جا کر یہ بات نواز شریف کو کیوں نہیں کہتے۔

میں نے کہا میرے پیارے! میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں میں صحافی ہوں کوئی سیاسی ورکر نہیں کہ ایڈیٹروں کو جا کر مشورے دیتا پھر دوں۔ میاں صاحب میں اتنی سمجھ بوجھ خود ہونی چاہیے کہ جب وہ آٹھ سال بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو انہیں جہاز کی سیزھیوں سے اترتے ہی پہلا کام کیا کرنا چاہیے۔

میں اور ارشد شریف نواز شریف کا ایک ایک قدم گن رہے تھے۔ اب ہم دونوں کی دلچسپی اس بات میں زیادہ ہو چکی تھی کہ نواز شریف نیچے اترتے ہی سجدہ کریں گے یا نہیں کہ ہم ایک لمحے کے لیے اپنے ارد گرد کا سارا ماحول بھول گئے تھے۔

آخر کار شریف آخری میز می سے بچے اترے۔ ان کے ارد گرد ان کی پارٹی کے جیالے نہیں کسی موقع کی تلاش سے بچانے کے لیے تیار تھے۔

نواز شریف نے وہ موقع نہ تو دیا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں خدا کے آگے جھک کر اس جہی کو چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس کا انہیں بے پروا سیاسی فائدہ ہوتا لیکن شاید جس نے ان کی استدعا سے اسلام آباد والوں کا سر ہٹ لکھا تھا اس میں وہ یہ سین ڈالنا بھول گیا تھا یا یہ اس کی ترجیح میں نہیں تھا۔ نواز شریف نے اپنی دھرتی ماں کو گلے نہیں لگایا اور دھرتی ماں بھی شاید اس سے روٹھ چکی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز شریف کو پنجاب پولیس کے کمانڈر ذوق نریا قسیٹے ہوئے دی آئی پی ٹی لاؤنج سے ایک پرانی بس میں بٹھا کر شہر لاٹے مقرران کے جہاز میں بٹھا چکے تھے۔

چند سالوں کے بعد ایک دفعہ اس حالت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ شریف صاحب کی اس
میں جو کہ ایک بہت بڑی فوج میں جائیں گے جس میں سارے صحافی ہوں گے وہ ایک چھوٹی سی
آئی پی کوئسٹر میں بیٹھیں گے جو ان کے لیے اپنی کئی قسمی۔ لوگ شریف اور ان کے حامیوں کو ایک ہی جگہ
نظر آ رہا تھا کہ اس چھوٹی کوئسٹر میں بیٹھ گئے تو یہ ممکن تھا کہ انہیں اپنے پاؤں کو دیکھ سکیں اور ان کے
میں کھڑے ایک اور جہاز میں بٹھا کر جہاز لے جائیں گے۔ تو بڑے سے بڑے دستوں کے اور لوگ
بڑے ہائی پوس میں آ کر بیٹھ گئے۔

اب تک کی کارروائی سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ شراب اپنی باری پہنچے تھے انہیں
انہوں میں جس انقلاب کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ختم ہو
چکی تھیں۔ اسلام آباد ایئر پورٹ پر انہیں لینے کے لیے پارٹی کا ایک لیڈر یاہر کر تک پہنچا نہیں تھا۔
پارٹی کے تمام لیڈر ران اور ورکرز ایک رات پہلے ہی پولیس کو جا کر گرفتاری دے چکے تھے۔ وہ وہاں شراب
کے لیے نوٹ دے کھا کر ایئر پورٹ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب نواز شریف کا زیادہ تر انحصار اس پاکستانی اور غیر ملکی میڈیا پر تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ بڑی پٹنے دیکھ کر ان کے اپنے قریبی ساتھیوں کے چروں پر بھی خوف و ہراس کی نگاہیں صرف نظر آ رہی تھیں۔ اگر کسی شخص کا حوصلہ بلند تھا تو وہ نواز شریف کے ساتھ آئے ہوئے لندن کے سربراہ ملک تھے۔ نواز شریف کے لندن کے آفس کے ساتھی محمد افضال بھی نواز شریف کی حفاظت کے لیے اپنی جان دینے پر تھے ہوئے تھے۔ سربراہ ملک جن کا تعلق فیملی آباد سے ہے وہ جہاز کے اندر بھی نامی دیگر ایئر لائن افسران سے قانونی معاملات پر لڑتے جھگڑتے رہے تھے۔ اب ملک کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا جب وی آئی پی لائف لائن میں نواز شریف اور جنرل مشرف کے جیسے ہونے انکس کے درمیان آخری لڑائی شروع ہونے والی تھی۔

دی آئی پی لاؤنج میں کھینچے ہی ہمیں یکدم محسوس ہوا کہ شاید کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہم لندن سے ایک عام مسافر فلائیٹ میں ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ہم کوئی بڑے دی آئی پی لوگ ہیں جن کے لیے جس اور ہائے پائی لاؤ جارا ہا ہے۔ وہاں کچھ اس طرح کا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ یکدم سب لوگ ریٹیکس ہو گئے۔ کئی گھنٹوں پر محیط اندیشے اور غور اچانک ختم ہو گئے تھے۔ صفائی بڑے ریٹیکس ہو کر صفوں پر بیٹھ

کے لئے سوئے۔ جب کہ انہیں کھانا نہ ملا تو انہوں نے کھانا کھانے کے لئے سوئے۔

نور ثریف بھی مسجد کے سامنے کے ساتھ ایک سوئے پر چڑھ گئے تھے۔ انھیں بھی جہاز
بنت ہو جس وقت کیا تو ان سے داخل میں چھائی ہوئی لکھی گئی جہاز بند ہو گئی تھی۔
مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ حکومت کی کیا نئی حکمت تھی۔ کیا واقعی
نور ثریف کو ایڑ پھرتے سے لٹکے کی اہلات دیدی جائے گی یا پھر کسی مناسب وقت کا انتظار کیا جائے گا
کہ نور ثریف پر کمانڈر انکیشن کر کے انھیں ایڑ پھرت پر کھڑے ایک اور جہاز سے جہاز روانہ کر دے
وہاں کا داخل اب ان کا پر سکون ہو چکا تھا کہ وہاں تمام فی اوی کمرے بند تھے اور صحافی تقریریں کر رہے تھے۔

میں نے ارشد شریف سے کہا کہ یار یہ معاملہ جتنا پر سکون لگ رہا ہے یہ اتنا ہے نہیں! یہ ساری ناموسی اور سکون کسی بڑے طوفان کا چوڑا خیمہ ہے۔

ارشاد شریف نے میری طرف دیکھا اور روایتی انداز میں مسکرایا۔ یہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے ہم دوست کوئی بھی معنی اپنے مطلب کے جب چاہیں پہنا سکتے تھے۔

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں تھا۔ نواز شریف سے ایک وفد بھر امیگریشن سٹاف نے ٹھکار شروع کر دی کہ وہ پاسپورٹ ان کے حوالے کریں تاکہ ان کی امیگریشن کرائی جاسکے۔ اب کی وفد نواز شریف امیگریشن کرائے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ایئر پورٹ سے باہر جانے دیا جائے۔ اگر وہ ایئر پورٹ سے قلعے میں کامیاب بھی ہو گئے تو باہر سڑک پر ایک ساتھی بھی نہیں تھا جو ان کا استقبال کرتا۔ حکومت امیگریشن کرا کر واصل ان کا پاسپورٹ قبضے میں لینا چاہ رہی تھی تاکہ اس پاسپورٹ کو سپریم کورٹ کے سامنے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے کہ نواز شریف پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور پھر اپنی مرضی سے ہی وہ وہاں چلے گئے تھے لہذا ان پر کسی طرح کا توہین عدالت کا کیس نہیں چل سکتا تھا۔

نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ کہانی سمجھ آ رہی تھی لہذا ان کے لیے سب سے اہم بات یہ بن گئی تھی کہ کسی طرح نواز شریف کا پاسپورٹ امیگریشن والوں کے ہاتھ نہ لگے۔

ایسی حالت میں متحیر بن جانوں نے سولہوں سے کہان شروع کیا کہ وہ تھے انگریزوں کی کہیں اور
تو جہت سے باز رہا تھا۔ اب یہاں کوئی سہاقی نہیں ہو تو انگریزوں کی کہیں اور یہاں میں نہیں
کہاں جہت سے ہر حال چھوٹا ہے کہان شروع ہو گئے۔ سولہوں سے کہا کہ کیا اور جہت
کہاں جہت سے ہر حال چھوٹا ہے کہان شروع ہو گئے۔ سولہوں سے کہا کہ کیا اور جہت

تو جی مہدی اروں سے لڑ چکڑا رہے تھے۔ اتنی دیر میں شب کے ایک اور اضران ہوا۔ نمودار ہوئے۔
انہوں نے بتایا کہ وہ نواز شریف کو چند مفادات میں گرفتار کرنا چاہ رہے ہیں۔ احمد ملک نے اس سے
دہانت لے لی تو انہوں نے فوراً عدالت کے وارنٹ دکھا دیئے۔ اس سے لگتا تھا کہ حکومت نے چوری
چوری کی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نواز شریف کو اکیلا کر کے سمجھا لیں اور اپنے ساتھیوں سے ہذا کیا
ماتے تاکہ انہیں جہد و پیہنے میں آسانی ہو۔

نبی افران کے وارث دکھانے پر وہاں ایک دفعہ پھر ایک سکون کی ہی کیفیت چھا گئی۔ سب نے ایک گہرا سانس لیا کہ چلیں اب نواز شریف کو گرفتار کر کے انک قلعہ لے جایا جائے گا۔ اس بات کے لیے نواز شریف سمیت ان کی پارٹی کے سارے لیڈر تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انک قلعہ سے چند دنوں بعد وہ سپریم کورٹ سے نواز شریف کی ضمانت کرا لیں گے۔

ارشاد شریف نے اپنے ایک جاننے والے آفیسر سے پوچھا کہ اب آپ لوگوں کا کیا چلان ہے۔ اب آپ لوگ مزید کتنی دیر اس صورتحال کو اس طرح برقرار رکھیں گے۔ وہ آفیسر مسکرایا اور بولا آپ لوگوں کے جانے کا انتظار کیا جا رہا ہے تاکہ کمانڈر ایکشن کر کے نواز شریف کو جہاز پر سوار کرادیا جائے۔

اس معنی خیز مسکراہٹ نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ ہم صحافیوں کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف کو اب کی دفعہ جہد نہیں بھیجا جائے گا۔ ہمارے اس یقین کے پیچھے تین وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر سعودی عرب نواز شریف کے پاکستان آنے پر راضی نہیں تھا تو وہ لندن میں سی نواز شریف کو روک سکتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے شہریوں کو واپس آنے سے نہیں روک سکتے

تھے۔ تیسری وجہ نواز شریف کا اپنا اصرار تھا جس کی وجہ سے ہم سب دھوکھا کھائے تھے کہ اس سے ہم سب کو
 کہا کہ شاید اس دفعہ نواز شریف باقاعدہ پلاننگ اور گت دہلیہ کے بعد پاکستان ہمارے قریب۔ وہ ضرور
 شریف کی طرح کوئی ایذا پہنچانے نہیں ہمارے تھے لہذا اعلیٰ معاملہ طے کیے پاکستان واپس نہیں آئے
 تھے۔ آخر کہیں نہ کہیں سے تو انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ پاکستان واپس جانے کی تیاری کریں
 تو ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

نواز شریف لندن میں بار بار یہ بات کہتے تھے کہ انہیں کسی بھی سعودی عہدیدار یا بادشاہ
 مہمانت نے فون کر کے پاکستان جانے سے نہیں روکا ہے۔ ان کے خیال میں یہ پاکستان کا اندرونی
 معاملہ ہے جس میں سعودی عرب مداخلت کرنے کو تیار نہیں! ایک دو دفعہ تو نواز شریف اس بات پر چڑ
 سے گئے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا سعودی عرب نے انہیں پاکستان واپس جانے کی اجازت دیدی
 ہے۔ نواز شریف نے بڑی برہمی سے سوال کرنے والے اس صحافی کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ
 پاکستان ایک خود مختار ملک ہے اور ہم کیوں بار بار سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت میں
 ہیں۔

جب نواز شریف سوال کرنے پر برہمی کا اظہار کر رہے تھے تو ہم سب چپ رہے مگر نہ پوچھا جا
 سکتا تھا کہ میاں صاحب اس سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت کرنے کا اختیار تو اس وقت مل
 تھا جب انہوں نے آپ کو جنرل مشرف کی ٹیل سے رہائی دلوائی تھی۔ اس وقت سعودی عرب کی مداخلت
 کا غیر مقدم کیا گیا تھا لیکن آج بدلتے حالات میں اسی ملک کی مداخلت کو پاکستان کی خود مختاری پر ایک
 ضرب قرار دیا جا رہا تھا۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ نواز شریف کو ہندو نہیں
 بھیجا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں انگلینڈ جیل لے جایا جائے گا۔

اتنی دیر میں ہم نے دیکھا کہ معاملہ اب انگریز ٹائٹن اور ریب کے افسران کے ہاتھوں سے اعلیٰ
 جسٹس ایجنسیوں کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ اب یہ ایجنٹس بے چین نظر آ رہے تھے۔
 یوں لگ رہا تھا کہ اوی سے کہیں یہ پیغام آ گیا تھا کہ اب مزید ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں! انہر کرنا ہے
 وہ کر گزر گیا۔

بات یہ تھی کہ آج ہندوستان میں ہوائی ہمارے بھی۔ سہائی بھی اپنی باتوں پر ہمارے تھے۔
 سب کو چاہیے تھا کہ آج وہ مرحلہ آن پہنچا ہے جس کے لیے ان سب نے لندن سے اسلام آباد تک کا
 سفر کیا تھا۔ منہجی میں جیڑی آنے لگی۔ ہندوستان بڑھنے لگے۔ اچانک نواز شریف کے گرا اعلیٰ جسٹس
 افسران نے گھبراؤ ڈال لیا اور بڑی جیڑی سے ان کی پارٹی کے لوگوں کو ان سے علیحدہ کیا۔ دو عین نے میاں
 صاحب سے بدتمیزی کرنی شروع کی۔ ایک مرحلے پر وہ بدتمیزی اتنی بڑھ گئی کہ میاں صاحب کا چہرہ ہلکی
 دھندلے سے سرخ ہوا اور انہوں نے تقریباً چلا کر کہا کہ وہ تمام افسر جو ان کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں
 انہیں ایک دن اپنے کیے کی سزا جھگڑنا پڑے گی۔

اس دوران میاں صاحب کو دھکے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کی پارٹی کے دو عین لوگ ابھی
 بھی میاں صاحب کے قریب رہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں دھکے نہ چڑیں۔ ان میں ان کے لندن
 کے دفتر کے محمد افضل پیش پیش تھے۔ ہم سب صحافی ایکٹو ہو گئے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا
 کرنے والے تھے۔ راول لاؤنچ میں جیل و پکار اور شور شرابہ بڑھ گیا تھا۔ اعلیٰ جسٹس افسروں کے ساتھ
 اب پنجاب پولیس کے کمانڈرز بھی مل گئے تھے۔ محمد افضل کا حال اس وقت سب سے زیادہ برا تھا۔ وہ
 نواز شریف کے ساتھ ابھی تک چپے ہوئے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ بدتمیزی نہ ہو۔ اسی دھکم پیل میں ہم
 نے اچانک ایک گونج وار آواز سنی۔ یہ محمد افضل کی آواز تھی جو زور سے اعلیٰ جسٹس ایجنسیوں کے افسران
 کے رویے کو دیکھ کر چلاتے ہوئے کہا کہ شرم کرو یہ شخص بھی تمہارا دو دفعہ وزیراعظم رہا ہے۔ تم لوگوں کو
 اپنے وزیراعظم کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے شرم آتی جا رہی ہے۔

میں اور ارشد شریف ایک کونے میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں پر اچانک
 ایجنٹن کا دورہ پڑا۔ ہم کس طرح کے ملک کے شہری تھے جہاں دو دفعہ وزیراعظم رہنے والے شخص کو
 اعلیٰ جسٹس ایجنسیوں کے چند لوگ سرعام ذلیل کر رہے تھے۔ وہ شخص جو کبھی اس ملک کے اچھے رہنے والے کا
 مالک تھا آج چند ایجنٹوں کے ہاتھوں کھینچا جا رہا تھا اور اسے ہاتھ روم میں بند کرنے کی کوشش ہو رہی
 تھی۔ لندن میں بیٹھ کر ہمیں یوں لگتا تھا کہ شاید اب پاکستان بدل گیا ہے، لیکن ہماری آنکھوں کے
 سامنے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس ملک میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ جنرل مشرف
 اور نواز شریف کے درمیان 12 اکتوبر کو شروع ہونے والی ذاتی جنگ آٹھ سال بعد بھی اپنی تمام تر قوت

سیرت کے ساتھ جاری تھی۔ یہاں تک کہ آج بھی اس کی کڑواہٹ ہے جس نے ۱۲۸۱ء کو
 تھے ایک فوجی حرم کے دونوں سے اور تھے دہلے دریا مقیم سے کئی آٹھ سو گز دور اس کی حالت
 کا بیان ہماری انکسوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

شہر شریف حیدر آباد گیا تھا۔ اعظم جلی بھاری تھی۔ میری نظر ایسا تک پہنچ کر روٹھ گیا۔
 نواز شریف کے ساتھ یہ سواک ہو جا کر کچھ کر دیا تو کوئی نہیں کر سکتے تھے مگر ان کی آنکھوں سے آنسو
 تھے۔ لندن میں نواز شریف کے ترجمان نواز چوہدری نے دور سے میاں صاحب کو خط لکھی جس میں ان
 اور کراٹھہ کے زمرے میں دیکھ کر دور سے کہا "میاں صاحب دی گویا۔" نواز شریف نے ہمارے چوہدری
 کی دست دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھٹی بے بسی اتنی زیادہ تھی کہ اس ایک نگاہ سے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا
 تھا کہ وہ ہمارے چوہدری کو جواب میں کیا کہنا چاہ رہے تھے۔

میں نے وہاں جاری اس دہم پہلی میں تمام مصطفیٰ کھر کو دھوڑنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تو
 کہ شاید وہ بھی نواز شریف کے کدھے سے کہہ جاتا کہ ان کا تہ ذہ اور احمیلی جنس افسروں سے لانے کی
 کوشش کریں گے۔ آخر وہ بھی پاکستان سے خصوصی سفر کر کے لندن اسی پیکر میں گئے تھے کہ وہاں ان
 نواز شریف کے ساتھ آئیں گے۔ جب انہوں نے یہاں ساری کہانی اپنی ہوتے دیکھی تو وہ چپکے سے
 کسی کی نظر میں نہ آئے بغیر انگریزوں کا دست سے اپنے پاس پھرت پر میرا لکھا کر اپنے انتظار میں باہر کوڑی
 ایک گاڑی میں بیٹھ کر سڑکی سے اسلام آباد کی طرف نکل گئے۔

میں صاحب کے ساتھیوں نے کچھ راحت کرنے کی کوشش کی تو ان احمکی جنس مشران نے
نور شریف کو ہاتھ دھم کی طرف مریض شروع کیا۔ ابھی یہ شہر شروع جاری ہی تھا کہ ان کو ملاحظہ سے نور
شریف کا رخ ان کے کی طرف کھلے۔ انے قریبی گیت کی طرف کیا اور انہیں تقریباً تھپتھے سوئے وہاں
سے باور لے گئے۔ بچا پوئیں کے ملاحظہ سے نور شریف کو ایک پرانی سی بس میں ڈال دیا۔ چند ملاحظہ
بیس میں بیٹھ گئے جبکہ ہاتھوں نے بس کے پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے شکاری کتے اپنے
شکار کو ہانک کر اپنے مالک شکاری کے پاس لے کر جا رہے ہوں جو وہاں سے کچھ دور فاصلے پر چھان پر
بیٹھا اپنی بندوق تانے اس خوفزدہ ہیرن کا انتظار کر رہا تھا۔ بس ایک جہاز کے قریب جا کر رکی۔ بعد میں
پتہ چلا کہ اس جہاز میں سعودی پرنس وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میں صاحب کو وہاں منتخابا گیا اور بتا دی

بچوں کے ساتھ اور جوتہ پہننے کے لیے ان کی

○○○

ہوں تو ان شریف جنسوں نے پاکستان واپس آنے کا جو اعلان کیا تھا وہ اپنی پارٹی کے ایجنڈوں
اور کارکنوں کی بڑی اور جلدی کی وجہ سے اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترتے ہی ہار گئے تھے انہیں اعلان
میں جو آیت اللہ قمی جیسے استقبالیہ کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ سب جھوٹی افواہیں تھیں۔ ان کے ساتھ ایئر
پورٹ پر جو سلوک کیا گیا تھا اس نے یقیناً انہیں 19 اکتوبر کی یاد دلا دی ہوگی۔ تو ان شریف یہاں کے ایک
دوسرا بھی اعلان پر یہ کہہ کر تنقید کر رہے تھے کہ ان کا ٹیڈ آئی اے کی فلائیٹ سے آئی جلدی پاکستان آباد بھی
ایک غلط فیصلہ تھا۔ بہتر ہوتا وہ کسی اور فلائیٹ سے دوبارہ کے وقت پاکستان پہنچتے تو کہ اس وقت تک کہ
ایئر پورٹ اور دروازے پر اتر چکے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہاں صاحب کو اسلام آباد کے جیل سے
ایئر پورٹ آ کر ملنا چاہیے تھا جو پارٹی کا گزرا تھا۔ ان کا عرض جتنے منہ آئی باتیں تھیں وہی کہ کامیابی کے
باب ہوتے ہیں اور نامی کو دھوکے سے ایک بھی نہیں ملتا۔ اگر بھی تو ان شریف کو پاکستان داخل
ہونے کا موقع مل جاتا تو انہی ایجنڈوں نے ان تمام ٹیکسٹوں و جہالت کو پلانٹ کر رکھا تھا۔

میں اور ارشد شریف ایئر پورٹ سے باہر گئے تو چار طرف ایک نوکادہ لمقدہ حلال شرف
کوٹ کا شہریہ کی انہوں نے سفاکیوں کو اسلام آباد پہنچانے کے لیے ایک دو گھنٹہ بعد دست آور
قد ایئر پورٹ سے تھیں پورٹ تک پہنچیں ہی پہنچیں تھی۔ اپنی اسٹاٹوٹا کا ایک ہزار گئی کسی شہریہ
آپ کی حق جہاز کی دیکھنے کے قریب سے قلام مصطفیٰ کو صاحب جیسے حکمران عالمی ایئر لائنز کو
قریب سے پر جیسے جہاز سے گزر گئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ یہ اقداب آتے آتے ان کے قریب شہریہ کی
پہاڑیوں میں بیٹھ کر پاکستانی عوام کو ہندو شریف کے اس سفر میں اپنی بہادری کی کہانیاں سناتے آتے
تھے۔ میرا اور ان کا پہلا نا کراچی کی دہلی کے بڑے شہر میں بان افکار احمد کے پروگرام جہاد میں دور
میری حیرانی کی انتہاء تھی جب انہوں نے اس پروگرام میں ایسے گفتگو کی جیسے نوادہ شریف ایک بچہ
بیٹھا تھے اور وہ ان کے گارڈ فادر تھے۔ انہوں نے ایئر پورٹ پر اپنی بہادری کی انکی کہانیاں سناتا
شہریہ کہیں کہ میں دیکھ رہا گیا۔ افکار احمد کے اس پروگرام میں مصطفیٰ کوٹ کی یہ باتیں سن کر مجھے ان کی

لاہور میں آ رہا تھا۔ پاکستان میں معطل کر دینے کا یہاں سے ہے۔ ہمارے پاس ایک گھر ہے۔
اور معطل کر دینے کے لیے ہے۔ اب لاہور شریف پر ہمارے گھر ہے تو معطل کر دینے کا یہاں سے ہے۔

میں اپنے گھر سے یہ عالم تھا کہ لی لی لی پر خیر میں ملنا شروع کیا۔ وہاں ہزاروں شرف
مکرم کے لطف و دراز اور شریف پر ہمارے گھر ہے۔ گھر کے لیے ایک کی طرف اور لی
کی قیام لہذا انہیں یہ بھیجا گیا تھا۔ ان وزراء میں ایک وزیر کا نام زادہ حامد بھی تھا۔ آئی وی سی زادہ حامد
پاکستان مسلم لیگ کو ان کے گھر پر سیالکوٹ سے انٹرنیشنل جیت کر مہر قومی اسمبلی میں۔ وی سی زادہ شریف پر
انہوں میں قرآن کی تفسیریں کھاتے تھے کہ وہ ہزاروں شرف کے ساتھ ہاتھ ملانے والے کسی سیاستدان
سے ہاتھ تک نہیں ملائیں گے وی سی بعد میں زادہ حامد جیسے لوگوں کو اپنی پارٹی کا گھٹ ویکر قومی اسمبلی کا ممبر
بنوانے دیکھے گئے۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد لاہور شریف پاکستان لوٹ آئے۔ اب کی دفعہ انہوں نے درست ایئر
پورٹ کا انتخاب کیا۔ وہ اسلام آباد کے بجائے لاہور ایئر پورٹ پر اترے۔ اب انہیں ہمارے جیسے
صحافیوں کو چہرہ ہمارا کر اپنے ساتھ لاہور لانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس دفعہ سعودی عرب کے
بادشاہ سلامت نے انہیں اپنے طیارے پر ایک ہلٹ پر دف مرسینڈین گاڑی ساتھ دیکر پاکستان واپس
بجھایا تھا۔ بھلا اب کی دفعہ ہزاروں شرف کی کیا مجال کہ وہ بادشاہ کے جیسے ہوتے ہمارے لیڈر کے ساتھ
وہی سلوک کرتے جو ہماری آنکھوں کے سامنے اسلام آباد ایئر پورٹ پر کیا گیا تھا۔

سید یوسف رضا گیلانی

وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں لیصل صلاح
حیات ایک ایسی بات کہہ دیں گے جس کی وضاحت انہیں لی وی کیمروں کے سامنے نمودار کرنی پڑ جائے
گی۔

دراصل وزیر اعظم گیلانی، فیصل صلاح حیات اور وفاقی وزیر برائے پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف
کے درمیان ایک سال سے جاری لڑائی میں کر اس فائرنگ کا شکار ہوئے۔ جون 2010ء کے آخری ہفتے
میں جب بجٹ پر بحث جاری تھی تو فیصل صلاح حیات نے ایک دفعہ راجہ پرویز اشرف پر بغل پاور
پر چیکس میں کرپشن کرنے کے الزامات دہرائے۔ اس وقت وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی ایمان
میں موجود تھے۔ فیصل صلاح حیات نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ راجہ پرویز اشرف
کے خلاف سیکینڈل اس رپورٹر (رؤف کلاسرا) نے کیا ہے جنہوں نے وزیر اعظم گیلانی کی کتاب "چاو
یوسف سے صدا" لکھی ہے۔

یہ بات قومی اسمبلی میں بیٹھے تمام ارکان اور میڈیا کے لوگوں کے لیے ایک بم شیل کے طور پر
ساٹنے آئی۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وزیر اعظم گیلانی کو اس طریقے سے سب کے سامنے یہ
کہا جائے گا کہ ان کی آپ بیتی دراصل کسی صحافی نے انہیں گھڑ دی تھی۔ انہیں نے مجلس اس پر اپنا

نام لکھ دیا تھا۔

جب فیصل صالح حیات نے یہ ساری بات قسم کی تو وزیراعظم گیلانی کمرے ہو گئے اور انہوں نے اپنی وضاحت پیش کی۔ گیلانی صاحب نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رولڈ کا سربراہ میرے دوست ہیں۔ پھر انہیں کوئی بات یاد آئی اور بولے کہ نہیں، وہ میرے ذاتی دوست ہیں۔ جب میں اڈالہ ہیل میں تھا تو وہ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ گیلانی صاحب نے ایک اور بات بھی کہی کہ وہ بھی سرانجی ملاتے تھے اور میں بھی سرانجی ملاتے تھے آج کل سے آج کل۔ تاہم، یہ کتاب میں نے ٹوٹ لکھی ہے۔ رولڈ کا سربراہ نے نہیں لکھی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے گیلانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ وٹو انکھل میں لکھتے ہیں، اردو میں نہیں ان کے لکھنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر رولڈ نے لکھی ہوئی تو وہ کتاب وٹو میں ہوئی نہ کہ اردو میں۔

جب قومی اسمبلی میں یوسف رضا گیلانی اور فیصل صالح حیات میں اس بات پر بحث جاری تھی کہ یوسف رضا گیلانی کی کتاب کس نے لکھی تھی تو میں اس وقت بڑے مزے سے اپنے گھر پر سو رہا تھا۔ ایک پھر میں کونسل کے دوست احمد کافون آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ کہاں ہیں؟ یہاں تو آپ کی وجہ سے خامسار دلا ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتادیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ فیصل صالح حیات کہتے ہیں کہ کتاب آپ نے لکھی ہے، گیلانی صاحب کہتے ہیں کہ نہیں یہ کتاب انہوں نے ٹوٹ لکھی تھی۔ میں نے تقریباً سوئے سوئے احمد کو جواب دیا کہ ہاں یہ ایسی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت اس پر بات کریں گے۔ احمد کافون بند ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سوئے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایئر پورٹ لینے لینے دس سال پہلے کی ان یادوں میں کھو گیا جب میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے اڈالہ ہیل میں ملاقات ہوئی تھی۔

○○○

اگست 2001ء کی بات ہے۔ میں نے ان دنوں نیا نیا ڈان اخبار چھوڑ کر دی نیوز کو جوائن کیا تھا۔ جنرل مشرف نے انہی دنوں ایڈ ہاک پبلک اکاؤنٹس کمیشن تشکیل دی تھی۔ ایک بجے ہوئے ریمارکس بیورو کریمٹ انچ۔ یو بیگ کو اس کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ اس کمیشن کے باقی ممبران بھی ریمارکس بیورو کریمٹ

نے لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ ان سب نے ان کے بعد آنے والے سیاسی دور میں جتنے دلی پبلک اکاؤنٹس کمیشن کے ممبران سے بہت اچھا کام کیا تھا۔

انہی دنوں اچھی بات یہ ہوئی کہ پہلی دفعہ اس کمیشن کی میٹنگ میں میڈیا کے لوگوں کو شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اب سمجھائی وہاں بیٹھ کر اس کی کارروائی کو رپورٹ کر سکتے تھے۔

ایک دن بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ پبلک اکاؤنٹس کمیشن کے سامنے قومی اسمبلی اور سینیٹ کے ریمارکس کی دو مختلف آڈٹ رپورٹس پیش کی گئیں۔ ایک رپورٹ اس دور کی تھی جب وہم سہارہ میں بیٹھتے تھے اور یوسف رضا گیلانی ان کی قومی اسمبلی تھے۔ ان آڈٹ رپورٹس میں دونوں نے لکھا کہ ایک طرح کے الزامات لگائے گئے تھے جن میں لوگوں کو نوکریاں دینا، گاڑیوں اور ٹیلی فون کا غیر ضروری استعمال اور اختیارات کا غلط استعمال وغیرہ شامل تھے۔ نیکواری سبب شہداء اقبال کا یہاں تھا کہ پبلک اکاؤنٹس کمیشن کی سہولت کے حسابات کو چمک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے جس کے تمام معاملات کی منظوری اس کی فنانس کمیشن سے لی جاتی ہے۔ تاہم، کمیشن نے یہ اعتراض ماننے سے انکار کرتے ہوئے آڈٹ رپورٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہم سہارہ پہلی فون اور گاڑیوں کے غلط استعمال کے معاملے میں کمیشن روم سے اٹھارہ لاکھ روپے ریکور کرنے کی اجازت کر دی۔ بعد میں وہم سہارہ نے جنرل مشرف کے نام ایک خط لکھا۔ جنرل مشرف نے صدر پاکستان کی منیجٹ سے انہیں اٹھارہ لاکھ معاف کر دیے اور کچھ دنوں بعد وہم سہارہ نے 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان مسلم لیگ قائداعظم جوائن کر لی۔ یوں یہ سارا سودا اٹھارہ لاکھ روپے میں طے ہو گیا۔

اگلے دن یوسف رضا گیلانی پر بننے والی آڈٹ رپورٹ کی باری تھی۔ ان پر بھی وہی الزامات تھے جو وہم سہارہ پر تھے۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ان پر بھی کوئی جرمانہ وغیرہ کر کے آڈٹ رپورٹ کو سبٹل کر دیا جائے گا۔ تاہم، جب رپورٹ سامنے لائی گئی تو کمیشن کو بتایا گیا کہ یہب نے پہلے ہی اس رپورٹ کی بنیاد پر یوسف رضا گیلانی کو گرفتار کر رکھا ہے اور جب تک ان کیسز کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کمیشن یہ رپورٹ ایلی میٹنگ میں زیر بحث نہیں لاسکتی۔

یوں پبلک اکاؤنٹس کمیشن نے بھی اپنے اختیارات یہب کے سامنے سرخڑ رکیے۔ اگر وہ یوسف رضا گیلانی پر بننے والے ان آڈٹ رپورٹوں کا فیصلہ کر دیتی جیسے وہم سہارہ کے سلسلے میں کیا گیا تھا تو شاید

انہیں نہ سب کی عزت سے سات سال قید اور دس کروڑ روپے کی سزا سنائی گئی تھی۔

جب میں نے پبلک اکاؤنٹس کھلی کی سینگ میں یہ امتیازی سلوک دیکھا کہ کس طرح ایک بیڑ میں بیٹ کے آٹ جیون کو پیش کر دیا گیا تھا اور ایک ترقی یافتہ اسکی پر بننے والی رپورٹ کو کچل کر نہیں کیا گیا تھا تو میں نے اپنے دفتر آ کر ایک جی سی سنواری دیکھی جو دی نوز کے فرنٹ چین میں کام میں تھی۔ اس میں میں نے یوسف رضا گیلانی اور وسیم سہاوی پر لگنے والے الزامات آسنے سانسے پھوپھے دینے تھے۔ اس خبر کا پھپھنا تھا کہ ایک تھلک بھی کیا۔ ان دنوں جنرل مشرف اپنی پوری قوت کے ساتھ ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ احتساب کا بھی بہت بڑا چہرہ ہوا تھا۔ اس خبر سے ان کے جعلی احتساب کا معاملہ ابھی پھوٹا اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ یہ احتساب وغیرہ محض اپوزیشن سیاستدانوں کو اپنے ساتھ لانے کے لیے تھا۔ وسیم سہاوی کی طرح جو سیاستدان افکار و لاکھ روپے کا جرمانہ معاف کر کے پاکستان مسلم لیگ ق میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے انہیں معافی تھی اور جو یوسف رضا گیلانی کی طرح حراست کر رہے تھے ان کے لیے آٹھ سال قید اور دس کروڑ روپے جرمانے کی سزا تھی۔

میری یوسف رضا گیلانی سے اس خبر سے پہلے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے شاید میری یہ خبر اڑیال ٹیل میں پڑھی تھی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں سے پوچھا کہ یہ رپورٹر کون ہے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ کسی دوست کے ذریعے مجھ تک ان کے شکریے کے الفاظ پہنچے۔ وہ جی ہائیں میں واقع ایک ہسپتال میں اپنے چیک اپ کے لیے آئے۔ مجھے پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہاں ان سے ایک کمرے میں چکی دلفی ملاقات ہوئی۔ ان کے خاندان نے ان کی گرفتاری کو ان کی والدہ سے پھپھایا ہوا تھا۔ انہیں یہ پتا نہ چلا گیا تھا کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب گیلانی صاحب کی والدہ وہاں آئیں تو انہوں نے ہسپتال کے اچھے صاف سترے کمرے کی تعریف کی اور کہا کہ اب وہ بھی یہیں رک جائیں گی۔ گیلانی صاحب کے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا کہ وہ ماں کو کیسے سمجھائیں کہ وہ قحوظی رہے بعد اس کمرے سے ٹیل پلے جائیں گے۔ آخر گیلانی صاحب نے اپنی والدہ کو بتایا کہ جنرل مشرف بھی چاہتے ہیں کہ وہ بھی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ اب وہ یہ بتائیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ بالکل نہیں اسکی بھی

بیت پر انہوں نے اپنے ملک چھوڑ کر نہیں جاتا ہے جسے چھل نہیں دے گا۔ اس سے ان کی والدہ صاحبہ نے کہا کہ جنرل مشرف کی یہ شرط ہے کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں کیسے رہیں۔ ان کی ماں نے کہا کہ میں یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں انہیں مکان میں چھوڑ دوں۔

کچھ عرصے بعد جب گیلانی صاحب کو یوسف رضا گیلانی کی والدہ سے یہ بات پھپھائی گئی تو انہیں خاندان کے کسی شخص نے لاشعوری طور پر یہ بات ان کی ماں کو بتادی اور صدمے سے حیرت ہو گئی۔

ہسپتال کے اسی کمرے میں میری چکی دلفی یوسف رضا گیلانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ جیون عزت اور احترام سے ملے۔ اس بات کا میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کے حق میں وہ سنواری کھینچی اور وہ اس بات کہ میں ان سے پہلے بھی نہیں ملا تھا۔

میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ میڈیا میں بیٹھ کر بیڑ برائیاں ملانے کے لیے ڈیڑھ لڑکوں اس بات پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے ملانے کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ وہ غریبوں کو نوکریاں نہیں دیتے۔ جب آپ نے نوکریاں دی تھیں تو ٹیل میں ڈال دیا گیا تھا لہذا اس معاملے پر قلم اٹھانا ان پر کوئی احسان نہیں تھا۔

خیر گیلانی صاحب سے ایک نئے تعلق کی بنیاد پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ صاحب سیاستدانوں کے برعکس ملنے ملانے میں زیادہ بہتر انسان تھے۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے ہٹ کر تھا۔ ہر ایک کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور شفقت سے گفتگو کرنا ان کے حراست کا حصہ تھا لہذا مجھے ملنے ملنے میں وہ محسوس نہیں ہو رہی تھی جو میں دیگر سیاستدانوں کے معاملے میں محسوس کرتا تھا۔

اس کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے اڑیال ٹیل گیا۔ وہ جیون عزت اور احترام سے پیش آئے۔ مجھے ایک نیا شوق ہونے لگا کہ کیوں نہ ان سے ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں بات چیت شروع کی جائے تاکہ ماضی میں چھپنے ہوئے رازوں پر سے پردہ اٹھایا جاسکے۔ یوں میرا اڑیال ٹیل آنا ہمارا زیادہ ہو گیا۔ ایک دن گیلانی صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ ٹیل میں فارسیا ہونے کی وجہ سے وہ اپنی تو بھارتی اور کاروبار انشورین رائے کی مجلس دیکھتے رہے یا پھر کاغذ قلم لے کر اپنے دماغ کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔

۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰

بہاروں میں اور شہر شریف کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا۔ جس اور ارشد اور ان کے پاس
 تھے کہ یہ ہمارے گیلانی صاحب کے ہوتے تھے۔ اُن کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جس اور ارشد نے
 انہیں اس طرح کہ صاحب نے کہا اور اسلام آباد آئے تھے۔ اُن کے لیے قیل کے گیت سے انہیں آئے تھے۔ یہ
 نہیں کہے گیلانی صاحب کو یہ قیل گیا۔ انہوں نے اپنی ملاقاتوں سے ملنے سے عذر دے کر نہ ہوئے
 قیل مقام سے کہا کہ مال اور اس کے دوست کو اندر بھیج دیں۔ جب میں اور ارشد اندر گئے تو ایک بڑی
 میز پر کھانا لگا ہوا تھا جو ان کے بچے ان کے لیے لائے تھے۔ میز کے ارد گرد گیلانی صاحب، ان کی بیوی
 نور بیگم، بی بی فاطمہ، ابوہنا عبدالقادر اور عین چوہے بچے موسیٰ، حیدر اور قاسم بھی بیٹھے تھے۔ وہاں
 ایک چوہا سا بچہ بھی بیٹھا تھا۔ وہ بیمار سا بچہ مجھے اور ارشد کو دیکھ کر راسخا گیا۔ اس نے غور و آنکھوں
 سے ہم پر مشاہدہ کر دیا کہ ان میں سے جنرل مشرف کون ہے۔ ہم دونوں اس گول منول بچے کے منہ
 سے یہ سوال سن کر بڑے حیران ہوئے کہ یہ اہل کیوں ہمیں جنرل مشرف سمجھ رہا ہے۔ یہ چلا کہ وہ چوہا
 سا بیمار بچہ جسے ارشد گیلانی کی بی بی فاطمہ کا اکھوتا بیٹا اسفند یار ہے۔ جب وہ گھر پر کوئی شرارت نہ کیا
 رات کو سوتے سے اٹھ کر آتا تو اس کی ماں اسے ڈرانے کے لیے کہتی کہ اگر تم نے شرارت کی یا نہ سوتے تو
 جنرل مشرف آکر تمہیں اسی طرح قیل میں بند کروں گے جیسے انہوں نے تمہارے نانا ابو کو قید کیا ہوا
 ہے۔ اس نسخے سے بچے کے نزدیک دنیا میں صرف ایک ہی خوفناک چیز تھی جس کا نام جنرل مشرف تھا۔
 جو اتنا طاقتور تھا کہ اس نے ان کے نانا ابو کو بھی قید میں رکھا ہوا تھا اور وہ سارے مل کر بھی اس کا کچھ نہیں
 بگاڑ سکتے تھے وہ جب بھی قیل میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانا ابو سے ملنے آتا تو وہ گیلانی صاحب سے

Handwritten text in a cursive script, likely a letter or document, written on aged paper. The text is written in a fluid, connected style, characteristic of early modern handwriting. The ink is dark, and the paper shows signs of wear and discoloration.

[illegible]

میں نے گریلائی صاحب کو دو پٹے والیں کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا کوئی
پے نہیں ہیں۔ ہم اس کتاب کا اچھا نام استعمال کریں گے اور اس کی رائٹنگ میں سے اپنا حصہ لیں
گے۔

میلانی صاحب کہنے لگے کہ یہ پیسے میں آپ کو نہیں دے رہا ہوں۔ یہ پیسے آپ کے دوست کے لیے ہیں تاکہ وہ یہ کام محنت سے کرے۔

میں نے وہ پیسے گیائی صاحب کو لوٹا دیے کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس وقت گیائی صاحب کے گھر بھوکے پیٹ سے تھے۔ ٹیب نے جب سے ان کے بچک اکاؤنٹس فرما دیے تھے اور ان کی ہانڈ اور بیچنے پر پابندی لگئی تھی ان کے پاس بچوں کے لیے بھی پیسوں کے پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ایک گاڑی اور قیمتی گھڑی بیچ کر اپنے مالی معاملات چلانے کی کوشش کی تھی۔ ان حالات میں ٹیب میں بیٹے کسی بھی انسان سے پیسے لینا میرے اپنے ضمیر کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا چاہے وہ پیسے مجھے اس انگریزی کتاب کے ترجمے کے لیے ہی کیوں نہیں دیئے جا رہے تھے۔

آخر گیلانی صاحب نے میرے مسلسل انکار کے آگے اصرار ڈال دیا۔ ہم دونوں دھڑلے سے کمرے کی طرف گئے جہاں ان کی تھی بیچ اور ارشد شریف بیٹھے تھے۔ گیلانی صاحب نے اپنی کتاب کا اردو مسودہ میرے حوالے کیا تاکہ میں ارشد شریف کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کروں۔

میں نے گیلانی صاحب سے مسودہ لیا اور ارشد شریف کے ساتھ چٹیل کی سلاخوں سے پار کیا۔ میں نے ارشد شریف کو ساری بات بتائی کہ کیسے گیلانی صاحب میں ہزار روپے ایڈوانس کے طور پر دے رہے تھے۔ ارشد شریف مسکرایا اور مذاقاً بولا پھر واپس کیوں کر دیے تھے؟ چیمپوں کی بیوی شادی ضرورت تھی۔

میرا اور ارشد کا خیال تھا کہ اس کتاب کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کرتے ہیں اور پھر اسے اکٹھے بیچ کر ایڈوانس کر لیں گے۔ ارشد شریف ان صحافیوں میں سے ہے جو ہر کام کو دو حصوں کے ساتھ کرتے ہیں اور بہت اچھا کرتے ہیں۔ ارشد شریف کا موزا اس وقت یہ مسودہ چھ کر شاپ ہو گیا جب اس نے گیلانی صاحب کی اپنے خاندان کے بارے میں دی گئی چھوٹی چھوٹی معلومات کو چمک میں نے ارشد کو بتایا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کریں۔ ہمیں انگلش بھارتی کو دیکھیں میں رکھ کر اس کتاب کو لکھتا تھا۔ گیلانی صاحب کے اس خاندان کے باب کو ہم اپنے مرضی سے ایڈٹ کر کے لکھ سکتے ہیں۔ میں نے گیلانی صاحب سے اگلی ملاقات پر یہ بات کی تو انہوں نے خوشی سمجھی اس بات کی اجازت دی کہ ہم جیسے چاہیں اپنی کچھ کے مطابق اس کتاب کا انگلش لکھ دیں۔

میں دیکھ کر آیا ہوا ارشد شریف سے بات کی جس میں نے محسوس کیا کہ ارشد شریف اب اس پابلیکٹ میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میں نے ارشد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف پاکستان میں ہی ہم صحافی اس طرح کے کام نہیں کرتے تھے۔ دنیا بھر کے صحافی تحقیقات کر کے سچی شائد کرتے ہیں چھاپتے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اگر آج ہم نے گیلانی صاحب کی یہ پابکاری انگلش میں کر لی تو نہ صرف ہمارے اپنے صحافیانہ کیریئر کو پریشانی کا شکار ہو گا بلکہ ہم اور بھی بڑے بڑے صحافیوں کی آپ بیتیاں لکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے ارشد سے مذاقاً یہ بھی کہا کہ کون جانتا ہے کہ کل کو یہ چٹیل میں بیٹھا ہوا ہوا گیلانی اس ملک کا وزیراعظم بن جائے اور پھر

اس کی سیاست اور ذات پر کبھی بھی کوئی گفتگو کرنے کے لیے ہم دونوں سے بچر تھوڑا لگا اور کوئی نہیں ہوگا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ گیلانی صاحب واقعی وزیراعظم بن گئے۔

میری یہ آخری کوشش بھی رائیگاں گئی کیونکہ اس کے بعد ارشد بائیں اس پابلیکٹ میں دلچسپی نہ کر گیا۔ اسی اثنا میں یہ چٹا کہ ارشد کو برطانیہ میں ماسٹر کرنے کے لیے ایک اسکالرشپ مل گئی ہے اور دو کچھ دنوں بعد پاکستان چھوڑ گیا۔ یوں گیلانی صاحب کی یہ کتاب کبھی بھی انگریزی میں نہیں چھپ سکی اور اس کے ذمہ دار اور کوئی نہیں، میں اور ارشد شریف ہیں۔ گیلانی صاحب کی آپ شرافت دیکھیں کہ اتنے برسوں میں انہوں نے مجھے کبھی یاد تک بھی نہیں دلایا کہ میں نے ان سے ان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کوئی وجہ بتائے بغیر آج تک اس کا کام نہیں کیا۔

اسی اثنا میں میں ایک دن اس وقت کے وزیر داخلہ فیصل صالح حیات سے ملے ان کے دفتر گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ وہ بھی اپنی پابکاری لکھیں کیونکہ ان کی زندگی اتنی دلچسپ گزرتی تھی کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں بہت کچھ ہوا ہو گا۔ میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو میں ان سے ساری داستان ان کے دو کتاب لکھوں گا۔ دو روایتی ہوں گے اور آج میں کہوں گا۔ فیصل صالح حیات نے میری بات کو مذاق میں لانا چاہا تو میں نے انہیں بتایا کہ جب دوست رہا گیلانی بھی چٹیل میں کتاب لکھ رہے تھے تو انہیں کچھ لکھنے چاہیے۔ میرا خیال ہے ان وقت فیصل صالح حیات نے یہ سمجھا کہ شاید جیسے میں انہیں ان کی کتاب لکھنے کی آخر کتاب لکھتا تھا کہ میری دوست رہا گیلانی کی کتاب بھی لکھ رہا تھا۔ حالانکہ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں بھی دوست رہا گیلانی کی طرح اپنے آپ سے لکھنے چاہیے۔

ملائے ان سات برسوں میں فیصل صالح حیات کے کہیں میں بھی بات نہ ہو کہ دوست رہا گیلانی کی آپ جتنی میں نے لکھی تھی۔ فیصل نے اپنے تئیں وزیراعظم لکھنے کے لیے کمر بستہ کر دیا بات میں جتنی یاد کرنے کے لیے یہ کیا تھا کہ ان کی کتاب بھی اسی صحافی نے لکھی تھی جس نے وہ پورا شرف کے خلاف سیکڑال ہٹل کیا تھا۔ فیصل نے یہ بات عورت کرنے کی کوشش کی کہ ہوا ایک ایسا صحافی جس سے وزیراعظم نے اپنی کتاب لکھوائی ہے اور اسے کیسے بھائی خیر دے سکا ہے۔ جب وزیراعظم گیلانی نے اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کتاب انہوں نے خود لکھی ہے اور یہ کہ

میں نے اس کے دوستوں سے اس بار بھی فیصل کو بڑے کرنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔
 میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم ایجنٹ ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے قریبی دوستوں کے خلاف
 غریبوں کو بڑے پیرا۔ وہ ہم پر عظیم کیونٹی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اب مجھے یہ بات پگھلاؤ میں نے فیصل صاحب سے کہا کہ ان سے کیا کرنا
 باقی دوستوں سے کیا کیا ہے۔ میرا دوست ایک صاحب فیصل نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے
 اس کے خلاف میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ جی نہیں سمجھ رہے تھے۔ میں نے جتنے
 دن سے انہیں کیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ جی نہیں سمجھ رہے تھے۔ اگر میں نے کسی کوئی
 میں نے اس سے اس کے لئے کام کیا ہے۔ اس سے اس کے لئے کام کیا ہے۔ اس سے اس کے لئے کام کیا ہے۔
 رنگ کے ساتھ میں نے اس کی دیکھی میں نے اس کے لئے کام کیا ہے۔ اس سے اس کے لئے کام کیا ہے۔
 ہوئی تھی آپ جی کیا کیا ہے۔

پہلائی صاحب کی بی بی اعلیٰ لڑکی ہے کہ انہوں نے قوی اپنی میں کھڑے ہو کر یہ کہا کہ وہ
 کام وہ ان کا دوست ہے۔ اگر نہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 رہتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے۔ یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 اپنا دوست سمجھتا ہے۔ یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 پہلا ہے۔ ان کے قریبی لوگوں نے ان کے کان میں نے ان کی حکومت اور ان کے خلاف بہت کچھ لکھا اور
 ہزاروں کے لئے کیا ہائیں کی گئیں ہیں انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 ہونے کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 نے کوئی نہیں آتا تھا۔ آج وہ اصل میں یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 پہلا ہے۔

گیلائی صاحب ایک چیز پر بڑے واضح تھے کہ مجھ سے دوستی کے تمام تر وعدوں کے باوجود
 انہوں نے یہ نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ سب صحافیوں کو بیرون ملک دوروں پر ساتھ لے کر جائیں گے لیکن مجھے
 نہیں ان کا خیال تھا کہ شاید میں ان سے عام صحافیوں کی طرح یہ کیوں گا کہ میرا نام بھی دوروں میں ڈالا
 جائے۔ شاید وہ بھول گئے تھے کہ اگر ہم غیر ملکی دورے کرنے والے صحافی ہوتے تو کیا ہم جنرل مشرف

میں نے اس کے دوستوں سے اس بار بھی فیصل کو بڑے کرنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔
 میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم ایجنٹ ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے قریبی دوستوں کے خلاف
 غریبوں کو بڑے پیرا۔ وہ ہم پر عظیم کیونٹی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

000

اب گیلائی صاحب طاعت پر رہا وہ نے قریب اس وقت لندن میں تھا۔ وہ اس کے دوستوں سے
 دن ہے۔ انہیں پھر ملنے لگے لندن میں اپنی پارٹی کے لیڈروں کا اہلاس انہیں انہیں دیکھنے کے لئے آیا اور
 تھا۔ مجھے ایک فون آیا۔ میں نے اٹھنا کہا تو دوسری طرف ان کے خلاف رہا گیلائی ہے۔ مجھے یہی
 تو کہہ رہی تھی کہ وہاں وہ لندن کیسے پہنچا گئے تھے۔ یہ تھا کہ وہ اپنی بی بی کے ساتھ سات سال
 بعد پاکستان سے باہر چلے گئے۔ وہاں نے اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے یہ ہے کہ وہ
 میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ان دنوں رسل اسکواڈ میں رہتا تھا۔ میں ان سے ملنے گیا تو وہ وہاں کی اپنی
 میں اپنے بچوں کے ساتھ کپ کپ کر رہے تھے۔ ایک ٹوبہ سے لڑائی میں اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔
 گیلائی صاحب کے ارد گرد سب لوگ اس کے ساتھ کو متاثر کرنے کے پتھر میں تھے۔ گیلائی صاحب بھی
 اس کا رخ میں اپنا حصہ ادا رہے تھے۔ انہوں نے کسی کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ کو متاثر کرنے کے پتھر میں تھے۔
 گرامین تاکہ اسے متاثر کرنے میں آسانی رہے۔ اس عمارت کو کوئی پھوٹی اگر چہ میں سمجھا گیا کہ وہ
 پاکستان کے بہت بڑے سیاستدان سے بات چیت کر رہی ہے۔ گیلائی صاحب کی ذات کے بارے
 میں اسے اور بھی بہت کچھ بتایا جا رہا تھا۔ اب اس مذاق میں گیلائی صاحب کے بچے بھی شامل ہو گئے
 تھے۔ میں چپ بیٹھا رہا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ یورپ کی ویسٹ کو بھلا پاکستان کی سیاست یا سیاستدانوں
 سے کیا لکھی ہو سکتی ہے۔ وہ ویسٹ میں حال پر فیصل ضرور بات کے تحت ایک ایک سے مسکرا کر ہنسی

رہی۔ اب مجھے پانچ ماہ کی ضرورت تھی کہ گیلانی صاحب کے ساتھ ساتھ کراچی
اور بھی اس نیکل میں شریک ہو گیا تھا۔ ہم سارے اس قسطنطنیہ سے لطف اندوز ہوئے رہے۔
اب سوچتا ہوں کہ کیا اس دن کو یہ یاد ہو گا کہ دو کئی ایسے مجلس کو سرور کرتی رہی تھی جو کراچی سے
پاکستان کا وزیراعظم تھے۔

ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ گیلانی صاحب نے مجھے بتا کر ان سے ملنے کے لیے آصف علی
زرداری کے ایک بڑے قریبی دوست فیصل خاں بٹ آ رہے ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ گیلانی
صاحب کہنے لگے کہ وہ انہیں کھانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی ان کے
ساتھ چلوں۔ میں نے محسوس کیا کہ گیلانی صاحب کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کی آنکھیں بھونٹے
سات سال بعد پارٹی میٹنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شاید سمجھ رہے تھے کہ پارٹی کے لیے پانچ سال
نیل میں رہنے کے بعد اور جبریل شریف کی ہر آخر ٹھکرانے کے بعد بینظیر بھٹو شاید انہیں بڑا پروتھون
دیں گی۔ تاہم، میٹنگ میں بینظیر بھٹو نے یوسف رضا گیلانی کو شاید وہ پروتھون نہیں دیا جس کے وہ واقعی
اقدار تھے۔ جب فیصل خاں بٹ وہاں پہنچے تو میرا ان سے تعارف ہوا۔ انہوں نے بھی تھوڑی دیر بعد یہ
بات محسوس کی کہ گیلانی صاحب کچھ بجے بجے سے تھے۔ فیصل بٹ بڑے سمجھدار نکلے۔ انہوں نے گیلانی
صاحب کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسی وقت اپنے موبائل فون سے آصف علی زرداری کو فون کیا جو اس
وقت نیو یارک میں تھے۔ انہوں نے یوسف رضا گیلانی کی آصف زرداری سے بات کرائی۔ فیصل بٹ
زرداری صاحب کو اشارہ دیتا چکے تھے کہ گیلانی صاحب کا موڈ کچھ بہتر نہیں ہے۔ آصف زرداری کو
احساس ہو گیا تھا کہ شاید لندن میں ہونے والی پارٹی میٹنگ میں ان کے جیل کے ساتھی کو وہ مقام نہیں دیا
گیا جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ زرداری صاحب بڑی دیر تک گیلانی صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر
باتیں کرتے رہے۔ اتنی دیر میں فیصل بٹ ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر کھانا کھانے کے لیے ایک
خوبصورت ترکش ریسٹورنٹ لے گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس ریسٹورنٹ کے اندر مستی اور
خوبصورتی ابھی ختم لے رہی تھی۔ میں گیلانی صاحب اور فیصل بٹ اس ریسٹورنٹ کے اندر ایک کونے
والی نیکل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں عربی موسیقی کی دھنوں پر عربی لڑکیوں نے وہ رقص پیش کیا کہ
ہم تینوں اپنی اپنی پریشانیاں بھول گئے اور ہمارے سامنے پڑی لذیذ ڈشیں بھی سانسوں کو گرم کرنے والے

اس معاملہ میں کب کی پڑی جلدی ہوئی تھی۔

۰۰۰

ایک دن بینظیر بھٹو نے شہزاد پارٹی کی ایک اور میٹنگ والی ہولی تھی۔ گیلانی صاحب نے مجھے
کہا کہ میں اس میٹنگ کے بعد ابجو سے روڈ پر آ جاؤں۔ تاریخ ہو کر وہاں میں ملے کر رہیں گے۔ جب میں
مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں اور گیلانی صاحب ابجو سے روڈ پر میل پہنچے گئے۔
میں نے محسوس کیا کہ وہ آج ایک دفعہ پھر چپ چپ سے تھے۔ آگے ایک عربی کی دکان پر گھر میں دیکھ
کر میرے من میں پانی بھرا آیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ مجھے پہلے یہ گھر میں لے آؤ۔
ہم ابھی وہیں سمجھ رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر انہیں زور سے پکارتا۔ گیلانی صاحب
بڑے حیران ہوئے کہ ابجو سے روڈ کی اس سرد شام میں بھلا ان کا کون جاننے والے اتنی بے تعلقی سے
ان کی کمر میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا تو شہباز شریف وہاں کھڑے سرکار رہے تھے۔
گیلانی صاحب اور شہباز شریف آٹھ سال بعد ابجو سے روڈ پر یوں مل رہے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک
خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دو تین منٹ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ شہباز
شریف ذرا سی جلدی میں تھے۔ وہ اجازت لے کر روانہ ہوئے۔ تقریر کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے۔
ان دونوں نے بھلا یہ کب سوچا تھا کہ چھ ماہ بعد ان میں سے ایک ملک کا وزیراعظم اور دوسرا پنجاب کا
وزیراعلیٰ بنے گا۔

میں نے اور گیلانی صاحب نے ایک مرتبہ پھر ابجو سے روڈ پر چلنا شروع کیا۔ انہوں نے مجھے کہا
کہ جنہیں پتہ ہے کہ ایک سیاستدان کتنے عرصے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے اس وقت
چاہے اور جہاں چاہے لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ گیلانی صاحب بھلا یہ کس طرح کی بات مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ میں
کیسے ان کے اس بیان کی تائید یا تردید کر سکتا تھا۔ خیر، میں نے بڑی سمجھداری سے ان کی بات سنی اور
جواب دینے کی بجائے چپ رہنا مناسب سمجھا کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایسے موقعوں پر جب کوئی شخص
اس طرح کی بات کرے تو اس کا مطلب بڑا واضح ہوتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی بات کرنے کے سوا میں تھا
لہذا اپنے آپ کو سمجھدار سمجھ کر بولنے کے بجائے بہتر ہے انتظار کر کے اس کی بات سنی جائے کہ آخر اس

کے من میں کیا ہے۔

میرا چہرہ ہر صبح صبح میں ہنستا تھا کیونکہ گیلانی صاحب نے پھر اپنی ذات سے جڑی ایک ایسی تاریخی کہانی سنائی جس سے مجھے سیاست دانوں کے حرائق اور نفسیات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ گیلانی صاحب بولے کہ آج جب بینظیر بھٹو صاحبہ پارٹی کی میٹنگ کی صدارت کر رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر پکاڑا کی ہائیکس سال پہلے کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ ایک سیاستدان بیس سال بعد لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کامیاب سیاستدان بھی وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لے۔ انہیں تو ساری عمر خود استعمال ہوتا رہے گا۔ گیلانی صاحب کا خیال تھا کہ بینظیر بھٹو اب اتنی بچہ سیاستدان بن چکی ہیں کہ آج انہیں محسوس ہوا کہ پکاڑا کی یہ بات سچی تھی۔ وہ جس طریقے سے پارٹی کے لوگوں کو اپنی کر رہی تھیں اس سے صاف واضح تھا کہ وہ نہ صرف سیاستدان کو سمجھتی تھیں بلکہ وہ سیاستدانوں کو استعمال کرنے کے فن سے بھی اچھی طرح آشنا تھیں۔

میں بینظیر بھٹو کے بارے میں گیلانی صاحب کا تبصرہ بھول کر ان سے پوچھنے لگا کہ بھلا یہ پکاڑا نے ان سے یہ بات کیوں اور کب کی تھی اور اس کے پیچھے کیا کہانی تھی۔ یوسف رضا گیلانی نے انکو لے روڈ پر چلتے چلتے مجھے بائیس سال پہلے کی وہ کہانی سنائی جو انہیں آج تک بھٹو کو دیکھ کر یاد آ گئی تھی۔

○○○

یوسف رضا گیلانی محمد حاکم جو نیچو کی حکومت میں ایک نوجوان وزیر تھے۔ ان کو وزیر بنے بھی کچھ عرصہ تھا۔ وزیر اعظم محمد یوسف صاحب پکاڑو کی پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواز شریف سے جس شخص تھی۔ پھر تو ان کو جیل خلیا مل گیا کہ یہ گتہ تھا کہ نواز شریف یہ سمجھتے تھے کہ وہ وزیر اعلیٰ پنجاب اس لیے تھے کہ ان کا صوبائی اسمبلی کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ یہ بات جیل خلیا سے یوسف نہیں سہی تھی کہ نواز شریف یہ سمجھیں کہ وہ اپنی وجہ سے وزیر اعلیٰ تھے نہ کہ جیل خلیا کی بدولت جیل خلیا نے اپنے جیل کی بات ہی پکاڑا کے سامنے رکھی۔ جیل خلیا کا کہنا اس کر ہی پکاڑا نے فرمایا کہ سائیں قمر نہ کریں۔ نواز شریف قلمک ہو جائیں گے۔ اگلے دن ہی پکاڑا نے یوسف رضا گیلانی کو بلایا اور انہیں کہا کہ آپ

پنجاب جائیں اور اپنے آپ کو وزیر اعلیٰ پنجاب کے طور پر ممبران اسمبلی کے سامنے پیش کرنا شروع کریں اور اپنے ساتھ چند بڑے بڑے سیاسی لوگوں کو شامل کریں۔ گیلانی صاحب نے پکاڑا کے کہنے پر پنجاب میں جا کر ڈیرے لگا دیے۔ وہ ان دنوں وزیر اعلیٰ تھے۔ ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشن سے آتے جاتے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے درجنوں اراکین اسمبلی نے ان کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وفاقی حکومت یوسف رضا گیلانی کو نیا وزیر اعلیٰ بنانا چاہتی ہے۔ جب بات زیادہ پھیل گئی تو بڑے بڑے لوگوں نے ان سے خفیہ رابطے کرنا شروع کر دیے۔ ان میں نصر اللہ دریلک، عاشق گوپالک، ملک اللہ یار کھٹا، محمد دم الطاف، رفیق لغاری اور دیگر بے شمار ایم این اے ان کے گروپ میں آ گئے۔ سب سے بڑی کامیابی اس وقت ہوئی جب چوہدری پرویز الہی نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ اور تو اور، حکمران کو بھی جب اس سارے معاملے کی ایک ملی تو وہ بھی گیلانی صاحب سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ یوں بہت کم عرصے میں گیلانی صاحب نے ایم این اے کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

یہ پکاڑا صاحب کو پیغام بھیجا گیا کہ جناب اب آپ تائیں کہ نیا وزیر اعلیٰ کس کو بنانا ہے کیونکہ نواز شریف کے خلاف بغاوت ہو چکی ہے۔ یہ صاحب سیاست کے پرانے گھاگ تھے۔ انہوں نے نوجوان گیلانی کو کہا کہ انتظار کرو۔

گیلانی صاحب ابھی لاہور میں تھے اور اپنے تئیں اپنی مرضی کے وزیر اعلیٰ کا نام سوچ رہے تھے کہ پتہ چلا کہ نواز شریف جیل خلیا ملنے سے ملنے کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے ہیں۔ نواز شریف کو احساس ہو گیا تھا کہ جیل خلیا سے ملنے کے لیے ان کی وزارت اعلیٰ نہیں چلے گی۔ جیل صاحب سے ملنے گئے اور اپنی وفاداری کا سہارے سے صاف علیحدہ۔ جب جیل خلیا نواز شریف کی ملاقات ختم ہوئی تو جیل خلیا ملنے نے ایک بیان جاری کیا کہ نواز شریف کا حکم مسترد ہے۔ وزیر اعظم محمد حاکم جو نیچو نے بھی یہ بیان دیا کہ پنجاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہی کسی سربراہ صاحب پکاڑا کے بیان نے پوری کر دی کہ نواز شریف کی بوری میں سوراخ تھا جس کی میں نے سلاخی کر دی ہے۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔

جونہی یہ خبر لاہور پہنچی، سارے کے سارے ایم این اے نواز شریف کو بھگ گئے۔ ان سب کو

احساس ہو گیا کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ ان سے زیادہ گیلانی صاحب کو احساس ہوا کہ مجھے جزل فیاء
میر جان جو نج اور بی پکا زونے مل کر استعمال کیا تھا۔ میں بڑے بچھے دل کے ساتھ بی پکا زون صاحب سے
میلے گیا اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا۔

وہ مسکراتے اور بولے بچے ایسے سیاست ہے۔ نواد شریف جزل فیاء کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔
میں نے جزل فیاء سے کہا کہ ہم نواد شریف کو ٹھیک کر دیں گے۔ اب ہم نے ایک ایسے بندے کا
انتخاب کیا تھا جس کو استعمال کر کے نواد شریف کو سبق سکھایا جاسکتا۔ میری نظر تمہارے اوپر پڑی۔ تم
نوجوان ہو۔ تمہاری ابھی سیاست میں پوری گریڈ مہلتی نہیں ہے۔ مکان کے ایک بڑے سیاسی گھرانے
سے تمہارا تعلق ہے۔ دوسرے تم میرے رشتہ دار ہو لہذا تمہارے لیے ایم پی ایز کو یقین دلانا آسان تو
گودنواد شریف کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ مل جائیں۔ شکر ہے میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ تم نے مجھے
بایں نہیں کیا۔

گیلانی صاحب نے نوے دل کے ساتھ کہا کہ اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے استعمال کیا
ہے۔

بی صاحب مسکراتے اور بولے جی ہاں امیں نے آپ کو استعمال کیا ہے۔

ایک گھنٹہ خورد و گیلانی نے سیاست کے گرد سے پوچھا کہ ایک سیاستدان کب اس قابل ہو
جاتا ہے کہ وہ اب چاہے کسی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔
بی صاحب نے کہا۔ میں سال بعد۔

○○○

ایم نے روتا پٹنے اور بچھے ایک لمبے میں یہ بات بکھ آگئی تھی کہ یوسف رضا گیلانی کے
کیلے کا کیا مطلب تھا اور انہیں ڈانچہ پہنو کو آج پارٹی کی میٹنگ میں کیوں بی پکا زون کا ہاتھ سال ہا ہا
فریاد کیا تھا۔

میں نے مسکراتے اور بچھے گیلانی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو سیاست میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔
میری بات کا مطلب کچھ کہہ دے کہ وہ روتا پٹنے میں۔ وہیں وہ کہانی باتیں کریں گے۔

اندھن میں ہونے والی اس ملاقات کے ٹھیک سات ماہ بعد مارچ 2008ء کی ایک شام میں گھر
پہنچے تو پتہ چلا کہ یوسف رضا گیلانی گھر پر ایک ایک دے کر گئے تھے۔ وہ ایک اپنے وزیراعظم بٹے کی
بہرہ دگی کی خوشی میں تھا۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ طرفی تھی کہ انہوں نے یہ بات یاد رکھی کہ جس دن وہ اس ملک
کے وزیراعظم بن رہے تھے اس صحنی کے گھر جا کر انہوں نے ایک دینا تھا جو کبھی ان سے چیل میں آ کر
میتا تھا۔

○○○

جب گیلانی صاحب وزیراعظم بنے تو ان کے لیے سب سے بڑا چھان کے دوست تھے جو
ان کے ساتھ ان پانچ سالوں میں چیل میں رہے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے گھسے کا گھر تھے۔ اگر وہ چیل
کے دنوں کے ان دوستوں کو بھلاتے تو ان پر یہ الزامات لگتے کہ وہ ایک خود غرض اور بے ایمان تھے
جو اقتدار میں آتے ہی بدل گئے تھے لیکن اگر وہ انہیں اہمیت دیتے تو پھر ان کی اپنی بدنامی ہوتی تھی۔ اور
بدنامی ہو کر ری کیونک چیل کے دنوں کے ان ساتھیوں نے ہر جگہ یہ بتانا شروع کر دیا کہ وزیراعظم کے
ذاتی دوست ہیں۔ کسی نے کہیں پانوں پر قبضہ کر لیا تو کسی نے چوری کی کسم پازیاں اپنے ہم کرانی
شروع کر دیں۔ کوئی ان کا نام استعمال کر کے فرانسفر ہسٹنگ کرانے لگ گیا تو کسی نے جیسے پکڑنے
شروع کر دیے۔ جب مجھ تک اس طرح کی خبریں پہنچیں تو میں نے گیلانی صاحب کے خلاف زوردار حم
کی سنوریاں فائل کیں۔ گیلانی صاحب کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب میں نے اپنے اخباری غور میں
ایک خبر لکائی کہ جس دن مکان میں پادرو لوسر کے تاجر لوڈ شپنگ کے خلاف ہنگامے کر رہے تھے اور
پہرے فیر کو آگ لگی ہوئی تھی، اسی شام گیلانی صاحب ہر یہ ہاؤن میں ملک ریاض کے گھر ایک بہت
بڑی دعوت میں شریک تھے۔ ان کے نزدیک چلتے ہوئے مکان ہانے سے ملک ریاض کے گھر دعوت
میں ہانا زوردار اہم تھا۔

یہ طرہ پر چھ کر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری اور گیلانی صاحب کی اتنی فرعی دوستی تھی اور میں
ابھی ان کے خلاف اتنی بڑی خبر فائل کروں گا۔ مجھے بعد میں وزیراعظم گیلانی کے پائل ٹاف آلیسر
نادر سلطان نے بتایا کہ جو فیکس صبح اس نے خبر پڑھی تو اس نے وزیراعظم گیلانی کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ

وہ تو رواف کو اپنا دوست سمجھتے تھے جبکہ آج اس نے ان کے خلاف دی گواہی میں اپنے بڑی گمراہی کی حق
میں سے ان کا انجیل ہی طرح مٹا کر رکھا۔

کیا مانی صاحب نے خاتمہ سلطان کو کیا کہ آج کے بعد انہیں روضہ کی کسی بھی طرحی اپنا راج
وہ اپنے کے لیے فون نہ کریں کیونکہ وہ ان دنوں میں میرے حق میں کچھ نہیں کہتا تھا وہ مجھ سے ملنے کے
لیے ادا راج میں کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ ایک صحافی ہے اور یہ اس کا کام ہے۔ دوسری کا مطلب یہ نہیں ہے
کہ وہ میری اور خاتمہ کے درمیان ہے۔

گیمانی صاحب ایک بڑے عقل و فطرت میں اس ملک کے وزیر اعظم بنے تھے۔ انہوں نے کئی
 عرصے سوچا تھا کہ وہ ایک دن بینظیر کی جگہ لگا کر اپنی عہدہ سنبھالیں گے۔ قیل سے۔ ہائی کے بعد ایک
 اعلان سے بات ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ ان کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ یہ خواہش تھی کہ وہ قومی
 اسٹیبلشمنٹ کے وہ ادارہ بنائیں جو ان کے ہاتھ میں ہوں تو انہوں نے انہیں پانچ سال قبل میں رکھا انہیں یہ خیال
 چلا ہوا ہے کہ ایک دلدادہ بھروسہ سے یہ کارنامہ کرنے میں جہاں سے انہیں ہتھیاروں کا کرپشن چھپا کر
 لیا۔ اگر کسی بھی وجہ سے وہ انکار نہ کریں تو ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ بھروسہ شاہ جعفر بن بھروسہ
 ان ہاتھ میں۔ ہوں بینظیر کی موت کے بعد صاحب وزیر اعظم بنے تو بڑے عرصے تک تو انہیں یہ عقول تھی
 انہیں ان کا حال اب وہ اس ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ چنگل پارٹی کی ہاؤس میں صرف 125 عظیم ہونے
 کی وجہ سے ان کے وہ اس پارلیمنٹ میں نہیں تھے کہ وہ اپنی مرضی کی حکومت بنا سکتے۔ اوپر سے ہلال شرف
 ایک عہدہ کے طور پر دیتے تھے۔ ہلال شرف ہے تو ان کی جگہ عہدہ آصف زرداری نے لے لی۔ اوپر
 سے ان کی اہلیہ کا دستہ لگا ہوا تھا۔ بھروسہ نے ان کی اہلیہ کا لفظ استعمال کیا اس سے ان کی اہلیہ کا
 کے بعد ان کو وزیر بنا دیا۔ ہلال شرف پارٹی سے وابستہ رہتے تھے وہ بھروسہ نے زرداری کو پ کے
 تھے۔ ہوں پارٹی دن سے ہی گیمانی صاحب کی حکومت کو گورننس کر کے کاروبار میں لایا اور انہوں نے
 کرپشن کی۔ وہ ایک ایسے بادشاہ ہیں اور عہدہ زرداری ان کی صلاحیتوں کو صرف سیاسی مسئلوں پر
 صرف کرنا چاہتے تھے اور گیمانی صاحب نے انہیں انہیں ہاؤس میں رکھا۔ اب حالت یہ ہے کہ وزیر اعظم
 کو صرف رہنا گیمانی ہیں لیکن ان کا کسی بھی وزارت پر علم نہیں رہتا۔ وہ عہدہ زرداری اور چنگل پارٹی
 انقلاب میں اور وہ لفظ استعمال کرنے والوں کو بچ کر رکھتے۔ اسی وجہ سے اسلام آباد میں

دورانی ایک سے لاکھ کر ایک سیڑیوں سے ملتا ہے۔ گیانی صاحب کو ان سیڑیوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔
 شاہان کے خیال میں اگر کرناٹک اٹکا ہوا ہو تو پھر نو از شریف، ریشہ از شریف، آصف از شریف اور
 دیگر شاہان نیز جو کرناٹک کے اطرافات پر جیلوں میں رہے۔ وہ وہاں رہاقتدار میں رہتے۔ لوگوں کے
 اس کیا پراس ہے۔ شاہ گیانی صاحب بھی دیگر حکمرانوں کی طرح عوام کی اس نگرانی سے کہیں رہے
 تھا اور اس کے لشکروں میں عوام کو ایک نیل کیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی ہم سے بھڑھے تو ہمارا ہے اور اسے
 حکمران کاٹو۔

گیمانی صاحب اور ان کے خاندان پر کرنا ان کے بہت سارے الزامات گئے رہے ہیں۔
 ایک دفعہ میں نے ان کے بیٹے موسی گیمانی کو گورنمنٹ کے مختلف معاملات میں ضرورت سے براہ مہربانی
 سے دیکھا تو میں گیمانی صاحب سے کہے بغیر دوسرا کاروبار کیا کر رہے تھے۔ آپ کے بیٹے نے
 کہ بہت ساری باتیں کہیں کیا اور آپ نے اسے تاکید کیا کہ پورا سارا حساب پہلے اس کی تعلیم مکمل کرنا
 پورا کرنا سب سے پہلے ہے۔ گیمانی صاحب نے اس پر اتفاق کیا اور انہوں نے اس کے بیٹے کو
 موسی گیمانی کو پڑھنے کے لیے لکھا اور گیمانی صاحب نے اس کے بعد میں نے جگہ سے
 اپنے ایک کالم میں موسی کی کسی بات پر تنقید کی تو اس کا لکھا انہوں نے اس پر تیرا اور میں نے موسی کے والد
 کو یہ قصہ کیا تھا کہ میرے والد نے آپ کی بات سن کر لکھے تمام معاملات سے ہٹا کر پڑھنے کے لیے
 لکھا اور گیمانی صاحب نے اس پر بھی میرے والد پر تنقید کر دی ہے۔ میں نے انہوں کی بات میں لکھے کہ وہ
 گیمانی صاحب کے والد کے بارے میں بھی حساب کتاب کیا ہے۔

[illegible]

کے سب مشہور صحافی ایک جہت سے اکٹھے تھے۔ اچانک ان سب کے سب نے "ایٹا" کی وی انگلیں کی
 انگلی پر ہنر مند ہونے ان سے پوچھا گیا کہ گیلانی صاحب اساتذہ کے آپ نے لاہور انٹرنس میں ہمارے
 گھر خریدے ہیں۔ راشدہ کے سوال پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔ ایک لمحے کے
 لیے پوچھنے ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب صحافیوں نے وزیراعظم گیلانی کی طرف دیکھنا شروع کیا کہ
 اب وہ کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ سوال شوکت عزیز، ہزول
 پرویز مشرف یا نواز شریف سے کیا جاتا تو انہوں نے اس رد و رز کی زندگی حرام کر دیتی تھی۔ گیلانی صاحب
 نے نہ سے دھجھے لہجے میں کہا کہ اگر خریدے ہیں تو چھپ کر نہیں خریدے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف
 دیکھ کر کہا کہ کسی اور نے کوئی سوال پوچھا ہو تو پوچھ لے۔ یوں ایک لمحے میں انہوں نے اپنے خلاف ایک
 سیکڑ لکھ کر دیں ختم کر دیا۔ انہوں نے اس کی کوئی لمبی چوڑی وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے
 بعد میں نے بھی ان کے ان چار گھروں والا معاملہ اخبارات یا ٹیلی ویژن میں متعلقہ پر نہ بھی پڑھا اور نہ سنا۔

گیلانی صاحب سے پوچھتے گئے اس سوال کا موازنہ اب نواز شریف سے جولائی 2010ء کے
 پہلے دفعے میں لاہور کے ایک صحافی کی جانب سے پوچھتے گئے سوال کے جواب میں دکھائے گئے رشیدیہ
 داخل سے کریں۔ وہ لاہور بار بار ہونے والے خوفی حملوں کے بعد ان سے ایک رپورٹر نے جرأت کر کے
 صرف اتنا ہی پوچھا کہ میاں صاحب! آپ کی سکیورٹی پر سیکنگزوں کی تعداد میں پنجاب پولیس کے لوگ
 تیزی سے ہیں۔ یہ سن کر میاں صاحب بڑھک اٹھے اور انہوں نے رپورٹر کو غصے میں جواب دیا کہ یہ
 آپ نے مجھ سے کس طرح کا سوال پوچھا ہے۔ میاں صاحب نے فوری طور پر اس سوال کو یہ کہہ کر مسترد
 کیا کہ صحافی نے ان کی ذات پر حملہ کیا ہے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہماری صحافی دوست راشدہ میاں
 صاحب سے اسی طرح کا کوئی سوال پوچھ لیتی جیسا انہوں نے یوسف رضا گیلانی صاحب سے پوچھا تھا
 تو کیا رد عمل ہوتا تھا۔

لگتا ہے کہ گیلانی صاحب نے یہ سوچ لیا ہو کہ عوام اور میڈیا کچھ بھی کہتے رہیں، وہ وہی ہنر
 کرتے رہیں گے جو ان کے سیاسی مٹاؤ میں ہے۔ ایک بات طے ہے کہ گیلانی صاحب اس پائے کے
 لیڈر نہیں ہیں جس کی ایس ان برسے وقتوں میں ضرورت ہے۔ وہ شریف اور مرآت بھرے انسان ضرور
 ہیں لیکن قابل نہیں ایسے ان کی جو بات اچھی لگتی ہے وہ ان کا قوت برداشت ہے جس کو صحافی ہونے کے

دل میں ایسا پہنچ کر نے کے گوش میں لگا رہا ہوں لیکن سب کا لکھا ہے کہ وہ ہر لمحے لگا رہا۔
 گیلانی صاحب قوم کی قسمت ہال نہیں لڑتے ہال نہیں لکھن لکھنے لکھنے ان کی ان کے کچھ ہال
 رشتہ داروں اور دوستوں کی قسمت ضرور بدل دی ہے۔ اس سے زیادہ شاید گیلانی صاحب کو خود بھی
 ہے اور نہ ہی طالب !!

ذوالفقار علی بھٹو

انٹرویو: اورینٹل

میں دو دعوت نامہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ یہ دعوت ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے تھی۔ میرے پاس کوئی بہانہ بھی نہیں تھا کہ میں اسے مسترد کرتی۔ مجھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو میں راولپنڈی پہنچ جاؤں۔ میں حیران ہوئی کہ اتنی جلدی کیوں؟ یہ بات درست ہے کہ ہر صحافی کی زندگی میں یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایک دفعہ وہ لوگ خود دعوت دے کر ملنے کی خواہش کا اظہار کریں جو اس وقت آپ سے ملنے سے انکاری ہوتے ہیں جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

میرے ذہن میں مختلف باتیں آنے لگیں۔ بھٹو صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ مجھے اندرا گاندھی کے نام کوئی پیغام دیکر بھارت بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے یہ مفروضے خود ہی مسترد کر دیے۔ بھٹو صاحب کو اپنے دشمن کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے مجھ جیسی صحافی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہ کام سولس اور رومی سٹار کلاؤں کے ذریعے بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی لیکن وہ بھی میں نے فوری طور پر مسترد کر دی کیونکہ بھٹو صاحب ایک تہذیب یافتہ شخص ہیں اور ایسے لوگ اپنے مہمانوں کو بلا کر قتل نہیں کرتے۔ ایک اور خیال آیا کہ شاید مجھے بلا کر اپنا انٹرویو دینا چاہ رہے ہوں اور میں ایک طرح کا سربراہان میرا انتظار کر رہا تھا۔ شاید یہی بات بھٹو صاحب کے

ذہن میں آئی تھی، انصافاً جب سے انہوں نے ہنگامہ شکن کے پرنسپل صدر محبوب الرحمن کے بارے میں ہر ایک مضمون پڑھا تھا۔

آخر میرا تجسس میرے شک پر حاوی ہو گیا اور میں نے بھٹو صاحب کی یہ دعوت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم، یہ دعوت قبول کرنے سے پہلے میں نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ ان کے مہمان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میں کھل کر ان کے بارے میں جو چاہوں دو ٹوک لکھ سکوں گی۔ میں جیسے ہریان کے بارے میں اپنی مرضی کا تاثر لکھتی ہوں اسی طرح میں ان کے بارے میں بھی لکھوں گی۔ کوئی بھی حق چاہے وہ اچھے آداب ہوں یا میری خوشامد، مجھے ٹکس دینے نہیں کی۔

بھٹو صاحب کا جواب آیا کہ یقیناً آپ کا جوابی چاہے ہی لکھیے گا۔

یہ میرا بھٹو صاحب کے بارے میں پہلا تاثر تھا۔

بھٹو صاحب ایک ایسے شخص ہیں جن کے بارے میں کوئی بات حقوق سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنی تیزی سے اپنا ذہن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب شخص ہیں جو اسی طرح کے فیصلے کرتے ہیں۔ تاہم، یہ بات مانتی چڑے گی کہ وہ بہت ذہین شخص ہیں۔ وہ ایک لوجسٹک طرح بہت چالاک۔ ہریان کو اپنی خوب صورتی سے متاثر کرنے والے یا انہیں کنفیوژ کرنے والے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان میں آپ کو ایک کلچر، روانی اور گہری یادداشت کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

جب میں راولپنڈی ایئر پورٹ پر اتری تو دو افسران نے مجھے روک لیا۔ دونوں نے مجھے بتایا کہ صدر پاکستان ایک گھنٹے کے اندر اندر ان سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں صبح کے دس بج رہے تھے اور میں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے نہیں سو پائی تھی۔ میں نے ان دونوں افسروں کو بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر ہرگز ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت مجھے ایک اچھے ہاتھ اور خیریت کی ضرورت ہے۔

شاید یہ بات اگر کسی اور صدر کے لیے مجھ جیسی صحافی نے کی ہوتی تو وہ شاید ان کے لیے بہت بڑی توجہ ہوتی لیکن بھٹو صاحب نے اس بات کا برا نہیں منایا۔ انہوں نے اس ملاقات کو شام ساڑھے سات بجے تک یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ وہ رات کو کھانے پر میرا انتظار کریں گے۔ جب میں شام کو بھٹو صاحب سے ملنے گئی تو بھٹو صاحب نے کھلے بازوؤں اور مسکراتے چہرے

کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میرے سامنے ایک ایسا دروازہ تھا جس کا اندازہ تھا کہ ایک ایسے ڈنگر کی طرح تھا جو آپ سے اپنے ہونک میں اکاؤنٹ کھلوانا چاہتا ہو۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کی عمر چالیس برس ہے لیکن مجھے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑے لگے۔ ان کے سر کے بال ہلکا سا شروع ہو چکے تھے اور جو باقی بچ گئے تھے وہ بھورے تھے۔ ان کی گہری پکوں کے نیچے ان کا چہرہ گلابی، ہونٹ، حتیٰ کہ آنکھوں کی پتلیاں بھی گھٹے بھاری لگ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیا کہ بھنو صاحب کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب سی اداسی نظر آتی۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا۔

بہت سارے طاقتور لیڈروں کی طرح بھنو صاحب میں بھی بہت زیادہ شرمیلا پن ہے۔ ان میں اور بھی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو آپ کو اندرا گاندھی میں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ بھنو صاحب کو جتنا بنور پڑھتے جائیں گے آپ اتنے ہی زیادہ کنفیوژ اور غیر یقینی نتائج اخذ کرتے جائیں گے۔ آپ بھنو صاحب کو کئی طریقوں سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ جس طریقے سے بھی دیکھیں گے وہی آپ کو درست لگے گا۔ بھنو صاحب آپ کو ایک لبرل، ایک سخت گیر حکمران، فاشٹ، کمیونسٹ، ایک انتہائی مفلس اور ایک چھوٹے مفلس بھی لگیں گے۔ مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ بھنو صاحب ہمارے وقت کے سب سے زیادہ مشکل لیڈر ہیں۔ اگر پاکستان نے آج تک کوئی انتہائی دلچسپ چیز پیدا کی ہے تو وہ خود بھنو صاحب ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر اس وقت کوئی بھی پاکستان کو محفوظ رکھ سکتا ہے تو وہ بھنو صاحب ہیں۔ آپ کو یہ بات ہر کوئی بتائے گا کہ بھنو صاحب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اگر بھنو نہ رہا تو پاکستان بھی دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔

جب آپ یہ بات سوچتے ہیں تو پھر آپ کے ذہن میں اندرا گاندھی کی بجائے اردوان کے شاہ حسین کا خیال آتا ہے۔ شاہ حسین کی طرح بھنو صاحب پر بھی یہ الزام لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی قیادت کر رہے ہیں جو مصنوعی طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ وہ بھی شاہ حسین کی طرح سودیت پر نہیں، اظہار، چاٹا اور امریکہ کے درمیان ایک پھنسا ہوا ہے ہوئے ہیں۔ شاہ حسین کی طرح وہ اس بات پر اٹل ہوئے ہیں کہ وہ کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس کی صورت میں جان کینڈی کی طرح ہیں۔ وہ ایک ایسے دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں کوئی چیز ناممکن نہیں تھی کہ آپ کو اس طاقت بھی حاصل کر لیتے ہیں چاہے اس پر کتنی ہی قیمت کیوں نہ صرف

ہو۔ کینڈی ہی کی طرح بھنو صاحب نے بھی بڑا خوبصورت، آرام دہ، طویل اور بڑا اچھا بھیا گزرا ہے۔ جان کینڈی کی طرح ہی وہ اقتدار کی لٹام گردشوں میں اوائل عمری میں ہی داخل ہو گئے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بھنو صاحب جاگیرداروں اور شرافت کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے بنگلے اور پھر آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی جہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف میں ڈگری لی۔ ابھی ان کی عمر تیس برس سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی کہ وہ ایوب خان کی کابینہ کے وزیر بن چکے تھے کہ چھوٹے ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ابھی چالیس سال کی عمر پوری ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ وہ جیل جی خان کے وزیر بن چکے تھے اور ان سے بھی وہ نفرت کرتے تھے۔ بھنو صاحب بہت تکلیف دہ ممبر کے مراحل سے گزرنے کے بعد ایوب خان صدر میں براہیمان ہوئے۔

طاقت محبت سے زیادہ بڑا جذبہ ہے اور جو لوگ طاقت سے محبت کرتے ہیں ان کے نہ صرف وعدے بلکہ ناک بھی طاقتور ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی خوشبو میں ٹھک نہیں کرتیں۔ بھنو صاحب نے بھی اس طرح کی بڑی خوشبوؤں کو ناپسند نہیں کیا کیونکہ بھنو صاحب کو بھی طاقت سے پیار ہے۔ تاہم، جس طرح کے پاور سے وہ پیار کرتے ہیں اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ وہ خود بھی اس بات کا جواب انتہائی مبہم انداز میں دیتے ہیں۔ وہ ان سیاستدانوں کے بارے میں آپ کو پہلے سے ہی خبردار کر دیتے ہیں جو سچ بولتے ہیں یا ایک بوائے اسکاؤٹ مورائٹی کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ جب آپ بھنو صاحب کو سن رہے ہوتے ہیں تو آپ تقریباً اس بات پر یقین کرنا شروع ہو کر دیتے ہیں کہ شاید ان کی خواہشات بہت اچھی ہیں اور وہ یقیناً ایک اچھا سوشلزم پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم، جب آپ کراچی میں ان کی شاندار لائبریری میں داخل ہوتے ہیں تو آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سولہویں اور پندرہویں صدی کی کتابوں کو کتنے احرام کے ساتھ سطر کی جلدوں میں رکھا گیا ہے۔ جتنی غلاست سے سولہویں اور پندرہویں صدی کی کتابیں کو دہاں لائبریری میں رکھا گیا ہے تو آپ اس عجیبے پتھریچے میں کہ وہ کتابیں محض اس وجہ سے وہاں نہیں رکھی گئیں کہ اس لائبریری کا مالک انہیں ایک فہرست میں رکھنا چاہتا تھا۔ آپ کے اندر رقبہ اور فضا بھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بھنو صاحب سے پوچھتے ہیں تو آکھ پتھ چلتا ہے کہ ان کے دواغھے دوست، مکار اور دھوکہ باز ہیں اور آپ کو ایک عجیب سی اذیت ہوتی ہے۔ کیا بھنو صاحب نے کوئی خفیہ خواب دیکھا ہے کہ وہ ایک دن لائبریری کے

یہ ایک نیا نمبر ہے اور اس سے پہلے کا نمبر ۱۰۰ ہے۔ اس سے پہلے کا نمبر ۱۰۰ ہے۔
آئی ہے اور اس کی طرف سے اس سے پہلے کا نمبر ۱۰۰ ہے۔
اس سے پہلے کا نمبر ۱۰۰ ہے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ نے مجھے دالہ کر ان کا ریت کی ایک بات یاد آ گئی تھی یہ اس سے
روجہ ہو گئی، جیسا کہ وہ اپنی بات کے بارے میں بچھا تھا جن کے اس نے ایک لیلی و جان و دار کے
علاقہ کے لوگوں سے کہے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کبھی بھی سربراہ مملکت کو متنبہ نہیں کر سکتے اگر آپ اس
کے اور صرف ایک انسان مخالف کہہ رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس کے اور ایک آدمی کو نہیں دیکھنا چاہیے
کیونکہ جس لمحے آپ یہ یا متنبہ ہوتا ہے کہ وہ بھی محض ایک آدمی ہی ہے جس کے اندر آپ کی طرح
کی خواہاں اور ناہیاں ہیں تو پھر نہ پتا ہے کہ وہ نے بھی آپ اس سربراہ مملکت کو پسند کرنے لگتے ہیں اور
باقی اہم ہول ہاتے ہیں۔

○○○

بھنو صاحب کے اس اندر دلو کے چھپنے کی دیر تھی کہ ایک نیا شور شرابہ شروع ہو گیا۔ یہ ہنگامہ محض صحافیانہ انداز کا نہیں تھا جیسے کہ امریکی دوزخ خارجہ ہٹری کیسٹلر کے سلسلے میں کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کی نوعیت سفارتی اور عالمی بھی تھی۔ جیسے بھنو صاحب اندرا گاندھی کے اندر دلو میں اپنے بارے میں ان کا یہ تبصرہ پڑھ کر بڑے قے میں آ گئے تھے کہ وہ ایک غیر متوازن شخص ہیں۔ اسی طرح اندرا گاندھی بھی بھنو صاحب کا یہ فقرہ پڑھ کر بہت ناراض ہوئیں جب انہوں نے مسز گاندھی کو ایک ایسی درمیانی ذہانت کی عورت قرار دیا جس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر اپنے والد نہرو کے مقابلے میں اس میں آدمی خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ بھنو صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ اندرا گاندھی سے ملنا اور ہاتھ ملانے کے بارے میں سوچ کر انہیں ہمیشہ ایک چڑی رہتی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اندرا گاندھی کا بھنو صاحب کے ایک تبصرے سے ناراض ہونا واقعی درست تھا کیونکہ میرے خیال میں بھنو صاحب نے وہ تبصرہ مسز گاندھی سے اپنی نفرت کی بنیاد پر کیا تھا نہ کہ انہوں نے انصاف کے تقاضوں سے کام لیا تھا۔ مجھے خود بھی بھنو صاحب کی یہ بات سن کر ناہمی

اسی کی بدولت ہی اور یوں نے انہیں دوسرے کی خوشحالی کی تھی۔ میں نے ان سے بار بار بات کی کہ
 آپ سزا کا ہو گی کے ساتھ بااقتدائی کو نہیں کر رہے ہیں۔ ۴ اہم صاحب نے میری بات کو لیا اور
 اسے نہیں دیا ہی بلکہ اس کے بعد انہوں نے انورا کا ہو گی کے بار سے تیار کچھ انکی باتیں ہی کہیں
 اس میں میں نے اپنے اندر وہ ہیں شائع کرنا صاحب نہیں سمجھا تھا لیکن ان کی اپنی مشورہ کے بار اور
 دل کا وہ نہیں ہوا۔ اس اندر وہ کا نتیجہ بہت خشنی فیض نکال دیا آپ کو کہیں کہ انکا کیا اس کا ذریعہ دار
 ہونے سے ہی ہیں خود تھی۔ جن دنوں یہ اندر وہ شائع ہوا انہی دنوں انورا کا ہو گی اور علم صاحب
 ہاتھ دے کے ان کے درمیان ہنگ کے بعد صلح کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے ملے والے تھے۔
 انہوں نے ان کے درمیان ہنگ کے بعد صلح کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے ملے والے تھے۔
 اب بھنوسا صاحب کا یہ اندر وہ بدولت کی کچھ خیارات ہیں چند اقتدار کے ساتھ پہنچا تو انہوں کا ہو گی
 ہنگ نہیں۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھنوسا صاحب کا یہ پہلا اندر وہ ہے جس کا پتا ہی نہیں اور
 انہوں نے روم سے فصد ہی طور پر اس اندر وہ کا سارا ٹیکسٹ منگوا دیا۔ بھنوسا صاحب کا یہ سارا اندر وہ ہے جس
 کے بعد انہوں نے یہ اعلان کیا کہ اب وہ پاکستان کے وزیراعظم سے ملاقات نہیں کریں گی۔ یہ سن
 کر بھنوسا صاحب مزید فصد میں آ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنا فصد کس پہ لگا لیں۔ آخر انہوں
 نے اپنی توہین کا رخ میری طرف کر لیا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر انکی میں پاکستانی سفیر کے ذریعے مجھے
 طلب کیا۔ بھنوسا صاحب نے مجھے ادیس ابابا (شہر کا نام) میں ڈھونڈ نکالا جہاں میں ایک اور اندر وہ کرنے
 کی بدولت تھی۔ اس سفیر نے مجھ سے بہت غیر معمولی درخواست کی۔ وہ بولے کہ میں ایک دوسرا آرٹیکل
 لکھوں جس میں میں یہ کہوں کہ میں نے کبھی بھنوسا صاحب کا اندر وہ نہیں کیا تھا۔ یہ محض ایک خواب تھا اور
 اسی کی بنیاد پر میں نے وہ سب کچھ لکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یہ لکھوں کہ انہوں نے کبھی کے بارے میں
 انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی بلکہ یہ رائے میرے اپنے خیالات کی پیداوار تھی۔

پہلے تو مجھے بھٹو صاحب کی بھیجی ہوئی یہ فرمائش کی سمجھ نہیں آئی۔

میں نے پاکستانی سفیر سے کہا کہ آپ نے کیا کہا؟

دو لڑکے کہ میں آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ ایک نیا کالم لکھیں اور اس میں یہ لکھیں کہ پراسرار اندرونی آپ کی اپنی روحانی تخلیق تھا، خصوصاً جو کچھ مسز گاندھی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ میں چاہتی کہ آپ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں کا وزیراعظم بھی پاگل ہو گیا ہے۔

پاکستانی سفیر نے کہا کہ مس قادی آپ یہ بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ ساتھ کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کا انحصار آپ پر ہے۔ ان کی زندگی اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے اس پر غصہ بھیجی اور کہا کہ بھاڑ میں جاؤ۔

تاہم، بہنو صاحب نے بہت قہقہے ہاری اور وہ میرے پیچھے لگے رہے۔ میں جہاں بھی جاتی تو میرے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم پاکستانی تعاقب میں لگا رہتا جس کا کام ایک ہی تھا کہ وہ مجھ سے ایک ہی درخواست کرے کہ میں بہنو صاحب کے اس اندرونی کی تردید کروں۔ یہ پاکستانی مجھے یہ بات یاد دلانا نہ بولنے کے ساتھ کروڑوں لوگوں کی زندگیوں میرے ہاتھوں میں تھیں۔

آخر تک آکر میں نے ایک دن جواب دیا کہ میرے ہاتھ اتنے بڑے نہیں ہیں کہ میں ساتھ کروڑوں لوگوں کو اپنی دو ہتھیلیوں میں تمام سکوں۔ میں نے اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ ان پر چلائی کہ ان کا مطالبہ نہ صرف امتحان ہے بلکہ میری توہین کے بھی مترادف ہے۔

آخر میرے سر سے اس وقت یہ عذاب اتر جب اندرا گاندھی نے بہت بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہنو صاحب سے امن معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اندرا گاندھی نے اس طرح کا ہتھوڑا پیچھے بہنو صاحب نے ان کے بارے میں اتنے توہین آمیز بیانات کہی دیئے ہی نہیں تھے۔

اب میں نے ان دونوں کو ٹیلی ویژن کیمروں پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور مسکرائیں تبدیل کرتے دیکھا تو میں نے بڑا الجھا لیا۔ اندرا گاندھی کی مسکراہٹ میں فاحشانہ پن صاف نظر آ رہا تھا۔ میں اس مسکراہٹ میں ۱۹۷۱ء کی سکتی تھی۔ بہنو صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اپنی ٹی وی کی ایک ایڈوائس سکرین پر بھی آپ ان کی شرمندگی کو واضح محسوس کر سکتے تھے۔

○○○

بہنو صاحب نے مس قادی میں آپ سے ملنے کا بہت اصرار کیا تھا۔ ٹیلی ویژن پر یہ کہ آپ وہاں نہ جاتی ہیں انہوں نے شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں جاکھنسا ہے۔ مجھے آپ کا وہ مضمون بہت پسند آیا اور شاید اس وجہ سے بھی۔ لیکن یہ بات یاد کرنا اچھی نہیں آتا کہ آپ نے اس میں لکھا کہ اس کا کہیں بار بار کے مجھے اس سے ملنے والے ہاتھوں میں شاید میرا بھی ہاتھ تھا۔

میں بڑی حیران ہوئی اور بولی جناب صدر آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ شاید آپ کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس کا کہ میں تو سارے لوگ سڑکوں پر آکر یہی بات کر رہے تھے کہ یہ آپ ہی تھے جو وہاں گل عام ملتا ہے تھے۔ آپ شیخ مجیب کو گرفتار کرانا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے آپ 28 مارچ کی صبح تک اس کا کہ میں سوچ رہی رہی رہی۔

بہنو صاحب نے انداز میں بولے ہاں، شاید میں ہوئی انٹر کانٹیکٹل کے آخری طور پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے قتل عام کے اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں رکا ہوا تھا اور ہاتھ میں دسکی کا گھاس لیے شاید میں نیرو بادشاہ کی طرح بانسری بجا رہا تھا۔

بہنو صاحب بولتے رہے۔ انہوں نے کیسے یہ جرأت کی کہ وہ اتنے بڑے وحشیانہ اور امتحان انداز میں کیسے قتل عام کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالیں۔ یہ سارا کام انتہائی امتحان طریقے سے کیا گیا تھا۔ انہوں نے تمام لیڈروں کو بھارت فرار ہونے کا موقع دیا اور پھر اپنا سارا غصہ اس غریب عوام پر اتارا جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ صرف شیخ مجیب کو گرفتار کیا گیا۔ ہمیں تھوڑی سی عقل سے کام لینا چاہیے۔ اگر یہ کام میں کرتا تو میں اسے زیادہ سمجھداری، تھوڑے وحشیانہ پن اور زیادہ سائنسی انداز میں کرتا۔ میں ان پر آنسو گیس اور ربر بڑی گولیاں چلا کر ان کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرتا۔ اس طرح کا کام جیسا کہ اس کا کہ میں کیا گیا، یہ ایک انتہائی احمق اور شرابی سابق صدر یحییٰ خان ہی کر سکتا تھا جس نے انتہائی بھڑے طریقے سے اتنا بڑا غرور آپ پر پیش کیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں پاگل پن کے اس مظاہرے سے بھلا کیا نتیجہ حاصل کر سکتا تھا۔ آپ کو اس بات کا پتہ ہے کہ یحییٰ خان کا پہلا ٹھکانہ شیخ مجیب کے بھائے میں خود ہوتا۔ میری پارٹی کے بہت سارے لوگ اس وقت جیلوں میں تھے۔ 1970ء کے آخر کی بات ہے، نہیں میں آپ کو کچھ تاریخ بتاؤں ۵ نومبر 1970ء کا دن تھا۔ جیل یحییٰ نے مجیب سے کہا "کیا میں بہنو گرفتار کروں یا نہیں؟" جیل یحییٰ نے اپنا یہ فیصلہ صرف اس وجہ سے تبدیل کیا اور مجھے گرفتار نہیں کیا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں میری گرفتاری سے پہلے وہ نے والی صورتحال کو شاید اس طرح نہ سنبھال سکیں جیسے کہ وہ مغربی پاکستان میں سنبھال سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجیب الرحمن بھی اکیلی تھا تو میں جانتا تھا کہ اس نے کوئی ایسا آپ کو یحییٰ خان کے ہاتھوں کاٹوا لیا تھا۔

بہت بار سے لوگوں کا لالہ بھی کر چکا تھا۔ سوائے جنگ کو بھی بہت بار سے لوگوں کو مارنے کے لیے طاقت کا استعمال کر چکا تھا۔ میں آپ کو جو وہ کاروبار کے صرف دو واقعات بتا رہا ہوں۔ میں پوری انہی جہتوں میں سے اور میں نہیں اصرار رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اقدار حالات ایسے ہو جاتے ہیں جہاں آپ طاقت کے کوئی استعمال کا ہوا اور وضاحت دے سکتے ہیں اور اس کا ہوا بھی پیش کر سکتے ہیں۔ مارچ کے مہینے میں پاکستان کے اتحاد کا اعلان ان پندرہ کی پسندوں کو کھیلے پر تھا لیکن میرے خیال میں طاقت کا یہ کوئی استعمال ہوا جو عام لوگوں پر کیا گیا نہ کہ ان لیڈروں پر جو اس کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح کے دہشتانہ بین کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی طریقہ نہیں تھا کہ آپ غریب لوگوں کو اس طریقے سے قتل کرنے کی کوشش کریں جنہیں یہ بتایا گیا ہو کہ شیخ مجیب کے چھ لکاتی پروگرام سے نہ تو سندھری طوفان آئیں گے نہ سیلاب اور نہ ہی کوئی ہولک سے مرے گا۔ میں تو خود اس طرح کے جھکنڈوں کے خلاف اس وقت ہمارے زور سے بولا تھا جب کسی کو بات کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں آگے سے یونی بھٹو صاحب اچا ہے کچھ بھی ہو کیا آپ نے اسی جنرل کا کو اپنا آرمی چیف نہیں بنایا جس نے بالکلیوں کے ڈھاکہ میں قتل عام کا حکم دیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

بھٹو صاحب بولے لگا خان ایک فوجی تھا اور وہ اپنی ذیوقی کر رہا تھا۔ اسے ایک حکم کے ذریعے مشرقی پاکستان بھیجا گیا تھا اور دوسرے حکم کے تحت اسے واپس بلایا گیا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح کے احکامات سے ہر وقت مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اسے اس لیے آرمی چیف بنایا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ اسی ڈسپلن کے ساتھ میرے آرڈرز مانے گا۔ وہ سیاست میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں پوری پاکستان آرمی چاہ نہیں کر سکتا اور ویسے بھی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ڈھاکہ میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے اس کی ریپوٹیشن کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی رہی ہیں۔ ان تمام واقعات کا ذمہ دار صرف ایک ہی شخص ہے جس کا نام یحییٰ خان ہے۔ یحییٰ خان اور اس کے مشیر جب طاقت اور کرپشن کے نشے میں چور تھے وہ یہ بھی بھول گئے کہ فوج کی بھی کوئی عزت تھی۔ انہیں خوبصورت کاریں، خوبصورت گھر تعمیر کرنے، ڈنگرز سے دوستیاں کرنے اور چورس کرپشنوں ملک بھیجنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ یحییٰ خان ملک کی حکومت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اسے اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنے لیے طاقت حاصل کرنے میں تھی اور کچھ نہیں آپ

ان لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے جو نیلے سے اچھے ہی تھے سوائے شراب وینا شروع کر دے اور اس کے بعد بیکار ہے۔ جب رات گئے وہ ہمارے ساتھ جاتے۔ آپ تصور ہی نہیں کر سکتیں کہ یحییٰ خان کے ساتھ

He was really Jack the Ripper۔

اسی طرح کے مکمل کام تھا۔ میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ آج کل جنرل یحییٰ خان کہاں ہے اور اب آپ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

بھٹو صاحب بولے وہ راولپنڈی میں واقع اپنے گھر میں قید ہیں۔ وہ ہنگامہ جس میں انہیں رکھا گیا ہے وہ سرکاری ہے۔ میں نے ایک وار کمیشن بنالیا ہے (عمود الرحمن کمیشن) جو اس مشرقی پاکستان کے دفاع کی ساری تحقیقات کر رہا ہے۔ میں اس کمیشن کی رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس رپورٹ سے ہی دفاعی فیصلے کرنے میں آسانی رہے گی۔ اگر کمیشن نے اسے مجرم قرار دیا تو میرا خیال ہے کہ پھر یحییٰ خان کا زائل ہوگا۔ ساری شکست کی ذمہ داری جنرل یحییٰ خان پر آتی ہے۔ اندر کا گندھی اس بات پر بالکل صحیح (کرکتی ہیں کہ انہوں نے ایک جنگ جیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر انہوں نے یہ جنگ جیتی ہے تو پھر ب سے پہلے مسز گاندھی کو جنرل یحییٰ خان اور اس کے جہاں خوشامدیوں کے ٹولے کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے۔ یحییٰ خان سے قتل کی بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور بندہ بات سمجھاتے سمجھاتے فیصلے میں آ جاتا ہے۔

25 مارچ کو ڈھاکہ میں قتل عام کے بعد اپریل کے مہینے میں یحییٰ خان نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ اس وقت وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسے اس چیز کا یقین تھا کہ اب صورتحال پوری طرح قابو میں تھی۔ یحییٰ خان نے مجھے شراب کا گلاس پیش کیا اور بولا "تم سیاستدان تو ختم ہو کر رہ گئے ہو۔"

جنرل بولا نہ صرف مجیب بلکہ بھٹو صاحب آپ بھی ان لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہت ذہ بڑھ کر بول رہے تھے اور پاکستان کی سلامتی کے خلاف تقریریں کر رہے تھے۔

یحییٰ خان بولے "بھٹو جنہیں پتہ ہے میرے اوپر جمہیں گرفتار کرنے کے لیے ہمیشہ پریشور ہوتا ہے۔" یحییٰ خان کی یہ بات سن کر میرا پارہ چڑھ گیا اور میں نے اسے جواب دیا کہ وہ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے انہی جھکنڈوں کی وجہ سے ہم تباہی کے دہانے پر

کمرے سے تھے۔ میں نے وہی لاگاس اور پیچھا کر کے سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے جزل سے روک لیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کہنے لگا۔

"No. Come on, calm down, have a seat, go back in."

میں غصہ اچھڑا کر گیا اور کمرے میں واپس چلا گیا۔ میں نے جزل بچی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے اور مجیب میں بہت فرق ہے۔ مجیب ایک عیسائی پسند تھا میں نہیں۔

لیکن میری یہ ساری گفتگو بیکار گئی۔ میری بات سننے کے بجائے جزل بچی خان ایک کے بعد دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا اور پھر پانچواں کتے گلاس شراب کے پیتا چلا گیا اور پھر اس کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں نے بھنو صاحب سے کہا کہ کیا ایک لمحے کے لیے ہم دوبارہ یہ بات سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ آپ مارچ کے اس خوفناک مہینے میں وہاں تک کیسے پہنچے تھے چاہے اس مہینے میں ہونے والے قتل عام کا اخلاقی جواز تھا یا نہیں۔

بھنو صاحب بولے میری طرف دیکھو۔ 27 جنوری کو میں شیخ مجیب سے ملنے کے لیے ڈھاکہ گیا تھا۔ اگر میں نے شیخ مجیب سے بات چیت کرنی تھی تو پھر مجھے ڈھاکہ جانا ہی تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے راولپنڈی آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس دن شیخ مجیب سے ملنے کے لیے گیا تھا جس دن میری اپنی سگی بہن کے خاندانی موت ہوئی تھی۔ اسے لاڈکانہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ میری بہن مجھ سے بہت شدید ناراض ہو گئی۔ قومی انتخابات میں شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان اور میں نے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کر لی تھی لیکن اب وہ اپنے چھ نکات پر اڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو کسی نہ کسی معاہدے پر پہنچنا تھا۔ جزل بچی خان مسلسل یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم چار مہینے کے اندر اندر آئین پر کام کر لیں ورنہ وہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے گا۔ شیخ مجیب کو یہ بات سمجھانے کے لیے بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت تھی۔ آپ ان لوگوں سے ذہانت کی توقع نہیں کر سکتے جن کے پاس ذہانت ہی نہ ہو۔ میں نے شیخ مجیب سے ان باتوں کی بار بار وضاحت کی، اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ کیا آپ میرے چھ نکات کو مانتے ہیں۔ میں ان چھ میں سے پہلے میں تین نکات پر بات چیت کے لیے تیار تھا لیکن میں چوتھا نکات کیسے مانتا جس میں یہ لکھا تھا کہ ہر صوبہ کسی بھی غیر ملک سے تجارت کر سکتا

جسٹس بنی مریشی کے مطابق غیر ملکی آمد و رفت کا اس پر پابندی لگانا ایک سنگین مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کا سبب کہ پاکستان کو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بھارتیوں کے ساتھ ساتھ ایک ملک بننے کا ارادہ تھا۔ میں نے انہیں ان کے مہینے میں اناری یہ بات دیکھ آگے نہ بڑھنے کی اور مارچ 1971ء سے راجھٹ بھی تھے۔

بھارتی آگیا۔ وسط مارچ میں بچی خان کراچی آئے اور مجھے بتایا کہ وہ ڈھاکہ جا رہے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں وہاں جانا چاہتا تھا۔

کہ کیا میں وہاں جواب دیا ہاں اگر شیخ مجیب مجھ سے بات چیت کے لیے تیار ہے تو میں ڈھاکہ میں نے انہیں جواب دیا ہاں اگر شیخ مجیب مجھ سے بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ بلی گرام ڈھاکہ ہاؤس گا۔ اگلے روز مجھے ایک بلی گرام ملا کہ شیخ مجیب بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ بلی گرام ڈھاکہ سے جزل بچی خان نے مجھے خود بھیجا تھا۔ میں 19 مارچ کو ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا۔ 20 مارچ کو میری بچی خان سے ملاقات ہوئی اور 21 مارچ کو میں شیخ مجیب الرحمن سے ملا۔ اس ملاقات میں بچی خان بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اس وقت بڑا حیران ہوا جب میں نے دیکھا کہ شیخ مجیب بچی خان سے بڑے بڑے بھارتی بھرتے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ شیخ مجیب بولے کہ بچی خان صاحب امیر تو آپ سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ میرا بھنو صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں چائیں کو بتاؤں گا کہ میری صدر صاحب سے ملاقات ہوئی ہے اور بھنو صاحب وہاں اتفاقاً موجود تھے۔

یہ بات سن کر بچی خان بولے تو نو مجیب تم صرف اپنی بات کرو۔

شیخ مجیب نے بچی کو جواب دیا کہ سمندری طوفانوں میں پہلے ہی بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ شیخ مجیب نے اپنی بات کو دہرایا۔

یہ ہے شیخ مجیب۔ اچانک اس کے بیمار ذہن میں ایک فقرہ الٹ سا جاتا ہے۔ ایک ایسا فقرہ جس کا اس گفتگو سے دور دور تک تعلق ہی نہیں ہوتا جو آپ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ایک جنونی کی طرح اسے بار بار دہراتا رہتا ہے۔

اس میٹنگ میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجھے فضا آگیا کہ بھلا مشرقی پاکستان میں آنے والے سمندری طوفان کی ذمہ داری مجھ پر کیسے آجاتی تھی۔ کیا وہ سمندری طوفان میں نے مشرقی پاکستان

بہا تھا۔ میری بات سن کر شیخ مجیب اللہ کھڑا ہوا اور کہا کہ اس نے ایک ہزار سے میں شرکت کر چکی ہوں اور ہمارا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی آپ شیخ مجیب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو آپ کو ہر بات کا قابل یقین ہی لگتی ہے۔ مجھے کچھ نہیں آتی کہ بھلا کیا کیسے اسے سچیدگی سے لیتی ہے۔

میرے جب شیخ مجیب نے جانے کی بات کی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اسے باہر تک چھوڑ کر آؤں۔ اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ شیخ مجیب یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں انہیں چھوڑنے جاؤں۔ ایک کمرے میں تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں یحییٰ خان کے ملٹری سیکرٹری اور اس کا سیاسی معاون جنرل عمر بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر شیخ مجیب چلا آیا کہ کمرہ خالی کرو۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں نے مسٹر بھٹو سے بات کر لی ہے۔ وہ مجھوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ شیخ مجیب میرے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا ہر اور، ہر اور۔۔۔ میرے بھائی نہیں کوئی معاہدہ کر لینا چاہیے۔ خدا کے نام پر میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم یہ معاہدہ کریں۔

میں اس کی بات سن کر شدید حیران ہوا۔ میں اسے باہر لے گیا تاکہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ جب ہم باہر گئے تو اس نے انتہائی پرجوش سی آواز میں مجھے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ مغربی پاکستان رکھ لو اور اسے مشرقی پاکستان دے دو۔ وہ بولا اس نے ایک خفیہ ملاقات کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وہ مجھے بلوائے گا اور وہ یہ سارے معاملات طے کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس طرح کی چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ڈھاکہ اس سے ایک پورے طرح رات کے اندھیرے میں کیلے کے کسی درخت کے نیچے چھپ کر نہیں بیٹھتا اور نہ ہی میں پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قومی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھائے اور اپنی حدودی اکثریت پر مجبور نہ کرے۔

مجھے یوں لگا کہ میں کسی دیوار سے ہاتھیں کر رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اپنے ترجمان کے ذریعے بات چیت کو جاری رکھنے کے اعلان پر کچھ دمان کر تا۔ یہ قحطی دو ساری اصل کہانی اور وہ سارا قصہ۔ ان دنوں وہ ایک طرح سے پاگل بنا ہوا تھا۔ اس کا دماغ ٹھوم گیا تھا

25 مارچ کا دن آیا جس دن ہنگاموں کا بڑا سے وحشیانہ طریقے سے قتل عام ہوا۔ میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے 25 مارچ کو کوئی مجیب و غیر مجیب چیزیں محسوس

کی تھیں۔

بھٹو صاحب نے یقیناً اس دن کوئی مجیب سا ماحول تھا۔ انہوں نے بھی ایک مجیب سی بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ ہر شام یحییٰ خان سے ملنے جاتے اور اسے بتاتے کہ ان کے اور مجیب کے درمیان تعلقات آگے نہیں بڑھ رہے تھے لیکن یحییٰ خان ان باتوں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے۔ وہ میری بات سن کر اپنا منہ پر سے کر لیتے یا پھر ٹیلی ویژن کی شکایتیں کرنے لگ جاتے۔ وہ اس بات پر بڑبڑاتے کہ میں کرپٹ ہوں۔ ابھی ان کا ریکارڈ نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی پسند کے گانے نہیں سن سکتے تھے۔ 25 مارچ کی رات کو یحییٰ خان نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ بولے آج مجیب سے ججنرل یحییٰ خان نے ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح میں اور تم دونوں مجیب سے اکٹھے ملیں گے۔ میں نے پھر بھی کہا کہ میں نے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسی شام یہ بات شیخ مجیب کے ایک ہندو کو بتائی تو وہ بولا "وہ کتے کا بچہ پہلے میں ٹھیک ہے۔ میں نے اسی شام یہ بات شیخ مجیب کے ایک ہندو کو بتائی تو وہ بولا "وہ کتے کا بچہ پہلے ی ڈھاکہ سے چلا گیا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں نے صدارتی رہائش گاہ فون کیا اور بتایا کہ میں یحییٰ خان سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ رات کے کھانے پر جنرل خان کے ساتھ ہیں۔ میں نے نکا خان کو فون کیا تو وہاں سے مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ یونکہ وہ اس وقت یحییٰ خان کے ساتھ کھانے پر ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ آنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے شک پڑا کہ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں رات کا کھانا کھانے چلا گیا اور پھر سو گیا۔ ہری آکھ گولیوں کی ترتر اہٹ سے کھلی۔ میں نے اپنے دوستوں کو کمروں سے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں رو پڑا اور میرے منہ سے

-My country is finished!

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی کھڑکی سے کیا دیکھا تھا؟

بھٹو صاحب بتانے لگے کہ اگرچہ لوگوں کو اندھا دھند نہیں مارا جا رہا تھا، تاہم یہ ضرور تھا کہ فوجی پولیس کے People نامی اخبار کے دفاتر کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے جو ہمارے ہوٹل کے بالکل

ساتھ واقع تھے۔ فوجی 5000 ہتھیاروں پر قبضہ کر لوگوں کو اس جگہ سے دور جانے کا کہہ رہے تھے۔ جو لوگ
 سے باہر آئے انہیں مشین گنیں دکھا کر ایک طرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروہ میں کو دوسری جانب مشین گنوں
 کی مدد سے قتل کر دیا گیا تھا جبکہ ہوشی کو بیٹھکوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جس نے بھی ہوش میں نہ آیا لیکن
 کوشش کی وہ سیدھا فوجیوں کے ہاتھ لگا۔
 میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صبح آٹھ بجے جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے
 اس بات کی خوشی تھی کہ چلیں شیخ مجیب زندہ تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں ضرور آئی کہ انہوں نے شیخ
 مجیب کے ساتھ بدتمیزی کی ہوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس کی گرفتاری سے اس کے ساتھ کچھ رومان
 کرنے میں آسانی رہے گی۔ وہ اسے ایک دو ماہ سے زیادہ جیل میں نہیں رکھیں گے اور اسی اثناء میں ہم
 اٹھاکہ میں لاہور آؤں اور پھر لاہور میں آؤں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ جناب صدر! مجیب نے آپ سے کہا کہ آپ مغربی پاکستان لے لو اور
 میں مشرقی پاکستان رکھ لیتا ہوں اور بعد میں بالکل سب کچھ ہوا۔ کیا آپ شیخ مجیب سے اس بات پر نفرت
 کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب نے زور سے کہا کہ بالکل نہیں اور میں یہ بات انڈین فیشن میں بھی نہیں کہہ رہا۔
 میں آپ کو پورے غلوں سے کہہ رہا ہوں کہ میں اسے نفرت کرنے کے بجائے بہت زیادہ ہمدردی محسوس
 کرتا ہوں۔ اس میں شک من نہیں ہے نہ ہی کوئی کچھ۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہی
 نہیں ہے کہ کوئی سیاسی، سماجی، معاشی یا عالمی مسئلہ حل کر سکے۔ اسے صرف ایک ہی طریقہ آتا ہے کہ چلاؤ
 کیسے ہے۔ میں اسے 1954ء سے جانتا ہوں اور میں نے کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میری اس سے
 جس لمبے ملاقات ہوئی تھی میں اسی وقت سے اس کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی
 گہرائی نہیں تھی۔ وہ محض ایک Agitator تھا جس کے اندر بہت آگ بھری ہوئی تھی لیکن آئینہ یا ایک بھی
 نہیں تھا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی آئینہ یا تھا بھی کسی تو وہ علیحدگی پسندی کا تھا۔ اب ایسے شخص کے
 ساتھ آپ بھلا ہمدردی کا ہنڈ پھوس کرنے کے علاوہ اور کیا محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ 1961ء کی بات ہے۔ میں اٹھاکہ گیا اور میری شیخ مجیب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ۱۱

میرے سر کی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں چل کر اس کے پاس گیا اور کہا جیلو مجیب! آؤ چائے کا ایک کپ
 پیتے چلو۔

دو انہی دنوں نیا نیا جیل سے باہر آیا تھا اور اس میں کتنی بھری ہوئی تھی اور ہم نے اس واقعہ سے
 کتنے سے گفتگو کی۔ شیخ مجیب مجھے بتاتا رہا کہ کیسے مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ہاتھوں اقتدار
 اور اقتدار کا ایک کالونی کی طرح حکومت کی جا رہی تھی۔ اس کا خون چوسا جا رہا تھا۔ شیخ مجیب کی
 باتیں سنی تھیں۔ میں نے بالکل سب کچھ ایک کتاب میں بھی لکھی تھیں۔ تاہم شیخ مجیب الزمرین نے
 انہیں ان باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ غلطی معاشی نظام میں تھی۔ اس دور
 کے حکمرانوں میں تھی۔ اس نے اس وقت سوشلزم یا جدوجہد کی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس اس
 نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اس وقت جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھے اور کوئی بھی فوج کی مخالفت
 نہیں کر سکتا تھا۔ فوج کو چاہیے تھا کہ وہ ان ناانصافیوں کا خاتمہ کرے۔ اس کے اندر جرأت کبھی تھی ہی
 نہیں۔ یاد دلاتی اپنے آپ کو صحافیوں کے سامنے شیر بنگال کہتا ہے۔

بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ ہاں وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب اس کا فرائض کیا گیا
 تو اس نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گرفتاری کے بعد اس نے ایک ہیرو کی طرح کارروائی
 اختیار کیا۔ اسے ایک ایسے سیل میں رکھا گیا جہاں سونے کے لیے ایک گدا تک بھی نہ تھا۔

بھٹو صاحب نے کہا کم آن۔ اسے کبھی کسی جیل کے سیل میں نہیں رکھا گیا۔ اسے ایک ایسے
 پارٹنٹ میں رکھا گیا تھا جو خصوصی طور پر بڑے اہم سیاسی قیدیوں کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔ اسے
 پنجاب کی میانوالی کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے اخبارات اور
 نیٹس کے لیے ریڈیو فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس کے پاس گورنر پنجاب کی بہت بڑی لائبریری کی
 کاپیاں موجود تھیں اور وہ وہاں بڑے اچھے طریقے سے رہا۔ کئی موقعوں پر تو اسے بنگالی خانہ ماں بھی دیا
 گیا کیونکہ وہ بنگالی ڈسٹرکٹ کا رہتا تھا۔ اس نے اپنے فرائض کے موقع پر اپنا دفاع بھی کیا۔ اس نے اپنے
 دفاع کے لیے دو بڑے وکیلوں کمال حسین اور اس کے بروہی کی خدمات بھی مانگیں جو اس کا قانونی مشیر
 اور دوست بھی تھا۔ کمال حسین ان دنوں جیل میں تھا لیکن بروہی صاحب آزاد تھے۔ بروہی کو اپنا وکیل
 بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے پاس بہتر سے بہتر وکیل آپ کا دفاع کرنے کے لیے موجود ہو۔ میں

آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔ پہلے تو بروہی نے اس کا وکیل بننے سے انکار کیا تاہم یحییٰ خان نے اسے مجبور کیا اور وہ شیخ مجیب کے مقدمے میں اپنے چار انگریز وکیلوں کے ساتھ پیش ہوا۔ بروہی کے ساتھ صرف ایک سی مسئلہ ہے کہ وہ یوں بہت ہے۔ جب بھی وہ لائل پور سے کراچی واپس آتا تو وہ شیخ مجیب کے ساتھ کی گئی اپنی ساری انگشتوں کو سناٹا اور کہتا کہ اسے مجرم ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مجیب نے اسے بہترین انداز میں وہ ساری باتیں اسے بتائی ہوتیں کہ جیسے وہ جنرل یحییٰ کا بھی احترام کرتا تھا اور پاکستان توڑنے میں بھی اسے دلچسپی نہیں تھی۔ شیخ مجیب یہ بات کہتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا تھا کہ یحییٰ خان ایک زبردست آدمی تھا۔ بہت بڑا محبت وطن لیکن بہنو نے اسے دور کر دیا تھا۔ شیخ مجیب کا خیال تھا کہ اس کی گرفتاری کا ذمہ دار بہنو تھا۔ یہ مجھے جنرل پرویز مشرف نے بھی مجھے بعد میں کفر کی تھی اور میں نے اسے کہا تھا کہ آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مجھے بھی یہی کہے گا کہ مجھ کو ایک زبردست انسان۔ بہت بڑا محبت وطن ہے اور آپ لوگوں کی بے عزتی کرے گا۔

میں نے کہا کہ بہنو صاحب! شیخ مجیب کو تو اس ٹرائل میں باقاعدہ سزا بھی سنائی گئی تھی؟

بہنو صاحب بولے نہیں ایک آئینہ ٹریبونل نے اسے مجرم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد مارشل لا ایکسپریس کے طور پر یہ پاورز یحییٰ خان کے پاس تھے کہ وہ سزا کا فیصلہ کرے جو پانچ سال سے لے کر عمر قید یا سزائے موت ہو سکتی تھی۔ یحییٰ خان نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ جنگ پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن پر اور بہت ساری چیزیں سوار تھیں۔

میں نے کہا کہ بہنو صاحب! شیخ مجیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی قبر تک کھود دی گئی تھی۔

بہنو صاحب بولے کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ قبر کیا تھی۔ یہ ایئر ریڈیو تھی۔ انہوں نے جیل کی دیواروں کے ارد گرد کھدائی کی ہوئی تھی۔ پھر وہ مجیب وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ ہر چیز کو اپنی موت کا پروانہ سمجھتا ہے۔ میرا انہیں خیال کہ یحییٰ خان اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ 27 دسمبر کو جب مجھے پاکستان کے سٹے صدر کا صاف دیا گیا تو میں جنرل یحییٰ خان سے ملا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا اور Dorian Gray کے پورٹریٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ یحییٰ خان نے مجھے بتایا کہ "میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ میں نے شیخ مجیب کو پھانسی پر نہیں چڑھایا۔ تم اگر چاہتے ہو تو یہ کام کر گزرو۔"

میں نے بہنو صاحب سے پوچھا پھر کیا ہوا؟

بہنو صاحب بولے میں نے کہا کہ میں اسے پھانسی میں لگاؤں گا اور بار بار سوچنے کے بعد میں انہیں پھانسی پر لٹاؤں گا۔ شیخ مجیب کو ہار کر دینا چاہیے۔ پاکستان آرمی کے مظالم کی کہانیوں کے بعد جس کی طرف سے مذمت کی جا رہی تھی، میرے ملک کو چند ہمدردیوں کی ضرورت بھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شیخ مجیب کو پھانسی دیکر ہمیں زیادہ ہمدردیاں ملیں گی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اس کی رہائی سے لاچار پیغام جائے گا اور ہمارے جنگی قیدی جلدی واپس آسکیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے فوری طور پر کہا کہ شیخ مجیب کو لائل پور سے راولپنڈی لایا جائے۔ جب شیخ مجیب کو یہ آرڈر دے گئے تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ وہ سکیاں بھرنے لگا کہ وہ اسے باہر نکال کر مار ڈالیں گے۔ وہ لائل پور سے راولپنڈی کے سفر کے لیے وہ سکیاں بھرنے لگا کہ وہ اس وقت بھی تسلی نہیں ہوئی جب اسے بڑے خوبصورت ہنگلے میں لے جایا گیا۔ وہ خوبصورت ہنگلے چند بڑے لوگوں کے استہمال کے لیے مخصوص تھا۔ جب میں وہاں اپنے ساتھ ایک ریڈیو، ایک ٹیلی ویژن سیٹ اور کپڑوں کا ایک بنڈل لے کر گیا تو اس نے میرے اوپر ہمدردی کر دی۔ وہ بولا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس وقت پاکستان میں صدر بن چکا ہوں۔ یہ سن کر اس کی آواز فوراً بدل گئی۔ وہ آ کر میرے گلے لگ گیا اور بولا کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے اچھی خبر ہے اور یہ کہ خدا اسے ہمیشہ بچانے کے لیے مجھے وقت پر بھیج دیتا ہے۔ میں اس سے پہلے ہی اسے ایک دفعہ اسی طرح جیل سے نکلوا چکا تھا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا شیخ مجیب نے جنرل یحییٰ خان پر تنقید شروع کر دی۔ اپنی اس تنقید میں وہ وقفہ صرف اس وقت کرتا جب وہ مجھ سے یہ پوچھتا کہ کیا وہ اب اپنے آپ کو آزاد سمجھتے۔ اسے بذریعہ لندن ڈھاکہ جانے سے پہلے میں اس سے دو دفعہ ملا اور دونوں دفعہ اس نے قرآن پاک نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر کہا کہ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ لگاتار رہے گا۔ جب وہ جہاز پر سوار ہوا تو اس نے تب بھی قرآن پاک پر قسم کھائی۔ جب میں اسے صبح نیچے چھوڑنے ایئر پورٹ گیا تو یقین کریں میں اس کی ان باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ قسم کھائی، مجھے گلے سے لگایا، میرا شکریہ ادا کیا اور ہمیشہ کے لیے میرا ممنون رہنے کی باتیں کی۔ ہمارے چڑھنے سے پہلے وہ مجھ سے بولا کہ صدر صاحب! میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ میں اب آپ کے ملک کو بہتر طریقے سے جاننا چاہتا ہوں۔ میں اب یہاں بار بار آتا رہوں گا۔

میں نے بہنو صاحب سے پوچھا کہ کیا کبھی انہیں شیخ مجیب کو رہا کرنے کا افسوس ہوا؟

بھٹو صاحب نے کیا نہیں دیکھی تھی اور دیکھ بھی سکتا ہے وہ میری طرح ایک پاکستانی ہے۔
 اور دونوں نے گھریلو طور پر ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھی ہے۔ اس نے ایک طرف کے منہ کاٹا دیا
 کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی ہمارے درمیان ایک قطعی فرق موجود ہے۔ میں آج بھی اسے لا کر
 ہوں جب مجھے انگریزی کا دور یاد آتا ہے جب اس نے میرے بارہ دو گز دور سے ہکا بولہ سسکیاں لے کر
 پور خواست کی قمی کر مجھے پھانسی پھانسی میں واقعی اس کے لیے بھڑکی مسموم کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ
 مجھے یہ بھی یاد ہے کہ بھٹو صاحب نے بارہ دو گز دور تک اقتدار میں نہیں رہے گا۔ آخر ماہ گزر گئے ہیں۔ جوئی
 ایک سال یاد آ رہا ہے کہ وہ بادی جو وہ ہمیشہ سے چاہتا تھا وہ اسے خود لگ جاتے گی۔ آج آپ دیکھ رہے
 ہیں بھگت دیش اپنی لڑائی کا ۱۹۴۷ء تک بنا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ روس کا ۱۹۳۹ء تک بنے گا اور عجیب کیونست نہیں
 ہے۔ اگر عجیب ان تمام معاملات کو اچھے طریقے سے سمجھا لے گی جس کا امکان مجھے نہیں لگتا تو بھی
 بہت جلد اس کا سامنا Macists سے ہو گا جو اس جنگ کے اصل قاتل ہیں۔ وہ پہلے ہی اس پر دباؤ بڑھا
 رہے تھے۔ سیاسی طور پر کتنی ہائی کچھ بھی نہیں۔ اگر معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک طرح سے کوئی
 خطرہ ہی نہیں۔ کتنی ہائی کو صرف ایک چیز آتی ہے کہ ہوا میں کوئی کیسے چلاتی ہے۔ لوگوں کو خوفزدہ کیسے کرتا
 ہے۔ کیسے مال چراتا ہے اور Jai Bangla کے نعرے کیسے لگاتے ہیں۔ اور آپ محض نعرے لگا کر ایک
 ملک نہیں چلا سکتے بلکہ دوسری طرف بنگالی Macists نے موزے لگ کر کی آدمی مال کتاب پڑھی ہوئی
 ہے لیکن وہ سمجھدار ہیں اور بھارتیوں کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ میرا نہیں خیال
 کہ وہ پاکستان کے اتحاد کے خلاف ہیں۔ آپ دیکھیے گا برتری انہی کو ہی ملے گی۔ اسے خوفناک اور
 عجیبہ و مساک کا سامنا کرنے کے لیے آپ کو ایک مجلس کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ ذرا تصور کریں کہ
 شیخ مجیب الرحمن جیسا شخص ان تمام مساک سے ڈیل کر رہا ہے اور پھر یہ زمین (بھگت دیش) بہت پر نصیب
 دھرتی ہے۔ سندری طوفان و سیلاب اور دیگر مصیبتیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا
 جائے گا کہ وہ کسی منوں ستارے کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ آپ نے اٹھا کر کو ۱۹۴۷ء میں دیکھا تھا اور
 ۱۹۵۴ء میں بھی ایک گندہ سا گاؤں جہاں گھیاں تک نہیں تھیں اب وہاں ہر چیز تباہ ہو چکی ہے اور اسے
 تباہ کرنے میں بھگت دیش کی کتنی ہائی کے ڈاکا مینش نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

میں نے جب بھٹو صاحب کے منہ سے بھگت دیش کا نام سنا تو میں بڑی حیران ہوئی اور ان سے

کہا کہ آپ کے منہ سے بھگت دیش کی بجائے میری جگہ پر ہے؟
 بھٹو صاحب میری جگہ پر لیجئے کہ بھگت دیش کا نام ہے میں بھگت دیش کا نام لیتے اور غصے

کے ساتھ لے رہا ہوں۔ میرے لیے تو ابھی تک یہ مشرقی پاکستان ہے۔ اب گنگا و گندھ۔ اگرچہ یہ بھی
 بھارتیوں کی فوجی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ بھاس ملک اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ اب مجھے بھی اسے تسلیم کرنا
 پڑے گا۔ میں بھی اسے تسلیم کر لے گا چاہوں اگر بھارت اسے تسلیم کر لے اور بھارتیوں کا وہاں
 قیام عام بن گیا ہائے اور پاکستان کے عاصیوں کو مارا جائے گا۔ اگر ہم نے دوبارہ ایک ملحقہ ریاست میں ضم
 ہوتا ہے تو ہمیں مقامی تعلقات قائم کرنے پڑیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگلے پندرہ سالوں میں پاکستان
 اور بھگت دیش دوبارہ ایک فیڈریشن بن سکتے ہیں۔ یہ بن سکتے ہیں اور انہیں بننا بھی چاہیے ورنہ اس
 دیکھم کو کون پورا کرے گا۔ دوسری طرف مغربی بنگال بھی بھارت سے علیحدگی چاہتا ہے۔ مشرقی بنگالیوں
 اور مغربی بنگالیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے جبکہ ہمارے اور مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے درمیان
 ایک لمبے مشترک ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہونے والی تقسیم بہت اچھی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب اور جی کٹ۔ کیا آپ نے ایک ایسا ملک ۱۹۴۷ء میں بنایا جو ایک
 دوسرے سے دو ہزار کلومیٹر دور اور درمیان میں انڈیا تھا۔

بھٹو صاحب بولے کہ آپ یہ بات کیوں بھول رہی ہیں کہ یہ دونوں علاقے باوجود بہت ساری
 قلعیوں کے پچیس سال تک ایک ملک کا حصہ رہے۔ ایک ریاست محض علاقائی یا جغرافیائی تصور بھی نہیں
 ہوتی۔ جب آپ کا جھنڈا قومی ترانہ، لہجہ ایک ہو تو پھر فاسلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب
 مظلوم نے انڈیا کو اکٹھا کیا تھا تو مسلمانوں کو اس کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لیے پورا ایک سو سال
 لگا تھا۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعے محض دو گھنٹے لگتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔

میں نے کہا جتنا پھر انہیں۔ مجھے اندرا گاندھی کی بات زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہے جب وہ یہ
 کہتی ہیں کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملحد تھی اور ۱۹۷۰ء کی وہابی میں لہجہ کی لڑائی ایک امتحان چیز تھی ا

بھٹو صاحب بولے اسز گاندھی کے ذہن میں صرف یہ خواب ہے کہ وہ پورے برصغیر پر قبضہ کر
 کے ہمیں اپنی رعایا بنانا چاہتی ہے۔ وہ ایک کنفیڈریشن بنا کر پاکستان کو دنیا کے نقشے سے غائب کرنا
 چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم بھائی بھائی نہیں

ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی نہیں کہہ پا کہ وہ ہمارے تو بڑے فوجی واپس کرنے کو چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے
 بیٹے کو بھی کاہل نہیں کر رہی۔ میں تو آپ کو وہ بتا رہا ہوں جیسا میں نے اسے پایا ہے۔ وہ ایک ایسی
 قانون میں جن میں سوچنے دیکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ آج وہ ان دنوں سے زیادہ
 بھرپور ہیں جب وہ آکسفورڈ میں پڑھتی تھیں یا لندن میں ہونے والے ایک پتھر میں شخصی فوج کے رہی
 تھیں۔ انہوں نے اسے اچھا دیا ہے اور کامیابی سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ لیکن اصل سوال یہ پیدا
 ہوتا ہے کہ اسے اس کی خوبیاں سے زیادہ کامیابی ملی ہے۔ اگر پاکستان اور انڈیا نے ایک کنٹینڈریشن بنا
 تو مجھے سزا دے گا گاندھی سے ان کا یہ عہدہ لینے میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں ان سے Intellectual
 Confrontations بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود بھی میں مسز گاندھی سے کسی بھی
 جگہ ملنے کو تیار ہوں جہاں وہ پسند کریں۔ میں نند دہلی جا کر بھی ان سے ملاقات کے لیے جاسکتا ہوں۔
 لی ہاں میں ان سے ملنے کے لیے نند دہلی بھی جانے کو تیار ہوں۔ تاہم، جو بات مجھے پریشان کرتی ہے
 وہ یہ ہے کہ مجھے ہماری فوج کا رڈ آف آؤٹ ریٹی کر رہی ہے اور میں اندرا گاندھی سے ملاقات کر رہا
 ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے پتہ نہیں کیوں اچھی نہیں لگتیں۔ خدا را مجھے ان دونوں چیزوں کے بارے
 میں سوچنے پر مجبور بھی نہ کرو۔

بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ یہ باتیں چھوڑیں اور مجھے یہ بتائیں کہ مسز اندرا
 گاندھی نے ان کے بارے میں مجھے اپنے اندر دیکھ میں کیا کہا تھا۔

میں نے بھٹو صاحب کو جواب دیا کہ وہ کبھی نہیں کہ آپ ایک غیر متوازن شخصیت کے مالک
 انسان ہیں۔ آپ ایک دن ایک بات کرتے ہیں اور دوسرے دن دوسری۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ آپ
 کے بارے میں کسی کو کوئی پتہ نہیں چلنا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔
 بھٹو صاحب بولے۔ واقعی؟

بھٹو صاحب نے کہا میں آپ کو اس کا بڑا سیدھا سا جواب دیتا ہوں۔ مجھے مشہور فلاسفر لاک کی
 صرف ایک بات اچھی لگتی ہے کہ Consistency is a virtue of small minds
 (اگرچہ بھٹو صاحب نے یہ مشہور فقرہ لاک کے نام سے کہا۔ دراصل یہ بات ایمرن نے کہی تھی۔ اس نے
 کہا تھا A foolish consistency is the hobgoblin of little minds۔ مترجم)

بھٹو صاحب نے کہا کہ دوسرے لکھوں میں میرے خیال میں آپ کا بنیادی تصور ضرور ایک ہے۔
 ہمارے جس اس کے اندر بھی تبدیلی کی گنجائش ہوتی چاہیے۔ آپ کبھی ایک پل پر چلے جائیں تو کبھی
 دوسرے پر۔ ایک دانشور کو صرف ایک خیال کے ساتھ چٹ کر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے خیالات میں
 یکسوئی چاہیے مگر اس کے خیالات ذرا سے یا ظلم میں کسی کردار کی لمبی تقریر جیسے ہی ہوں گے۔ یہ
 بات سیاستدان پر بھی صادق آتی ہے۔ سیاست بھی ایک تحریک کی طرح ہوتی ہے اور ایک سیاستدان کو
 بھی سواہل رہنا چاہیے۔ اسے کبھی راستہ تو کبھی لپٹ کی طرف گھومنا چاہیے تو کبھی اس کے اندر
 نئی بات اور شکوک بھی ابھرنے چاہیں۔ اسے مسلسل اپنے آپ کو بدلتے رہنا چاہیے۔ چیزوں کو ٹیسٹ
 کرتے رہنا چاہیے اور ان پر ہر سائنس سے حملہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مخالفین کے کمزور پوائنٹ
 اور کردار پر حملہ کر سکے۔ اس شخص پر ترس کھانا چاہیے جو ہر وقت اپنے ایک بنیادی خیال سے چمٹا رہے
 اور اس سے ہمدردی کرنی چاہیے کہ اگر وہ اپنے اس بنیادی نقطے کا انکشاف کرتا ہے۔ اگلا ہر ایک غیر
 مشعل حراہی کسی بھی ذہین شخص اور مجھے ہوئے شخص کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ بات مسز اندرا
 گاندھی کو سمجھ نہیں آتی تو پھر مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے سیاسی پیشے کی اس خوبصورتی سے
 نا آشنا ہے۔ یہ بات بہر حال مسز گاندھی کے والد نہرو کو اچھی طرح پتہ تھی۔

میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اندرا گاندھی تو کہتی ہیں کہ ان کے والد صاحب نہرو سیاستدان
 نہیں بلکہ ایک Saint تھے۔ (یہ خطاب دراصل رومن کیتھولک اور آرتھوڈوکس چرچ ایک بہت ہی اچھے
 اور نیک انسان کو اس کی موت کے بعد دیا کرتے تھے۔ مترجم)

بھٹو صاحب فوراً بول پڑے اور ان کے منہ سے نکلا وہ۔ مسز گاندھی اپنے باپ کے بارے میں
 یہ غلط بات کہہ رہی ہیں۔ ان کا باپ ایک بہت عظیم سیاستدان تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں اپنے
 باپ کی آدمی خوبیاں بھی ہوتیں۔ اگرچہ نہرو پاکستان کے قیام کے خلاف تھا لیکن پھر بھی میں اس کی
 خوبیاں کا محرف ہوں بلکہ جب میں نوجوان تھا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کا بہت بڑا فین تھا۔ یہ تو
 مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان میں بھی بہت ساری خامیاں تھیں۔ ان کے حصے کی اپنی ناکامیاں تھیں۔ ان
 میں بھی نمایاں تھیں اور وہ مثالیں، چہ چل پاموزے جگ کی کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

بھٹو صاحب نے پھر مجھ سے پوچھا کہ اس کے علاوہ مسز گاندھی نے ان کے بارے میں اور کیا کہا؟

میر نے صاحب کو بتایا کہ میر نے 1877ء میں گلاسگو گیا تھا۔

میر صاحب نے بتایا کہ میر نے 38 برس کو لندن میں سے
 ہارٹس ہسپتال گیا تھا اور پھر وہاں سے ایک سال کے بعد
 آگے چل کر کینیڈا کی کوئی Palarno پر چلے گئے تھے۔ یہ تھیں انہیں کہیں سے
 یہ بھی پتہ تھا۔ وہیں کوئی Marseilles پر چلے گئے تھے کہ آپ اسے یہ نہیں کہتے کہ فرانس پر
 چلے آئے۔

دراصل مسز گاندھی یہ بات بھولنے کا شکار رہی ہیں کہ ہم نے تھوڑے کچھ پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔
 مجھے یاد ہے میری نو ہجرت 29 کو جنرل بگٹی خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر
 خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جو ہل حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے بگٹی خان کو کہا تھا کہ آپ تو
 ایسے پیسے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل
 بھارتیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلارہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور
 مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل بگٹی کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار
 دفعہ بھارت پر جوابی حملے کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل بگٹی نے
 بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر
 اپنے ٹیکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

جہاں تک اٹھارہ کی بات ہے میں نے جنرل بگٹی سے کہا کہ ہم باقی محاذ چھوڑ کر اٹھارہ میں
 بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم اٹھارہ کو ایک بہت بڑا قلعہ بنائیں گے اور وہاں دس ماہ سے لے کر ایک سال تک
 بھارت سے جنگ لڑیں گے اور پوری دنیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ تاہم، بگٹی خان کے ذہن میں صرف ایک
 بات سمائی ہوئی تھی کہ کہیں بھارتی ہمارے چھوٹے سے علاقے پر بھی قبضہ نہ کر لیں اور وہاں انگریزوں کا
 ہینڈ الہرا دیں اور جب اسی جنرل بگٹی نے جنرل نیازی کو بھارتی جنرل کے سامنے اٹھارہ والے کا حکم دیا
 تو میں نے خدا سے کہا تھا بھارتیوں کو اس سے پہلے ہی میں مرہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس

میر نے صاحب کو بتایا کہ میر نے 1877ء میں گلاسگو گیا تھا۔

میر صاحب نے بتایا کہ میر نے 38 برس کو لندن میں سے
 ہارٹس ہسپتال گیا تھا اور پھر وہاں سے ایک سال کے بعد
 آگے چل کر کینیڈا کی کوئی Palarno پر چلے گئے تھے۔ یہ تھیں انہیں کہیں سے
 یہ بھی پتہ تھا۔ وہیں کوئی Marseilles پر چلے گئے تھے کہ آپ اسے یہ نہیں کہتے کہ فرانس پر
 چلے آئے۔

دراصل مسز گاندھی یہ بات بھولنے کا شکار رہی ہیں کہ ہم نے تھوڑے کچھ پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔
 مجھے یاد ہے میری نو ہجرت 29 کو جنرل بگٹی خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر
 خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جو ہل حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے بگٹی خان کو کہا تھا کہ آپ تو
 ایسے پیسے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل
 بھارتیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلارہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور
 مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل بگٹی کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار
 دفعہ بھارت پر جوابی حملے کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل بگٹی نے
 بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر
 اپنے ٹیکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

مجھے کرکٹ کے دو سٹے ٹیک کر دیئے۔ جونہی میری شادی کی رسومات ختم ہوئیں میں بھاگ کر کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔

مجھے احساس ہے کہ میرے ملک میں ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جنہیں مجھے تبدیل کرنا چاہیے۔ میں پھر بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ میرے گاؤں میں تو میرے ساتھ کرکٹ کھیلنے والے ایک کھلاڑی دوست جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، کی شادی ایک 32 سالہ خاتون سے کر دی گئی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ یا تم تو طوطی قسمت ہو کہ تمہاری بیوی 23 برس کی تھی اور تم 13 برس کے! جب میں اپنی دوسری بیوی نصرت کی محبت میں گرفتار ہوا تو میری عمر اس وقت 23 برس تھی۔ نصرت اس وقت لندن میں پڑھ رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایرانی تھی اور ایران میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی روایت تھی، پھر بھی میرے لیے اسے شادی پر رضامند کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے پاس اسے منانے کے لیے کوئی زیادہ دلیلیں نہیں تھیں۔ میں نے اسے صرف دو تین الفاظ ہی کہے تھے کہ کیا ہوا اگر میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ نصرت سمجھو اس پر۔ اب میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ اپنی پہلی بیوی کا خیال میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری کزن ہے بلکہ یہ بھی کہ اب وہ میری ذمہ داری ہے۔ اس بھاری کی تمام عمر اس اہمقانہ شادی کی وجہ سے تباہ ہو کر رہ گئی جو ایک 13 سال کے بچے سے کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی زیادہ روایت ہے جس میں ہم سب ہل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ وہ میرے لاڈ کا نہ والے گھر میں رہتی ہے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تنہا زندگی گزارتی ہے۔ وہ ماں ہی نہیں بن سکی جبکہ میری دوسری بیوی سے میرے چار بچے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بہت کم وقت گزارا ہے۔ میں جونہی تھوڑا سا بڑا ہوا میں پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا۔ یہ انصافی کی ایک اپنی داستان ہے۔ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ سب کچھ کروں گا جس سے لوگ دوسری شادی نہ کریں۔ پھر دوسری شادی کے بعد بہت بڑے معاشی مسائل بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ بچے یاں الگ گھروں اور شہروں میں رہتی ہیں جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن اب ہر کوئی میری طرح بھی دو بچے یاں مختلف شہروں اور گھروں میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں کوئی اتنا امیر آدمی بھی نہیں ہوں۔

میں نے جبرانی سے بھٹو صاحب سے پوچھا۔ کیا آپ واقعی امیر نہیں ہیں؟

بھٹو صاحب نے فوراً جواب دیا کہ نہیں میں اس طرح امیر نہیں ہوں جیسا آپ کے ہاں سمجھا

جاتا ہے۔ یہاں جس کے پاس بہت ساری زمین ہو اسے امیر سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس وہ عوامی رہے کے ان لوگوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے Giggolo کھیلتے ہیں۔ ہماری زمینیں خشک ہیں اور پیداوار کم ہے۔ اس لیے یہ کہنے کے بجائے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں، آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں نسبتاً ایک امیر آدمی ہوں۔ میں ایک اچھی زندگی گزارتا ہوں۔ میری بہن بھی ایک اچھی لائف گزار رہی ہے۔ میرے بھائی نے بھی اچھی زندگی گزار لی اور ہم اچھے سکولوں میں پڑھنے گئے لیکن ہم نے کبھی ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کیا۔ میں کبھی بھی بٹے بوائے نہیں رہا۔ جب میں امریکہ میں سٹوڈنٹ تھا اور بعد میں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا، میں نے وہاں کوئی کار نہیں خریدی۔ میں نے بیسوں کو ہمیشہ بڑی احتیاط سے خرچ کیا ہے، مثلاً میں نے پیسے کو یورپ جانے اور اچھے لوگوں سے ملنے اور کتابیں خریدنے پر خرچ کیا ہے۔ اگر آپ میری لائبریری پر ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ کتابوں پر خرچ کیا ہے۔ میرے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جن میں بہت ساری پرانی اور نئی کتابیں ہیں۔ میں مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں جس طرح سپورٹس سے! چند لوگ میرے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ڈریس کپڑے پہنتا ہوں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی دولت کپڑوں پر اڑاتا ہوں۔ اچھے کپڑے پہننے کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک صاف ستھرا انسان ہوں۔ میں نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان بھارتی اور پاکستانی شہزادوں کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا جو گندے رہتے ہیں اور ان سے ٹو آتی ہے۔ میرے پاس خوبصورت اور آرام دہ گھر ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے، لیکن بہت بڑے عرصے تک میرے ان گھروں میں ایئر کنڈیشننگ نہیں تھی۔ میں لوگوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتا ہوں لیکن احمق اور ناقوف لوگوں کو نہیں! مجھے رقص کرنا آتا ہے لیکن اس وجہ سے کیونکہ مجھے میوزک پسند ہے۔ دوسرے امیں اس وقت دیوار پر لگا ہوا ایک ساکت پھول بن کر نہیں رہ سکتا جب دوسرے رقص میں مصروف ہوں اور آخر میں۔۔۔۔۔

میں نے بھٹو صاحب کی بات ان کے منہ سے اچک لی اور بولی کہ آخر میں آپ کی یہ ریپوٹیشن

بے کہ خوبصورت عورتیں آپ پر مرتقی ہیں۔ آپ ایک Don Juan ہیں۔ جناب صدر! کیا یہ بات درست ہے؟

بھنو صاحب نے کہا کہ یہ بات بھی نہ جانچ کر بیان کی گئی ہے۔ میں ایک دوا لکھ لکھ
ہوں اور میرا یہ خیال نہیں کہ دوا لکھ ہوئے بغیر آپ ایک اچھے سیاحان میں سے ہیں اور ایک
دوا لکھ لکھ ہونے کے نام سے میرا خیال ہے کہ ایک ڈاکٹر سے بہتر آپ کو دیکھنا نہ کرنے کی اور کوئی
چیز نہیں ہوتی۔ کسی کی محبت میں گرفتار ہونا یا کسی محبت کے دل کو فتح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔
آپ کو ان لوگوں پر رحم کرنا چاہیے جو محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ آپ سبکدوشوں اور محبت میں گرفتار ہو
سکتے ہیں اور میں بھی محبت میں گرفتار ہوتا ہوں۔ میں اعلاقیات پر بہت یقین رکھتا ہوں ایک شخص ہوں۔
میں عورتوں کی عزت کرتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان مرد عورتوں کی عزت نہیں کرتے۔ وہ لوگ
جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ عورتوں کی عزت اور ان کا تحفظ کرنا ہمارے حضور پاک کی پہلی
تعلیمات میں سے ایک ہے۔ میں جہاں آپ کو مسلمان بنانے کا مقصد نہیں سمجھتا۔ ایک دفعہ ایک
شخص کو اسے کوڑے مارے کہ اس کے جسم سے خون نکل آیا آپ کو پتہ ہے میں نے اسے اسے کوڑے
کیوں مارے کیونکہ اس نے ایک چھوٹی سی لڑکی کا رہا کیا تھا اس طرح ایک مکان میں جسے سے پاگل ہو
گیا تھا جب میں نے یہ پتہ چا کہ چند سو سالوں نے گراہی کے ساحل پر چڑھا لکھ لکھ کے
کچھ سے بڑی اسے تھے۔ یہ سوائس کس کے۔ میں انہیں مارا شل کے ذریعے قہقہہ کر دیں گا۔ میں اس
کے ساتھ بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اس چیز کا یقین ہو گیا کہ غلط فہمی میں ہمارے فہم میں نے
وہاں کی عورتوں پر تھوڑا سا حق تو میں دیکھتا ہوں کہ جو اس بات پر مصر رہا کرے گا کہ ایسے فہم میں کو
یہ لکھ دی جائے گی۔

میں نے لکھنے کا موضوع بدلتے کے لیے بھنو صاحب سے کہا کہ مجھے کسی اور موضوع پر بات
کرتے ہیں۔ آپ کے مارکزم کی بات کرتے ہیں۔ آپ اپنے ان نظریات کا اپنی امارت اور اسلام
کے نظریات سے کیسے ماپ کرتے ہیں؟

بھنو صاحب بولے میں لکھ لکھ معافی معاملات میں اپنے آپ کو مارکسٹ کہتا ہوں۔ میں صرف
معافی معاملات میں مارکسٹ نظریے کو تسلیم کرتا ہوں۔ تاہم میں مارکزم کی زندگی کے بارے میں جوش
کی گئی تھی اور اس سوال پر کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں جیسے سوالات پر یقین نہیں رکھتا۔ ایک اچھے
مسلمان کی طرح میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ لہذا پانچ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ایمان ایک

لکھا جاتا ہے جو دوا لکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔ اگر ایمان کا وجود ہے تو پھر اس پر بحث کرنا فضول ہے۔ میں
ایمان پر یقین رکھتا ہوں اور میں اسے مارکزم کے غلط خیالوں سے علیحدہ کر کے ترک کرنے کو چاہتا ہوں
ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ اپنے آپ کو مارکسٹ اور مسلمان کہنا
لکھا جاتا ہے میں جو ایک ساتھ چل سکتی ہیں خصوصاً پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں جہاں سرمایہ
مارکزم کے علاوہ مجھے اور کوئی مل نظر نہیں آتا۔

میں نے پاکستان کی بات کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی عالمی فوجدار تیار کر
دیا ہوں۔ میں دوسرے لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنے ملکی حقائق پر توجہ
کرتا ہوں اور میں۔ میں ایک انقلابی شخص ہوں لیکن میں اپنا ملک اور خودی انتظامات انفرادی نہیں کر سکتا۔
پاکستان ایسے انتظامات کا قائل نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہو تو یہ بہت بڑی چال ہوگی لہذا مجھے انتہائی صبر
کے ساتھ اصلاحات متعارف کروانی ہوں گی اور ایسے اقدامات کرتے ہوں گے جو دھیرے دھیرے
میں مارکزم کی طرف لے کر جائیں۔ جہاں ممکن ہو وہاں نیشنلائزیشن کی پالیسی اپنائی جائے اور جب
ضرورت پڑے تو اس سے دور بھی رہا جائے۔ سب سے بڑا کہ ہم غیر ملکی سرمایے کی بھی قدر کریں گے
جس کی ہمیں اس وقت ضرورت ہے۔ مجھے صبر سے کام لینا ہوگا۔ ایک ایسے سرچشمہ کا کہہ دو کہ ہوگا جو
سلاطین میں اپنے پوتوں کو تیار کرے۔ یہ ایک بڑا سلاطین ہے اور آگے آپ نے اس
سلاطین کو پوتوں سے مرنے سے بچانا ہے تو پھر آپ کو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ آپ کو
بڑے صبر کے ساتھ ایک درختم کے ٹکڑے سے بڑے کا انتظار کرنا ہوگا۔ آپ کو اصلاحات کی کامیابی کے لیے
بھی صبر سے کام لینا ہوگا۔ ہم صبر میں نہ ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو دیکھیں کہ شریعت میں
لیجسلیٹو جیسے انقلابی لہذا کو بھی کچھ دھماکا کرنے چاہئے تھے۔

میں بولی کہ بھنو صاحب اب بہت سارے لوگ آپ کی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ ان کا
خیال ہے کہ آپ کو صرف طاقت چاہیے اور کچھ نہیں اور اقتدار میں رہنے کے لیے آپ کچھ بھی کر گزریں
گے اور آپ کبھی بھی ان چیزوں سے دستبردار نہیں ہوں گے جو اس وقت آپ کے پاس ہیں؟

بھنو صاحب بولے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے تین مہینوں میں ذریعہ اصلاحات کی ہیں اور
میرے اپنے خاتمہ ان کو 45 ہزار ایکڑ زمین چھوڑنی پڑی ہے۔ میری اپنی ذاتی چھ سے سات ہزار ایکڑ

وہیں ان اصلاحات میں جلی گئی ہے۔ میں اسی لیے کہتا ہوں کہ ان اصلاحات نے میں کو ان کا بھروسہ
 بنے گی اپنی ریشم نکالیں گے۔ خدا میرا گواہ ہے کہ میں نے ان کے خلاف کیا نہیں کیا۔ یہ ان کی
 طور پر ہی کی بنا پر ان اصلاحات پر دھیر سے دھیر سے کام لیں کر رہا ہوں۔ جس دن میں نے مارکس کو پڑھا
 اس دن سے مجھے ان چیزوں کو گوارا کرنے میں کوئی خوف محسوس نہیں رہا میری ہیں۔ میں آپ کو دیکھ
 اور وقت بھی تاکتا ہوں اب میں نے مارکس کو پہلی بار پڑھا تھا۔ مئی 1945ء۔

جہاں تک میرے اپنے ارادات کی بات ہے کہ میں صرف اقتدار کا بھوکا ہوں میرا خیال ہے کہ
 یہ لا ضروری ہے کہ ہم یہ بات سمجھیں کہ طاقت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے نزدیک پاور وہ نہیں ہوتا جو
 منزل نیکی کے پاس تھا۔ طاقت سے میری مراد ہے وہ چیز جس سے آپ پہاڑوں کو گرا کر زمین پر مار
 کرتے ہیں۔ جس سے صحرائوں میں پھول نکلتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جہاں بھوک
 اور دلت سے کوئی نہیں مرتا۔ میں ڈیکٹر نہیں بننا چاہتا لیکن اس وقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بہت
 زیادہ لطف ہوتا ہے گا۔ میں جن کوئی ہوئی کمزریوں کو وہ بارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ کڑیوں
 میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ مجھے کڑیاں اٹھا کر باہر پھینکی ہوں گی اور اگر میں نے ان کڑیوں کو پھینکتے وقت
 احتیاط نہ کی تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ میرے پاس صرف ایک بازار رو جائے گا۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ
 آپ سیاست محض فیمل کوڈ کے لیے جان نہیں کرتے۔ آپ سیاست اس لیے کرتے ہیں تاکہ طاقت
 حاصل کر سکیں اور اسے اپنے پاس رکھیں۔ جو یہ بات نہیں مانتا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ سیاستدان ہمیشہ آپ
 کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ وہ بہت اچھے ہیں، بہت اچھے کردار کے مالک ہیں اور
 مستقل حراج ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ اس طرح کے سیاستدان کا کوئی وجود نہیں ہوتا جو
 اچھا ہو، اخلاقی لحاظ سے بہتر اور مستقل حراج ہو۔ سیاست کچھ لوگوں کا کام ہے۔ میرے باپ نے ایک
 دفعہ مجھے ایک بات بتائی تھی کہ کبھی کسی شخص پر اس وقت ہاتھ مت اٹھاؤ جب تک آپ اس کے ہاتھوں مار
 کھانے کے لیے تیار نہ ہوں۔ باقی چیزیں بوائے سکاؤٹ سٹک ہے اور میں بوائے سکاؤٹ کی وہ تمام
 خوبیاں اس وقت سے بھول چکا ہوں جو میں نے سکول کے دنوں میں سیکھی تھیں۔

میں نے کہا کہ موصدا صاحب! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ مسیحی تھے اور پچھلے
 کی کہیں کو جاتے تھے۔

اور اس کے اگلاں برطانیہ کے پرنس اور اس کے خاندان کے بارے میں کئی چیزیں پڑھا ہوں۔ یہ
 آپ مجھ سے یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ میں ایک فاسٹ ہونے والا آپ کی اصلاح کے لیے مشت ہے
 کہ میں فاسٹ لائن ہوں۔ کوئی بات تو یہ ہے کہ ایک فاسٹ ہو کر پھر کاٹش ہوتا ہے اور میں پھر سے
 بہت زیادہ محنت کرتا ہوں۔ ایک فاسٹ دامن باز سے تعلق رکھتا ہے جبکہ میرا تعلق ان میں باز سے
 ہے۔ ایک فاسٹ ٹیلی بوڑھا ہوتا ہے جبکہ میرا تعلق آریٹلو کریسی سے ہے۔ اگر آپ کسی شخص کے
 بارے میں کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کا ہیرو ہے۔ میرے بھی اپنے
 ہیرو تھے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک طالب علم تھا۔ یہ ہیرو اب بھی ایک ہیرو گم کی طرح ہوتے
 ہیں۔ آپ انہیں منہ میں چباتے ہیں اور پھر نکال کر پیچک دیتے ہیں اور اس کی جگہ نئی ہیرو گم رکھ دیتے
 ہیں۔ یہ ہیرو آپ کو جوانی میں اچھے لگتے ہیں۔ تاہم، اگر آپ یہ جاننا چاہتی ہیں کہ اب تک میں نے
 کتنے ہیرو کو منہ میں چبایا ہے۔ میں آپ کو ان کے نام بتا دیتا ہوں۔ چنگیز خان، سکندر اعظم، ہنری ہال
 اور نیپولین۔ نیپولین کو میں سب سے بڑا ہیرو سمجھتا تھا۔ میں روس کا بھی بڑا فین رہا ہوں۔ اس کے علاوہ
 کبھی مجھے Mazzini, Cavour اور Garibaldi کو بھی چبانے کا موقع ملا ہے۔ آپ کو اندازہ ہو
 گیا ہوگا کہ میرے اندر کتنے تضادات تھے۔

میرے من سے نکلا "آئی سی"۔

میں نے موصدا صاحب سے کہا کہ چلیں، آپ کی شخصیت کو زیادہ بہتر سمجھنے کے لیے آپ مجھے یہ
 بتائیں کہ موجودہ دنیا کے کون سے ایسے لیڈر ہیں جنہیں آپ پسند کرتے ہیں یا جو آپ کو پسند کرتے
 ہیں۔

موصدا صاحب نے جواب دیا۔ سکارو۔ وہ میری ایک طرح سے پوجا کرتا تھا اور میں اس کی۔
 اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود جس میں عورتوں کے ساتھ Vulgarly کرنے کے باوجود وہ ایک
 اعلیٰ دست انسان تھا۔ اسے اکٹاکس کی بھی کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ دوسرا لینن۔ وہ بھی ایک شاندار
 انسان تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور میں اس سے۔ میں نے 1968ء میں جب ہٹلر ایوب کی کاہنہ
 سے تصدیق دیا تو پھر نے مجھے مصر آنے کی دعوت دی اور مجھے ایک سربراہ مملکت کا پتہ کول دیا اور کہا کہ

میں جتنا عرصہ چاہوں وہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ اس کے بعد تیسرا لیڈر جس سے میں متاثر رہا ہوں وہ شانل تھا۔ میں ہمیشہ اس کی دل سے بڑی عزت کرتا ہوں۔ تاہم، میں نے خروشیف کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اسے میں نے ہمیشہ جیتنے چاہتے، سلبرون کو بڑا بھلا کہتے یا شراب پیتے اور ہمیشہ امریکیوں کے آگے جھکنے کے لیے تیار دیکھا۔ خروشیف نے ایشیا کو بہت نقصان پہنچایا۔ آخری لیڈر جس سے میں متاثر ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ چاہتی ہیں کہ میں موزے جگہ کے بارے میں کچھ کہوں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میرے لیے پروان لائی کے بارے میں بات کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ میں اسے اتنی طور پر جانتا ہوں اور میری ان سے گلی ملاقاتیں اور بحث و مباحثے ہوتے ہیں جو صبح سے شام تک جاری رہے حتیٰ کہ ایک سال تک ہم یہ مباحثے کرتے رہے۔ میں 1982ء سے لیکن چارہا ہوں اور پروان لائی سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ جناب صدر! آپ جن لیڈروں کے نام لے رہے ہیں انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی جنکا آپ نے تو ایسا کچھ نہیں کیا؟

بھٹو صاحب بولے آپ جلد کہہ رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے ڈبل میں ڈالا گیا۔ میں نے کئی دفعہ خطرات کا سامنا کیا۔ میں نے جنرل ایوب خان اور یگنی خان کا سامنا کیا۔ انہوں نے کھالے میں زبردستی مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میرے اوپر گولیاں بھی برسائی گئیں۔ دو دفعہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ 1968ء میں ہوا اور ایک دفعہ 1970ء میں۔ سندھ کے شہر ساگھڑ میں دو سال پہلے میں یگنی خان کے پیچھے ہوئے قاتلوں کی گولی کراس فائرنگ میں ایک گھنٹے تک پھنسا رہا۔ مجھے چھاتے ہوئے ایک شخص مارا گیا جبکہ دوسرے شدید زخمی ہوئے۔ آپ ایک اور بات بھی نہ بھولیں کہ جب آپ کسی امیر گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد سوشلسٹ بنتے ہیں تو پھر کوئی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتا نہ دوست اور نہ ہی آپ کے قریبی لوگ بلکہ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور تو اور غریب، بھی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتے جو بچپانے سے اچھے لکھے نہیں ہوتے کہ وہ آپ کے غلوں پر یقین کریں۔ میرے لیے گولیوں کی بوچھاڑ اور خوراک میں زہر سے بچنا اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا ان لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ میری باتوں کو سنجیدگی سے لیں جو مجھ پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسا شخص جو آسٹن اور مراعات میں میں پیدا ہوا تھا، انہوں نے کوئی مجھے الدین کے قالین پر

نہیں بنادیا تھا اور اگر سیاست میرا پیشہ نہ ہوتا۔۔۔۔۔

میں نے کہا بھٹو صاحب آپ کے اندر سیاست کے لیے اتنی محبت کہاں سے آئی؟
بھٹو صاحب بولے یہ ہمیشہ سے میرے اندر تھی۔ جب میں ایک بچہ تھا یہ اس وقت بھی میرے ساتھ تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ چیز میرے والدین کی طرف سے میرے اندر آئی تھی۔ میرا باپ ایک بڑا زبردست سیاستدان تھا۔ تاہم، افسوس کی بات ہے کہ سیاست سے اس وقت وہ نکل گئے جب وہ مختلف انتخابات میں ہار گئے۔ ان کے سیاست کے بارے میں بڑے اعلیٰ خیالات تھے۔ ایک دن وہ مجھے لاڑکانہ کا چکر لگوانے لے گئے۔ انہوں نے مجھے قدیم مندر دکھائے۔ شاندار گھر اور اپنی تہذیب کی نشان دہیاں اور مجھے کہا کہ دیکھو جتنا اسیاست بھی ایک مندر یا گھر تعمیر کرنے کی طرح ہوتی ہے یا میوزک یا شاعری کہنے کی مانند انہوں نے اپنی گفتگو میں مائیکل اینگلو کا بھی ذکر کیا۔ تاہم میری ماں بڑی مختلف قانون تھیں۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور وہ دوسرے غریب لوگوں کی غربت بہت کھٹکتی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہتی رہتی تھی کہ جتنا تم ہمیشہ غریبوں کا خیال رکھنا۔ ہمیں غریبوں کی مدد کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں امریکہ گیا تو میری ماں کی باتیں میرے ذہن میں اتنی رچ بس گئی تھیں کہ میں ایک انقلابی بن گیا۔ میں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پڑھنے گیا جہاں انٹرنیشنل لاء کا ایک بہت بڑا لیورسٹ پڑھا رہا تھا۔ میں اس وقت انٹرنیشنل لاء میں بھی ڈگری لینا چاہتا تھا۔ یہ دور کمیونسٹوں کو ہارٹ کرنے کا دور تھا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا تھا۔ میں لال نیل پالش لگانے والی لڑکیوں سے دور رہتا اور ایک ایسی سٹریٹ میں جا کر رہا جہاں ٹیگروں نہ رہتے تھے۔ میں وہاں ایک مہینہ اور ایک ہفتہ رہا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا اچھا لگا۔ وہ جو بھی تھے ان میں بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں ہنسنا آتا تھا۔ ایک دن ساٹھ یا گویں ایک ہوٹل والے نے اس وجہ سے کمرہ دینے سے انکار کر دیا کہ میں ایک میکسیکن لگتا تھا۔ اس واقعے نے بھی میری سوچ کافی بدلی۔ میں امریکہ سے لندن گیا۔ ان دنوں الجیریا کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ میں الجیریا کے لوگوں کے ساتھ ہو گیا لیکن میں مظاہرین کے ساتھ مل کر برطانیہ کے وزیراعظم کے دفتر 10۔ ڈاوننگ سٹریٹ کے باہر غمرے نہیں لگاتا تھا۔ ہو سکتا ہے شاید کسی کو ظلم نہیں ہے کہ میں اندر سے ایک شرمیلا انسان ہوں۔ میں لوگوں میں زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں ہمیشہ لکھ کر بحث و مباحثہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میرے خیال میں سیاست کی گیم میں یہ چیز مجھے

زادہ ابھی لگی تھی۔

میں نے کہا کہ ہاں صاحب اب آپ سے آخری سوال۔ مخالف مجھے گا اگر سوال آپ کو زیادہ

علاج ملے۔ آپ کا کیا خیال ہے، آپ کل نہیں گئے؟

ہاں صاحب نے کہا کہ آپ کے اس سوال کو ہم اس طرح لیتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ میں اگلی صبح

فتح ہو جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے زیادہ دیر تک پاکستان کا عمران رہوں گا

جنہوں نے ابھی تک اس ملک پر نگرانی کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت صحت مند ہوں اور

میرے اندر خاصی انرجی بھری ہوئی ہے۔ میں کام کر سکتا ہوں جیسے ابھی بھی ایک دن میں اٹھاؤ گئے کرتا

ہوں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت نوجوان ہوں۔ میری عمر 44 برس ہے اور میں اندرا گاندھی سے دس

سال چھوٹا ہوں اور سب سے بڑھ کر مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں

تیسری دنیا کا واحد لیڈر ہوں جو دنیا کی دو بڑی سپر پاورز کی مخالفت کے باوجود دوبارہ سیاست میں واپس

آیا۔ 1968ء میں امریکہ اور روس دونوں مجھ سے سخت خفا تھے اور مجھے مشکلات میں دیکھنا چاہتے تھے۔

آج میں ان تمام مشکلات پر قابو پا کر یہاں بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے اپنے پیشے (سیاست) کے بنیادی

اصولوں کا پتہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اصول کیا ہیں؟ دراصل سیاست میں آپ کو کئی دفعہ یہ

تاثر دینا پڑتا ہے کہ آپ یہ قوف ہیں اور دوسروں کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان سے بہتر ذہن کوئی پیدا

نہیں ہوا۔ تاہم، یہ سب کچھ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اندر چلک ہو۔۔۔ کیا آپ نے

کبھی کسی گھونسلے پر کسی پرندے کو اپنے انڈوں پر بیٹھ دیکھا ہے۔ ایک سیاستدان کی انگلیاں اتنی ہلکی اور

چلندار ہونی چاہیں کہ وہ بڑی مہارت سے اس پرندے کے نیچے سے اس کے انڈوں کو ایک ایک کر کے

اتنی خوبصورتی سے نکالے کہ اسے پتہ ہی نہ چلے!

کراچی، اپریل 1972ء

Courtesy : An Interview With History

مترجم: رؤف کلا سرا



رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تقریبات سے آگاہی بہت کم ہے۔ رؤف نے یہ سیاسی خاکے لکھ کر ان شخصیات کے اندر مہا کھنکے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے اتفاق کریں، مگر رؤف نے سیاست کے ایک دور کا خاکہ میدان میں ریلنگس کے لیے چیلنج دیا ہے۔ جس کسی میں اختلاف کا مواد یا مہاسے کی عقل ہو وہ اس معرکے میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو چوہدری ثار یا چوہدری شجاعت رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں یا یہ کہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید سیاسی صحافت کا یہی سب سے بڑا سبق ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی پھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر حسین